چند ادبی نوشتوں کا مجموعہ، نظرِ ثانی، ترمیم و اضافہ کے بعد

از

عبد الماجد

ایڈیٹر صدق (لکھنؤ) مصنف تفسیر القرآن وغیرہ

ناشر

شیخ نذیر احمد مالک کتب خانہ تاج آفس

محمد علی روڈ بمبئی ۳

بسم اللہ

عرضِ حال

خدا کی شان، ایک کم سواد، بے استعداد، قصباتی، دیہاتی کو بھی اس کا حوصلہ کہ اپنا نام ادیبوں، انشاپردازوں کی فہرست میں لکھائے اور دل میں یہ ولولہ کہ زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں کی صف (صفِ آخر سہی) میں جگہ پائے!

اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

اسرائیلیوں کی زبان میں، تو اور سنو، میاں طالوتؑ کا شمار بھی پیمبروں میں ہونے لگا! ——
مصر کی غریب ضعیفہ کو یوسفؑ کی خریداری کا شوق پیدا ہوا۔

اہلِ فضل کی ذرّہ نوازی، دوستوں کی بے جا مدح و حوصلہ افزائی، اور پھر اپنا ذوقِ نمائش، مل ملاکر جو کچھ بھی کرا گذرے، تھوڑا ہے۔

پرانے اور نئے ایسے مضمون جنہیں کچھ نہ کچھ مناسبت ادب و زبان سے ہو، رائے یہ ٹھہری کہ یکجا کر لئے جائیں۔ بعض ان میں کے حال کے ہیں اور بعض ۲۲-۲۳ سال قبل کے اتنے عرصہ میں قلم کا مذاق بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اس لئے نظرِ ثانی، اور وہ بھی جزئیات کی حد تک ان قدیم تحریروں پر بھی کر لی گئی، کہ طرزِ عبارت میں یکسانی کسی درجہ میں تو پیدا ہی ہو جائے۔ مجموعہ کاٹ چھانٹ کے بعد دو جلدوں میں آپایا۔

پہلی جلد حاضر ہے، دوسری جلد بھی انشاء اللہ جلد ہی پیش ہو جائے گی، اس کے

بڑے عنوانات حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) چند مقالے دمرزا رسوا کے قصے - نیا آئین اکبری - پریم چند وغیرہ

(۲) چند نشریے (ریڈیو سے نشر کی ہوئی تقریریں)

(۳) چند مرثیے (تعزیتی مضامین)

جو باکمال اس سلسلے میں بھی غنا پر منہ بناتیں گے، وہ محض اپنی خوش ذوقی اور حقیقت سنجی کا ثبوت دیں گے۔ اور جو پردہ پوشی سے کام لیں گے، وہ کرم نوازی اور صفت ستاری کا نقش بٹھا دیں گے۔ مقام عدل و مقام فضل دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ دوسرا پہلے سے خوب تر ہے، اور اس سے اعلیٰ و برتر۔

دریاباد (بارہ بنکی)

عفو خواہ

عبدالماجد

فہرست مضامین

چند مقالے

چند تبصرے

چند مقالے

غالب کا ایک فرنگی شاگرد[1]

آناد فرانسیسی

پچھلے نمبر کے شذرات (معارف) میں اردو کے چند فرنگی شاعروں کا جو مختصر تذکرہ آگیا تھا۔
ناظرین کرام نے اس سے دلچسپی کا اظہار کیا اور احباب کو یہ داستان خوشگوار اور پُر لطف معلوم
ہوئی۔ ان حضرات کی ضیافت ذوق کے لئے ایک فرنگی شاعر کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے
الگزینڈر ہیدرلی ایک فرانسیسی خاندان کے رکن تھے[2] ولادت غالباً ہندوستان ہی میں
ہوئی تھی۔ سال ولادت تقریباً ۱۸۲۹ء۔ اٹھارہ سال کی عمر سے اردو شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ مشورہ
سخن کے لئے کلام نواب زین العابدین خاں عارف[3] (شاگرد عزیز مرزا غالب) اور خود غالب کی
خدمت میں بھیجنا شروع کیا۔ ان حضرات کا فیض توجہ کہئے، یا خود آناد کی طباعی کہ کچھ ہی روز
میں اچھی خاصی مشق حاصل کرلی۔ اور کلام میں وہ پختگی آگئی۔ جو ایک غیر قوم کے فرد کے لئے بہت

---

[1] معارف (اعظم گڑھ) جنوری ۱۹۲۲ء۔ نظر ثانی مئی ۱۹۴۲ء

[2] تذکرہ جمخانۂ جاوید، از لالہ سری رام ایم۔ اے

[3] یہ وہی عارف ہیں جن کی جوان مرگی پر غالب نے وہ مرثیہ کہا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف، کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

(یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان غالب (اردو) میں درج ہے۔)

بڑی بات ہے۔ عمر نے وفا نہ کی۔ کل ۲۲ سال کی عمر میں ۷ر جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کیا۔ تاہم اس نو عمری میں کلام کا مجموعہ جس قدر ہو گیا تھا۔ وہ اوسط ضخامت کے دیوان کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ وفات کے دو ہی برس بعد ان کے برادر کلاں طامس بیدر لی نے اس دیوان کو شائع کر دیا۔

تخلص آزاد کرتے تھے۔ اس لئے دیوان ہی دیوان آزاد کے نام سے موسوم ہے ضخامت ۷۰ صفحہ ہے۔ مطبع احمدی آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اب بازار میں نایاب ہے۔ میرے پیش نظر کتب خانہ سرکاری رامپور کا نسخہ ہے۔

ابتدا میں دو دیباچے ہیں۔ پہلا دیباچہ فارسی میں منشی شوکت علی ساکن شاہپور ضلع فتحپور کا ہے۔ اب یہ صاحب خود گمنام اور محتاج تعارف ہیں۔ اپنے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ مشہور فضیلوں میں شمار ہوتے تھے۔ طرز بیان تقریظ نگاروں کے عام دستور کے مطابق شاعرانہ ہے اور بعض بیانات مبالغہ آمیز حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"فنا سے ہنرمند و گوہر کا پیوند خداوند عقل و تمیز صاحب فراست و ہر دلعزیز، مستعد ازلی الگزینڈر ہیدر لی کہ ذہن و ذکا و خلقش ضمیر بود و سعادت و مروت درضمیر جا پذیر درس ہیزدہ سالگی بر شنیدن اشعار اساتذہ متقدمین و متاخرین طبع و کاوش در تخیل کاوش توجہ مود گاہ گاہ ہنگام فرصت، بمطالعہ تصانیف او ستادان پرداختے، و با محتشم الدولہ امیر الملک محمد اسد اللہ خاں بہادر سہراب جنگ غالب متخلص و نواب زین العابدین خاں متخلص بہ عارف کہ ہر دو حضرات از اکابر امراء و الا دودمان دہلی بودند بذریعہ مراسلات و مکاتبات استمداد سخن داشتے"

آگے چل کر اسی دیباچے میں یہ ذکر ہے کہ بیدر لی کو طب میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا مریض عموماً ان کے علاج سے شفایاب ہوتے تھے، مزاج میں سخاوت و فیاضی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ دوائیں بلا قیمت تقسیم کرتے اور دوسرے طریقوں سے بھی غربا کی دستگیری کرتے رہتے۔ خود عسرت

سے بسر کرتے تھے لیکن دوسروں کی حاجت روائی کے لئے قرض لینے سے بھی دریغ نہ کرتے
ریاست الور میں توپخانہ کے کپتان مقرر ہو گئے - اسی سال وفات پائی -

دوسرا دیباچہ اردو میں ہے اور یہ آزاد کے بڑے بھائی طامس ہیدرلی کے
قلم سے نکلا ہے یہ ریاست بھرت پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے - یہ دیباچہ ذیل میں تمام و کمال
درج کیا جاتا ہے - آج سے ۸۰، ۸۵ سال قبل کی ایک فرانسیسی کی اردو نثر کا نمونہ بجائے
خود ایک یادگار شے ہے -

نیاز مند درگاہ لم یزلی طامس ہیدرلی ابن مسٹر جیمس ہیدرلی مرحوم بیان کرتا ہے
اور اپنا راز دل صاحبدلوں پر یوں عیاں کرتا ہے کہ میرا حقیقی چھوٹا بھائی کپتان الگزینڈر ہیدرلی
جوان سعادتمند شیریں زبان دانش پیوند ابتدائے عمر میں شعر و سخن کا مائل ہوا - اور چند روز میں
جیسا چاہیئے مایہ سخنوری و معنی گستری اس کو حاصل ہوا کیونکہ طبیعت دراک تھی - فکر چالاک تھی - جو کچھ
دل سے زبان تک اور زبان سے قلم تک آیا - اس نے گلہائے معنی کا ایک تختہ خوش رنگ دکھایا
رفتہ رفتہ اس کے کلام کی وہ صورت ہوئی کہ ہم فنون کو رشک ہوا اور دانشمندوں کو حیرت ہوئی
نواب زین العابدین خاں دہلی کے امیرزادہ عالی خاندان جو عارف تخلص کرتے تھے اور جناب نجم الدولہ
اسداللہ خاں بہادر غالب کے شاگرد تھے - وہ اس کے استاد تھے اور اس نوجوان کو اپنے استاد
اور اپنے استاد کے استاد کے انداز پیش نظر تھے - اور اکثر ان کے اشعار یاد تھے - ہنوز برادر
موصوف بہت کچھ کہنے نہ پایا تھا - بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اس کے دل میں تھا - ابھی اس کی
زبان پر نہ آیا تھا کہ ناگاہ وقت ناگزیر آ پہنچا اور اس سعادتمند ازلی کو پیغام اجل آ پہنچا - چونکہ
سرکار الور میں عہدہ کپتانی پر مامور تھا - دنیا سے سفر کرنے کے وقت میری نظر سے دور تھا - ایسا
لائق ہونہار بھائی جس نے کل دو اوپر تیس برس کی عمر پائی - ساتویں جولائی ۱۸۶۱ء کو کام تمام

ہوا۔ اس غم کا جس قدر بیان کیجئے۔ اس سے سوا ہے۔ جو اپنا حال بنا ہے اور جس قدر غم کیا جائے بجا ہے۔ ع۔ ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد۔ افسوس نہ فریاد میں فائدہ دیکھا نہ رنج میں تاثیر پائی، بہت روتے پیٹتے آخر صبر کرتے بن آئی۔ اشعار اس مرحوم کے جو پریشان جا بجا پڑے پائے گویا سونے میں زمرد اور یاقوت کے نگینے جڑے پائے۔ خیال آیا کہ جواہر کو بکھرا پڑا نہ رہنے دیجئے اور ان سب اشعار کو ردیف وار جمع کر کے دیوان مرتب کیجئے تاکہ جو کوئی دیکھے وہ کہے کہ اگرچہ اس شخص کی تھوڑی زندگی تھی مگر واہ اس قلیل مدت میں کیا گہر افشانی کی ہے نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھکو یہ یقین ہے کہ یہ جو کاغذ پر سیاہی سے لکھے گئے ہیں سو اس کے ماتم میں سیہ پوش ہوئے ہیں۔ الٰہی یہ مجموعہ اشعار مقبول طبع ہر سخنور ہو اور الگزینڈر ہیدرلی کی روح کو حضرت یسوع کے قدم مبارک میں مغفرت میسر ہو۔

دیوان کی ابتدا "قصیدہ در حمد و وحدت" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد مسدس نعت مسیح ہے انہی صفحوں میں مختلف اعزہ، احباب اور والیان ریاست کی شان میں قصائد ہیں۔ بعض اچھے خاصے طویل ہیں۔ صفحہ ۴۰ سے صفحہ ۵۶ تک دیوان غزلیات ہے۔ باقی صفحہ ۶۵ تک متفرق قطعات مخمس، مرثیہ وغیرہ ہیں، حمد میں بالکل وہی رنگ ہے جو ایک مسلمان شاعر کا ہوتا ہے، توحید باری کی توصیف ہر شعر میں ہے اور اس پر طرح طرح کے شاعرانہ استدلالات کئے ہیں۔ مسدس مسیحی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کا رنگ بالکل وہی ہے جو مسلمان شعراء کا نعت محمدی میں ہوتا ہے وہی ذوق و شوق وہی تضرع والحاح اور وہی وابستگی و اعتماد شفاعت۔

تیری رحمت حامی رزق گدایان یا مسیح — تیری بخشش تاج بخش تاجداران یا مسیح
تیری شفقت ہر کس و ناکس کی خواہاں یا مسیح — ہے تجھی سے نیک و بد کی مشکل آساں یا مسیح
ساقی کونین و شاہ دو جہاں تو ہی تو ہے — یا مسیحا چارہ ساز عاصیاں تو ہی تو ہے

ء زبان میں اگر کوئی ناہمواری نظر آئے تو زباندان حضرات گرفت کرنے سے پیشتر یہ یاد کرلیں کہ شاعر ایک غیر ملک اور غیر قوم کا شخص ہے جس کی مادری زبان کو اردو سے کوئی مناسبت نہیں،
ایک اور بند اسی مسدس کا :-

خسروا ازبسکہ ہیں میری خطائیں بےحساب　　عاصیانِ دہر میں اعلا نہیں میرا جواب
قابلِ دوزخ ہوں میں اور لائق قہر و عتاب　　عین نصفت ہے جہاں تک مجھ پہ ہوں رنج و عذاب
اور کچھ چارہ نظر آتا نہیں اپنا مجھے　　تیری الفت پر توکل ہے شفاعت کا مجھے

ایک مخمس میں مرزا غالب کی غزل "تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے" کی تضمین کی ہے۔ پہلا بند یہ ہے:-

بلا سے ہیں نہ سہی خاک بھی اعدو کیا ہے　　تمہیں اسی کی قسم اس کی آبرو کیا ہے
زبان شوخ بیاں کا یہ حسن خو کیا ہے　　ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے

آخری بند یہ ہے:-

کہا جو میں نے کہ غالب نظر نہیں آتا　　نیاز آپ کی خدمت میں اب نہیں لاتا
تو بولے بھید کو آزاد تو نہیں پاتا　　ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ایک اور مخمس میں ناسخ کی مشہور غزل "میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا" کی بھی تضمین ہے
اپنے استاد نواب زین العابدین خاں عارف کا طویل مرثیہ کہا ہے۔ اور بعض بعض شعر خوب نکالے ہیں، نمونہ حاضر ہے:-

اے اہل دید دیکھ لو آنکھوں سے کیا ہے آج　　میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو رہا ہے آج

یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے تھے انتظار — تو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج
مردے عجب ہے گر نہ اٹھیں جی کے قبر سے — ہم بانگ صور نالۂ اہل عزا ہے آج
ماتم سے کیوں نہ دہر میں پڑ جائے زلزلہ — تشہیر بے ثباتی ارض و سما ہے آج
پھر ہوگا شور خلق میں طوفان نوح کا — اے اہل گریہ گریہ ہی جوش بکا ہے آج
اے جذب اتحاد یہی ہے مدد کا وقت — وہ غم میں ہم کو چھوڑ کے تنہا چلا ہے آج
اے جان زار جانے میں یہ دیر حیف حیف — کچھ بھی ہے سوچا تجھے اے بے وفا ہے آج

غزلیں اکثر غالب کی زمینوں میں کہی ہیں، اور ان میں صفائے بیان اور سلاست روانی، وشستگی زبان کا سر رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کہیں کہیں مضمون بھی بہت لطیف پیدا کیا ہے بعض اشعار حسن تعلیل کا اعلےٰ نمونہ ہیں۔ ایک غزل غالب کی مشہور غزل جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا پر ہے سہ

میں تو وحشت میں کبھی سوئے بیاباں نکلا — واں سے دلچسپ مرا خانۂ ویراں نکلا
واعظوں سے جو سنا کرتے تھے جنت کا بیاں — جبکہ تحقیق کیا کوچۂ جاناں نکلا
اس کی جا آج در یار پہ بیٹھا ہے رقیب — خاک خوش ہو وہیں جو کل یار کا درباں نکلا
وہ ذبح ہو تو شب یاد کیجے کب ہوش رہا — وصل میں بھی تو نہ دل کا کوئی ارماں نکلا

اشعار ذیل ایک بہتر شاعر اور اہل زبان کے لئے بھی باعث فخر ہو سکتے ہیں۔

شکل قاصد نظر نہیں آتی — نہیں آتی خبر نہیں آتی
وہ بلا کونسی ہے صحرا میں — جو کبھو میرے گھر نہیں آتی

ایک طویل غزل کا اقتباس یہ ہے:-

خوش ہوں مشکل سے کوئی کام جو آساں ہوتا — دور افلاک کا شرمندۂ احساں ہوتا

اب تو ناخشنود نہیں ہے کوئی مرنے کا سبب — تھا مرے حق میں جو ہوا شبِ ہجراں ہوتا

اہلِ جنت سے مری روز لڑائی ہوتی — خلد بالفرض اگر کوچۂ جاناں ہوتا

ہم بھی مجنوں کی طرح خاک اڑاتے پھرتے — ہوتے ویران اگر گھر نہ بیاباں ہوتا

دیکھنے وہ کبھی آئینہ کے دھوکے میں اگر — ہیں جو بیتاب ہوا کاش کے حیراں ہوتا

کس سے بہلائیں سگِ یار کو عریانی میں — آج کام آتا وہ آزاد جو درباں ہوتا

تیسرا شعر غالباً غالب کے اس شعر کو پیشِ نظر رکھ کر کہا گیا ہے۔

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

تقدیر پہ شاکر ہے رضائی بر رضا ہم — اب کس کی شکایت کریں اور کس کا گلا ہم

مست حسن پہ بھولو کہ دکھا دیں گے یہ تم کو — کرتا ہے وفا حسن کہ کرتے ہیں وفا ہم

مشہور ہو سر حلقۂ اربابِ جفا تم — معروف ہیں منجملۂ اصحابِ وفا ہم

ہیں شمع صفت انجمنِ دہر میں آزاد — سرگرم رہ وادیٔ تسلیم و فنا ہم

غالب ہی کی زمین میں ذیل کے دو شعر سننے کے قابل ہیں۔

نہ دے جو بوسۂ گیسو نہ دے جواب تو دے — بلا سے جو تجھے دینا ہو وے شتاب تو دے

حقیقتِ دلِ خوں گشتہ سر بسر ہے عیاں — ذرا وہ طرۂ پرخم کو پیچ و تاب تو دے

متانت و سنجیدگی جو اکثر دہلی والوں کا حصہ ہے آزاد کے ہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے اوصل کے بے پردہ مضامین، سوقیانہ محاورہ، ہوس پرستی اور مبتذل الفاظ و تراکیب سے ایک بڑی حد تک ان کا کلام بالکل پاک ہے، وہ عاشق ہیں مگر شریف عاشق، وہ معشوق رکھتے ہیں مگر ان کا معشوق زنِ بازاری نہیں، وہ اپنی شخصیت کے لحاظ سے مغربی ہیں مگر ان کی شاعری میں مشرق کی بلند پایہ عاشقانہ شاعری کی جھلک

پوری طرح موجود ہے، اس کا کچھ اندازہ ان کے منقولہ بالا کلام سے ہوگا اور مزید ثبوت آئندہ اشعار سے ملے گا۔

ہے مجھ پہ نہیں ظاہر کہ کہاں — زخم پنہاں ہے کہ ہے مسکن جاں
دل وہ دل ہے کہ سدا غم سے گداز — چشم وہ چشم کہ خوں نابہ فشاں
میکشو دین ہے کبت نا ست — ایک ساغر سے بہلتے ایماں
ہم نے اس شرح کو دل میں رکھا — جب نہ پایا کوئی خلوت کا مکاں
طبع کو صرف دعا کر آزاد — ہو چکا حال حقیقت کا بیاں

مومن خاں کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے سے وابستگی سی ہے کسی زلف دوتا کے ساتھ
پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ

جس غزل پر دہلی کے مستند شاعروں نے غزلیں کہی ہیں جن میں سالک۔ انور کی غزلیں اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں، مرزا غالب کی بھی غزل دیوان ناظم (نواب یوسف علیخاں ناظم والی رامپور) میں ملیگی آزاد نے بھی اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ بعض اشعار کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

اڑتا ہے جسم دار ہوا با ہوا کے ساتھ — چلتے ہیں تیرے کوچہ میں باد صبا کے ساتھ
بے اعتنائیوں میں بھی کیا کیا لگاؤ ہیں — ہیں کج ادائیاں تری کس کس ادا کے ساتھ
جو ہیں ہر سب یہی ہیں مرے مشت استخواں — ہو جا شریک لٹے سگ جاناں ہما کے ساتھ
گویا مرا نوشتۂ تقدیر ہو گیا — وہ ربط ہے جبیں کو ترے نقش پا کے ساتھ
میں جانتا ہوں جان سے تم کو عزیز تر — الفت ہوئی ہے جب تو ہوئی بےوفا کے ساتھ
عشق بتاں ہیں وہم سے ہوں اپنے بدگماں — کیا ورنہ دشمنی مجھے خلق خدا کے ساتھ

غالب کی اس غزل پر مرحوم کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے آزاد نے ایک دوغزلہ کہا ہے۔ چند

نشتر نمونہ ہیں :-

قانع ہوں اس پہ عشق میں جو خشک و تر ملے | کھانے کو داغ پینے کو خون جگر ملے
بے صورت ہو نصیب مرے مدعی کو دل | بے داغ دشمنوں کو ہمارے جگر ملے
حاصل زبس خلاف تمنا ہے کام دل | جب ہو سکے زہر کی نہیں خواہش شکر ملے
آزاد کس کا شیخ و برہمن نہ آن سے پوچھ | ہے مفت دین جا کے بھی وہ بت اگر ملے
افسوس خاک تک نہ نہیں پھر سر ملے | وہ لوگ بھی ہیں جن کو اڑانے کو زر ملے
بس ہو گیا یقین کہ یہی راہ یار ہے | دل جا بجا پڑے جو سر رہگذر ملے
پھرتا ہے تو زخلق کی آنکھوں میں رات دن | روئے زمیں پہ کس کو ترا رہگذر ملے
آزاد ہم تو آج گذر جائیں جان سے | کوئے صنم میں جا ئے مدفن اگر ملے

اس میں شبہ نہیں کہ دیوان آزاد میں جا بجا لفظوں اور ترکیبوں کی غلطیاں ملتی ہیں اور بندش تو بہت سے مقامات پر سست نظر آتی ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کہ کلام ایک ہندی کا نہیں فرنگی کا ہے جس کو جواں مرگی نے مشاقی کا بھی پورا موقع نہ دیا، دیوان آزاد کو بحیثیت مجموعی بہت غنیمت بلکہ قابل قدر سمجھنا چاہیے۔ اردو کے مغربی شاعروں میں ایک اور صاحب کا دیوان نظر سے گذرا ہے۔ دیوان شور اصل نام مسٹر جارج پیس تھا، غالباً میرٹھ میں قیام رہتا تھا۔ دیوان دو حصوں میں ہے پہلے حصے کی ضخامت کا خیال نہیں، دوسرا حصہ ۲۲۸ صفحے میں آیا ہے اور ممتاز المطابع پریس میرٹھ میں خود مصنف کی حسب فرمائش ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا ہے لیکن کلام بہت معمولی ہے۔

پیامِ اکبر

یعنی

حضرت اکبر الہ آبادی کی کلیات سوم پر ایک نظر

لسان العصر حضرت اکبر مغفور زمانۂ حال کے ان چند بزرگوں میں تھے جن کا مثل و نظیر کہیں مدتوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔ انکی ذات ایک طرف شوخی و زندہ دلی اور دوسری طرف حکمت و روحانیت کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی یا یوں کہیئے کہ ایک طرفہ معجون۔ آخر آخر ان کی شاعری نہ شاعری رہی تھی، نہ ان کا فلسفہ، فلسفہ۔ ان کا سب کچھ بلکہ خود ان کا وجود مجسم حکمت و معرفت کے سانچہ میں ڈھل گیا تھا۔ ان کی گفتگو جامع تھی حکمت و ظرافت کی، ان کی صحبت ایک زندہ درسگاہ تھی۔ تصوف و معرفت کی۔ روزمرہ کے معمولی فقروں میں وہ وہ نکتے بیان کر جاتے کہ دوسروں کو غور و فکر کے بعد بھی نہ سوجھتے اور باتوں باتوں میں ان مسائل کی گرہ کشائی کر جاتے، جو سالہا سال کے مطالعہ سے بھی نہ حل ہو پاتے۔ خوش نصیب تھے وہ جنہیں ان کی خدمت میں نیاز مندی کا شرف حاصل تھا۔ جن کی رسائی اس چشمۂ حیات تک نہ ہو سکی انہیں آج اپنی نارسائی و محرومی پر حسرت ہے، اور جن کی ہو چکی تھی انہیں یہ حسرت ہے کہ اور زیادہ سیراب کیوں نہ ہو لئے۔

اکبر کے مجموعۂ کلام پر تفصیلی تبصرہ کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ چھپا ہوا کلام اس

سلہ رسالہ اردو اورنگ آباد (دکن) اکتوبر ۱۹۲۳ء، اپریل ۱۹۲۳ء، نظر ثانی ۱۹۴۳ء۔

وقت تک تین جلدوں میں ہے اور جو حصہ ابھی غیر مطبوعہ ہے، وہ بھی اتنا ہے کہ اگر دو جلدیں نہیں تو ایک بھر کے لئے تو بالکل کافی ہے۔ رسالہ کی محدود گنجائش، اس سارے ذخیرہ پر اجمالی نظر بھی ممکن نہیں۔ یہاں صرف اس حصہ کلام پر نظر کی جائے گی جو انہوں نے تقریباً ۱۹۱۴ء سے لے کر آخر ۱۹۱۹ء تک فرمایا۔ اس دور کے کلام کا شائع شدہ مجموعہ[1] ان کے کلیات سوم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک معتدبہ ذخیرۂ کلام اس کے بعد کا بھی ہے۔ یعنی ۱۹۲۰ء سے لے کر عین وقت وفات ستمبر ۱۹۲۱ء تک کا۔ ممکن ہے کہ کبھی یہ بھی کلیات چہارم کے نام سے شائع ہو جائے لیکن ابھی تک کہ مرحوم کی وفات کو ۲۲ سال گذر چکے ہیں، مسودہ کی حالت میں ہے، اور مسودہ بھی شاید پوری طرح مرتب نہیں۔

بہتر ہوگا کہ ان کی شاعری کو مختلف صنفوں میں تقسیم کر کے ہر عنوان پر جداگانہ نظر کی جائے۔ ہاں متعدد اشعار ایسے بھی ہونا لازمی ہیں، جو ایک عنوان کے ما تحت میں آئیں گے اور دوسرے کے بھی مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں سے انہیں بار بار لانا پڑے گا، اور تکرار بیان ایک حد تک ناگزیر ہوگی۔

اکبر کی کتاب شاعری کے پانچ باب بآسانی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ظرافت و زندہ دلی۔

(۲) سیاسیات

---

[1] حضرت اکبر بڑے ہی پُر گو اور بڑے ہی زود گو تھے۔ بات چیت کرتے جاتے اور شعر کہتے جاتے۔ لیکن کلام کا ایک خاصہ حصہ ایسا بھی ہوتا جسے صرف نجی محفلوں تک محدود رکھتے اور اپنے مخصوص دوستوں ہی کو سناتے۔ عام اشاعت کے روادار اس حصۂ کلام کے لئے کسی حال میں بھی نہ ہوتے۔

(۳) عشق و تغزل
(۴) اخلاق و معاشرت
(۵) تصوف، معرفت و فلسفہ
ان میں سے ہر عنوان پر الگ الگ گفتگو مناسب ہوگی۔

ظرافت و زندہ دلی

اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب اُن کی ظرافت تھی، ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر اُن کا نام پھیلا ہوا ہے، اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے قوم نے اُن کو جانا مگر اسی حیثیت سے کہ وہ روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دیتے ہیں۔ ملک نے اُن کو پہچانا مگر اس حیثیت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے ہیں۔
اس میں ذرا کلام نہیں کہ اکبر ظریف اور بہت بڑے ظریف تھے۔ لیکن جس زمانہ کے کلام پر یہاں خصوصیت کے ساتھ تبصرہ مقصود ہے، یہ زمانہ ان کی ظرافت کے شباب کا نہ تھا جب تک خود جوان رہے شوخ طبعی بھی جوان رہی عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے، تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوتی۔ جمال حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشم بصیرت کو محو نظارہ بنایا، سوز عشق نے سینہ کو گرمایا، ذوق عرفاں نے دل کو تڑپایا، اور نور معرفت کی شعاعیں خود اُن کے مطلع قلب سے اس چمک دمک کے ساتھ پھوٹیں، تماشائیوں کی

آنکھیں قریب تھا کہ چکا چوند میں پڑ جائیں۔ یہی تو بات ہے کہ کلیات سوم میں خالص ظریفانہ اشعار شاید ۱۰ فی صدی بھی نہ نکلیں[1] حالانکہ کلیات اوّل و دوم میں ظریفانہ اشعار کا تناسب تیس فیصدی سے کسی حال میں کم نہ تھا۔

لیکن ہے یہ کہ قسام ازل نے ذہانت و فطانت شوخی و زندہ دلی کی تقسیم میں ان کے لئے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس لئے پیرانہ سالی میں بھی ایک طرف ذاتی صدمات و خانگی مصائب[2] کا ہجوم، اور دوسری طرف مشاغل دین و تصوف کے غلبہ کے باوجود یہ جذبات فنا ہرگز نہیں ہونے پاتے۔ شمع جھلملا ضرور رہی تھی۔ مگر بجھی نہ تھی یا آفتاب ڈھل ضرور چکا تھا۔ مگر غروب تو نہیں ہوا تھا۔ بدر یا ہلال بننے لگا تھا لیکن بے نور نہیں ہوا تھا۔ چمن سے بہار رخصت ہونے کو تھی تاہم خزاں کا سایہ بھی ابھی نہیں پڑنے پایا تھا۔ زندہ دلی نہ صرف قائم تھی بلکہ اس قوت کے ساتھ اس شدت کے ساتھ کہ دیوان پڑھنے والے متحیر اور کلام سننے والے ششدر رہ گئے۔ کلیات سوم میں اس کے نمونے، بیشتر کے مقابلہ میں یقیناً کمتر، پھر بھی اچھی خاصی معقول تعداد میں نظر آتے ہیں۔

اکبر ظریف تھے "ہزال" و فحاش نہ تھے دلوں کو خوش کرتے تھے۔ چہروں پر تبسم لاتے تھے

---

[1] کلیات سوم میں ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۹ء کا کلام درج ہے، حضرت اکبر کا سال ولادت ۱۸۴۶ء تھا۔ گویا اسوقت سن بحساب شمسی ۶۸ تا ۷۳ سال کا تھا۔

[2] حضرت اکبر کے دو محل تھے دوجہ اولی سے تعلقات شروع ہی سے بہت تلخ رہے، ازدوجہ ثانیہ محبوبہ خاص تھیں انہوں نے ۱۹۱۰ء میں رحلت کی۔ چھوٹے صاحبزادے سید ہاشم بہت محبوب تھے ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں غالباً ۱۹۱۵ء میں انہوں نے داغ مفارقت دیا۔ بعض اور خانگی صدمات اس کے علاوہ تھے۔

جذبات سفلی کے بھڑکانے کی کوشش نہ کرتے - ان کی ظرافت ہزل گوئی کے مترادف نہ تھی - اکثر صورتوں میں معنویت سے لبریز ہوتی تھی، کہیں کہیں زبانی محاورہ، لفظی مناسبت، ترکیب کی ندرت قافیہ کی جدت کے زور سے شعر کو لطیفہ بنا دیتے تھے۔ سیاسی مسائل میں رائے بڑی آزاد رکھتے لیکن جتنا کہہ جانے میں جری ہے، اتنا ہی سنانے میں، چھاپنے میں پھیلانے میں محتاط تھے - قدم اتنا پھونک پھونک کر رکھتے کہ مخلصوں اور نیازمندوں تک کو حیرت کی ہنسی آجاتی - اور جو اتنے معتقد و باادب تھے، وہ تو جھجھلاہٹ میں خدا جانے کیا کچھ کہہ سن ڈالتے - خیر ظرافت اس خاص غرض کے لئے یعنی ستر حال کے لئے، اخفائے خیال کے لئے، ان کے ہاتھ میں ایک اچھے لفافہ کا بڑے کار آمد آلہ کا کام دیتی تھی، جو کچھ اور جس کی نسبت چاہتے، اسی پردہ میں سنا جاتے کچھ اکیلی سیاسیات پر موقوف نہیں، رند و پارسا، امیر و فقیر، عالم و عامی، انگریز و ہندوستانی ہندو و مسلم، سُنی شیعہ، سب کی صحبت میں، اور مسجد اور مندر، کالج اور اسکول، خانقاہ و میکدہ کاؤنسل اور کچہری، سرکس اور تھیٹر، بازار اور دفتر کے ایک ایک گوشہ میں بے تکلفانہ سیر کرتے پھرتے - ایک ایک شے کا جائزہ غور سے لیتے رہتے - اسے جانچتے، اُسے تکتے، اِس کو جانچتے، اس کو بجا نچتے، ایک کو تولتے، دوسرے کو ٹٹولتے - لیکن ظرافت کے نقاب کے تار چہرے پر کچھ ایسے گہرے پڑے رہتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلنے پاتا کہ نگاہیں ہیں کس جانب - بے تکلف صحبتوں میں بارہا یہ کہہ بھی گذرتے - کہیں کہیں مطبوعہ کلام میں بھی اس کا اقرار کر گئے ہیں - ایک جگہ واضح لفظوں میں فرماتے ہیں ؎

لغزشیں تہ ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر — دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف
سرد موسم تھا، ہوائیں چل رہی تھیں برف بار — شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

...موسم" کا اشارہ زیادہ تر سیاسی فضا کی جانب ہے اور "ہواؤں" سے مراد قانونی

ٹھکنجے اور سرکاری گرفتیں تھیں - آج کی نہیں آج سے ۴۰ سال قبل کی - اُن کی ظرافت کا بہت بڑا مظہر یہی سیاسیات کا میدان تھا، اور اس باب میں ان کا عمل عارفِ رومیؒ کی تعلیم پر تھا ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرّ دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

اکبرؔ اِن دلبرانِ سیاسی کی ایک ایک ادا کے محرم تھے - ان اسرار کی منادی وہ سرِ بازار کرتے، لیکن زبان وہی اپنی اور مخصوص۔ جو لوگ ان کی اس بولی سے واقف ہو گئے تھے، وہ معنی و مفہوم کو سمجھ کر چشم و ابرو کو جنبش دیتے، اور جو تہ تک نہ پہنچتے - وہ بھی بہر حال ایک دل لگی کی بات سمجھ کر ہنس تو پڑتے ہی تھے۔ "بُت" "صنم" "مس" "شیخ" "سید" "سید صاحب" "اونٹ" "گائے" "کلیسا" "حرم" "دیر" "بتکدہ" "کالج" "برہمن" "لالہ" "صاحب" وغیرہ بیسیوں الفاظ نے اُن کی زبان میں کہنا چاہیے کہ ایک مخصوص اصطلاحی حیثیت حاصل کر لی تھی۔

ایک جگہ فرمانا یہ منظور تھا کہ سیاسی حقوق جو ہم روز بروز زیادہ حاصل کرتے جاتے ہیں، انہیں اپنی ترقی کی علامتیں سمجھ کر ان پر خوش ہو رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حریف نے ہماری حرص و ہوس، اور جاہ پرستی کا صحیح اندازہ کر کے ہمارے لئے ایک جال بچھا دیا ہے۔ جس میں ہم اور زیادہ جکڑتے جاتے ہیں[1]، اور محکومی و تنزل کے غار میں برابر دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

ہاں ان کو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی کا لیکن اِدھر تصور جب آتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اُن قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

---

[1] کلیاتِ اوّل میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎ تڑپو گے جتنا جال کے اندر، جال گھسے گا کھال کے اندر

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری[1] میں — اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

"قبلہ رو جماعت" سے کھلی ہوئی بات ہے کہ مراد مسلمان ہیں۔ کلام اکبر کا روئے سخن بیشتر اپنی اسی ملت کی جانب رہتا ہے تعلیم اکبری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اصل الزام خود ہم پر ہے۔ ہم اگر حرص و ہوس کے بندے نہ ہوتے تو صیاد جال ڈالنے کی تکلیف ہی کیوں گوارا کرتا؟ اونٹ گر نہ ہو تو دستہ چلے کس چیز پر؟

سرکاری مدرسوں اور تعلیم گاہوں کی بھول بھلیاں کچھ رکھی ہی ایسی گئی ہے، کہ "ہم" ہمیشہ انہیں الجھاووں میں پڑے رہیں، اور "وہ" خود عیش و عشرت کرتے رہیں، ہم ان کی کلرکی کی خدمتگاری کی، محنتوں میں اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہیں اور وہ آقایانہ بے نیازیوں کے ساتھ دادِ عیش دیتے رہیں ارشاد ہوتا ہے ؎

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹ[2] کی وہ گردشیں	خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں
نقشے میں دیکھتا تھا، وہ پیتے تھے جام مے	میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے
میں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ	الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم سے آپ..
بولے کہ اس زباں میں کوئی اور شعر بھی؟	میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی!
اللہ رے ارتقاء سگانِ درِ حضور!	کل "تو" سے "تم" ہوئے تھے ہوئے آج تم سے آپ!
ہنس کر دیا انہوں نے الٹ بحث کا ورق	گانے لگے وہ گیت، میں پڑھنے لگا سبق

سرکارِ نامدار کے بعض "نیکنام" محکموں اور رشتوں کی ذہانت طباعی، بلکہ قوتِ خلاقی کے مشاہدہ سے یہ ظریف شاعر بھی دنگ رہ جاتا ہے، اور محکمۂ پولیس کی کارگذاریوں کا کل" پڑھنے لگتا ہے۔ شاعر

---

[1] یعنی تاریخ [2] دمدار ستارہ (COMET)

غریب کو سیاسی مسائل سے کیا سروکار؟ اس کے اسلاف صد ہا برس یار کی کمر کو تلاش کرتے آئے ہیں۔ آج تک پتہ نہ لگا۔ خواجہ خضر کی رہنمائیاں، ہاتف کی دستگیریاں، سروش غیب کی مہربانیاں سب کی سب ناکام رہیں۔ شاعر کا ذہن ادھر منتقل ہوتا ہے کہ اس ہستی معدوم کا پتہ اب سرکار کے خفیہ پولیس ہی کی مدد سے کیوں نہ چلایا جائے؟ فرماتے ہیں ؎

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال　　خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

ایسا اچھوتا اور نادر سرٹیفکٹ خفیہ پولیس کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی کیوں ملا ہوگا؟ اکبر ظرافت کا رنگ کچھ سیاسیات کے لئے مخصوص تھوڑے ہی تھا۔ جب یہ ہولی کھیلنے پر آتے تو مذہب، اخلاق، معاشرت تعلیم ہر بزم کے بڑے بڑے مین و مہتاب سفید پوشوں کو اپنی پچکاریوں سے رنگ رنگ دیتے۔

اس وقت ملت پر جو فرنگی تہذیب معاشرت کا جن مسلط ہے، اس نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ علم، ہنر، اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن و عشق، عیش و عشرت سب کا معیار بدل گیا ہے۔ اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں تک میں پابند، روز بروز مغربی معیار کے ہوتے جاتے ہیں۔ یہ کہانی اکبر کی زبانی دو لفظوں میں ادا ہوگئی ہے ؎

فکر ساری کو ہے نہ کنگن کی　　اب تو دھن ہے انہیں فرنگن کی

اور خیر ادھر عاشقوں کا حال تو بدلا ہی تھا، غضب یہ ہوا کہ ادھر محبوبوں کی جماعت بھی "انقلاب زندہ باد" کی نذر ہوگئی۔ ادھر کی وضعداری میں فرق آیا، تو ادھر کی بھی طرحداریاں، کب اپنے رنگ پر قائم رہیں۔ بازار حسن میں چلن نئے سکوں کا ہوگیا، پرانے سکے ٹکسال سے باہر ہوگئے۔ اب تک مشرق نے اور مشرق کی شاعری نے حسن کا سب سے بڑا زیور، شرم و حیا، تمکین و حجاب کو سمجھا تھا، لیکن اب جو جاکر دیکھا تو محفل ناز کا رنگ سا ہی بدلا ہوا، کہاں کی کم سخنی اور کیسی بے زبانی؟ مشق اب حاضر جوابی کی ہو رہی ہے نہ اب نگاہ شرمگین نہ چشم سرمگیں۔ اٹھی ہوئی نگاہیں، اور چڑھی

ہوئی آنکھیں اب خود محوِ نظارہ، چہرہ پر نقاب کے ریشمی تاروں کی جگہ شفاف پتھروں کی عینک اور سنہری کمانیاں، حجلۂ عروسی کی خلوتوں کا تخیل مٹ مٹا کر ڈرائنگ روم میں ٹھاٹھ محفل طرازی و بزم نوازی کے جم رہے ہیں۔ عاشق بیچارہ اس قلبِ ہیئت پر دنگ رہ جاتا ہے، اور کہتا ہے ؎

خامشی سے ہے تعلق، نہ ہے تمکین کا ذوق اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں بُت بھی اب دیر میں مانوس ہوئے جاتے ہیں

چوتھے مصرعہ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، مفہوم کو جا ہے کتنی وسعت دیتے چلے جائیے۔ جو علماء دین سمجھے جاتے ہیں وہ حجروں کی چٹائیاں، انکسار و تواضع، چھوڑ، مسجدوں کی صفیں لپیٹ، پنڈال اور پلیٹ فارم کی زینت بن گئے ہیں۔ جو صوفی و مشائخ کہے جاتے تھے۔ خانقاہوں سے نکل، آنہوں نے خود اپنے نقارہ پر چوب لگانی شروع کر دی۔ دینی مدرسوں کے طلبہ، استادوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی بجائے لگے سٹرائک اور مطالبۂ حقوق کا بگل پھونکنے۔ بیویوں نے شوہروں کی خدمت چھوڑ، سینما اور تھیٹر کا راستہ اختیار کیا۔ مائیں بچوں کو آیاؤں کے حوالہ کر خود کلب جا پہنچیں۔ یہ سارے کا سارا مفہوم اس ایک بلیغ مصرعہ میں سما گیا ہے ؎

بُت بھی اب دیر میں مانوس ہوئے جاتے ہیں۔

ہندوستانی تہذیب و ہندوستانی حکومت، خواہ کسی ملت و فرقہ کی ہو، اغیار کی حکومت، اور بیرونی تہذیب سے بہر حال گوارا تر ہے۔ اس مفہوم کو جن لذیذ و خوش ذائقہ کنایات میں ادا کیا ہے، عجب نہیں کہ ان سے اہلِ ذوق کی زبان چٹخاریاں لینے لگے ؎

دھن دیس کی بھی بس میں گاتا تھا اک دہاتی بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی

پوری اور چپاتی اور بسکٹ تینوں کی تلمیحیں بالکل صاف ہیں۔ "پھر دیس کی دھن" تو ایک معنی تو اس کے ظاہر ہی ہیں کہ وطن کا جوشِ محبت۔ باقی دھن، ایک اصطلاحِ موسیقی بھی ہے، اور دیسی نام ہے

ایک راگ کا ۔ اور یہ گانا ایک پہاڑی کی زبان سے ! نورٌ علیٰ نور۔

اس زمین کا دوسرا شعر بھی سننے کے قابل ہے ؎

شانِ نماز اکبر، شاہانہ ہو چلی ہے مسجد الگ بنائیں اپنی میاں مع فاتی

نماز باجماعت کی تاکید تو تھی ہی اس لئے کہ شاہ و گدا، آقا و غلام، خادم و مخدوم، ایک صف میں
شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں، اور کم از کم اللہ کے گھر میں آ کر تو دن میں پانچ پانچ مرتبہ یہ بندو
والے امتیازات مٹتے رہیں۔ یہاں شیخ صاحب مسجد میں حاضر ہو کر بھی اپنی آقائی اور خواجگی کو نہیں
بھولتے، اور آفاقی اور جمن و بیچاروں کے لئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ اپنی مسجد ہی
الگ بنائیں !

ایک ذہنیت اس وقت پھیلی ہوئی یہ ہے کہ زبان سے تو فرنگیت، فرنگی سیاست، فرنگی
تہذیب، فرنگی حکومت کو خوب برا بھلا کہا جائے، لیکن انہیں حلقوں سے اگر کہیں داد ملنے لگے۔ حوصلہ
افزائی ہونے لگے، صلہ و ستائش کی طرح پڑ جائے تو اس پر بھی دل خوشی سے اچھلنے لگتا ہے، اور
اندر ہی اندر لہر، فخر و مسرت کی دوڑ جاتی ہے۔ اکبر کی نظر اس پہلو پر بھی گئی۔ اس کی گرفت اپنے
پنجۂ آہنی سے کی صنعت گری کا کمال ملاحظہ ہو کہ فولاد کی صلابت و کرختگی، کس خوبی کے ساتھ نرم
و گداز مخملی دستانے کے اندر غائب کر دی ؎

رقیب سرٹیفکیٹ دیں تو عشق ہو تسلیم یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

فلاں قومی شاعر کا خان بہادر ہو جانا، فلاں خادمِ ملت کا شمس العلماء بن جانا، یہاں تک کہ اقبال
کا "سر" کے خطاب سے سرفراز ہو جانا یہ سب مثالیں اسی رقیب کے دیئے ہوئے سرٹیفکیٹ
کی ہیں۔

ملت کے نوجوانوں کو مذہب سے جو بیگانگی ہے، لعدو اجنبیت ہے۔ اس کو اکبر نے

بڑی کثرت سے بیان کیا ہے، اور کہیں کہیں تو انداز ایسا لطیف اختیار کیا ہے کہ وہ ان کے سوا اور کسی سے ممکن ہی نہیں۔ دل کے آنسوؤں سے رونے جائیے، لیکن چہرہ وہی ہنسی اور تبسم کا بنائے رکھیئے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے — پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

گر یا لغو و بیگانگی کی حد یہ ہے کہ عبادت کی کوئی سنجیدہ اہمیت تو ذہن میں آ ہی نہیں سکتی، اور اب جو کوئی تاکید کرتا ہے تو خیال لامحالہ یہی گذرتا ہے کہ یہ بجز مذاق، ظرافت، دل لگی کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟

اب ملت کی مشغولیت سوا اس کے باقی ہی کیا رہ گئی ہے کہ صلاح و فلاح کی حقیقی تدبیریں اور ان کی جانب توجہ غائب، آج یہ انجمن بنی اور کل وہ مجلس۔ چندہ اس میں بھی دیجئے، اور اس میں بھی، اور ترقی کے بجائے سایۂ ترقی کو کافی سمجھ لیجیے۔[1] ؎

کمیٹی میں چندے دیا کیجیے — ترقی کے لئے کیا کیا کیجیے

جدید تحریک، جدید تعلیم و جدید کمیٹی بازی اور جلسہ سازی، حضرت اکبر ان سب چیزوں کے شدید مخالف تھے۔ چندہ کا رواج نیا نیا انہیں کے زمانہ میں نکلا تھا، اور خوب زور شور سے پھیل گیا تھا اس لئے ان کے ترکش طنز کے تیروں کا بڑا ہدف یہی چندہ رہا کرتا تھا۔ ذیل کی مصوری ان کے اپنے نقطۂ خیال سے کتنی دلکش اور کیسی جامع ہے ؎

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے — کالج کے چونٹے لپٹے ہیں ٹیڑھی کی ٹانگ سے
عالم ہیں چپ جو متقدر و باوقار رہیں[2] — گو مجلس نما پریشاں ہے، دفالی[3] کے سانگ سے

---

[1] جس زمانہ کا یہ کلام ہے اعلام دین بھی کثرت سے سیاسی اور وطنی تحریکات کے جزو و نگران ہیں گھل مل گئے تھے۔ ایک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی اپنے مخصوص شاگردوں اور نائبوں کے، اس طوفان سے الگ اپنی دینی خدمات میں مشغول تھے۔ اکبر کا یہ اشارہ انہیں کی جانب ہے۔ [2] اخبارات۔ [3] دلاگ گیت۔

نیت دُنیا طلبی و دنیا پرستی کی، لیکن آڑ مذہب کی، مقصود و مطلوب دُنیا لیکن زبان پر نام دین و مذہب کا۔ اکبر یہ رنگ دیکھتے ہیں، اور ذرا دیکھئے، یہ رنگ ڈھنگ دیکھ، صدا کیا لگاتے ہیں ؎

قرنا گئے ہیں یہ خوب بھائی گھونرن　　دُنیا روٹی ہے اور مذہب چونرن

کھانا ٹھونس ٹھونس کر کھالیا جاتا ہے تو آخر چونرن کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ چونرن کچھ دل سے مرغوب ہو۔ مقصود تو وہی کھانا ہی ہے، لیکن کام نکلتا نہیں بغیر چونرن کی مدد کے۔ خود مقصود تو وہی دُنیا ہی ہے، لیکن آڑ بہرحال مذہب کی:

"گئو رکھشا" کی جد و جہد نئی نہیں، پرانی ہے، اور تحریک خلافت کے زمانہ میں یعنی یہی کوئی ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء میں تو قدرۃً اس کا بڑا زور بندھا۔ مسلمان اتحاد کے جوش میں اس معاملہ میں بھی ہندوؤں سے کچھ آگے ہی بڑھ چلے۔ اکبر کا کہنا ہے کہ خیر گائے کی جان بچی تو بچی، یہ بھی ایک سیاسی مصلحت سہی مضائقہ نہیں ضرورت تک کہہ لیجئے۔ لیکن آگے چلئے، اہل ضرورت تو مسلمانوں کو اپنے احکام دین و شعائر ملی پر نذر چڑھا رہی تھی۔ تخیل کا یہ طلبیادہ، ظرافت کی پھلجھڑی بن کر یوں پیش ہوتا ہے ؎

چھوٹیں جو گائے ماتا حسرت سے او نٹ بولے　　افسوس شیخ جی نے ہم کو پتا نہ سمجھا

اور یہ ترک ذبح کا مسئلہ تو پھر بھی ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اکبر کی نظر تو قومی و ملی زندگی کے چھوٹے چھوٹے جزئیات پر رہتی تھی۔ ایک روز مجلس میں راقم سطور حاضر تھا۔ ارشاد یہ ہو رہا تھا کہ "صاحب! کی دیکھا دیکھی اب تو ہماری ہر پسند انجمن سازی اور انجمن بازی کی نذر ہے۔ اتنے میں ذکر انجمن ترقی اُردو کا نکل آیا۔ فرمایا "جی ان دیکھئے نہ زبان ہماری اپنی چیز تھی، اب یہ بھی ہمارے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اس کے لئے بھی ایک انجمن کھڑی کی گئی ہے، جب ہی تو میں نے کہا ہے ؎

ہم سے چھن کر ہو گئی بزم ترقی کے سپرد　　سچ کہا مرزا نے اب اردو بھی کورٹ ہو گئی

حکومت کے دربار میں عزت کی کرسی حاصل کرنے کا جو ایک ہی طریقہ و تدبیر ہے، سب پر روشن و

عیاں ہے، لیکن اسے کھلے لفظوں میں کہہ دینا سب سے لڑائی مول لے لینا ہے۔ اکبر ہی کی زندہ دلی ہے جو اس تلخی میں بھی ایک شیرینی اور حلاوت پیدا کر دیتی ہے ؎

عقل نے اچھی کہی کل لالہ مجلس رائے سے — جھک کے لینا چاہیئے ہم سب کو اب سر آپ سے

"صاحب" کے اس عزت پانے پر اُن کے لئے "لالہ مجلس رائے" کیا خوب، اور اس کا قافیہ "والسرائے" تو بہت ہی خوب۔ عقل بہ معنی مصلحت اندیشی، واہ اور لطیف قافیہ کے لئے ساتھ کا دوسرا شعر بھی معاً سن ڈالئے ؎

شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیئے اس کے ہیں خوب — کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

ندرت تشبیہات، اکبر کے نسخہ ظرافت کا جزِ اعظم ہے، ایسی ایسی اچھوتی، نادر و لطیف تشبیہیں اور کہیں کہیں پھبتیاں انہیں خود بخود سوجھ جاتیں، جو دوسروں کے ذہن میں سوچ بچار کے بعد بھی نہ آتیں۔ یہ ہم آپ سب ہی جانتے ہیں، روزمرہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک طرف تو شوقِ صاحبیت کا سوار رہتا ہے۔ دوسری طرف کچھ رکھ رکھاؤ، کچھ ذات برادری والوں کا ڈر، کچھ وضع کا پاس غرض نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے کا ایک تذبذب، گومگو، اور دو عملی کا عالم قائم۔ چار قدم آگے بڑھے تو چھ قدم پھر پیچھے ہٹ گئے۔ کتر بیونت کچھ اودھر سے کی، کچھ ادھر سے۔ جوڑ پھر بھی ٹھیک نہ بیٹھا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم کا نصیب ہوا۔ ہنسے گئے، بنائے گئے، قہقہے ادھر سے بلند ہوئے، تالیاں ادھر سے بجیں، واقعیت کے اس سادہ نقش پر حضرت اکبر کی گلکاری ملاحظہ ہو ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی — اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

اکبر کے زمانہ میں سینما کہاں تھا۔ تھیٹر ہی سب کچھ تھا۔ ناٹک دیکھنے کے لئے کسی ثقہ بزرگ کا بہ ایں جبہ و عمامہ تشریف لے جانا، اور پھر اس کے لئے اونٹ جیسی مقدس سواری کا انتخاب کرنا جان بلاغت

نے۔ کیا کیا انگلیاں اُٹھی ہونگی جب حضرت سلامت کی سواری اس شان سے اونٹ پر نکلی ہوگی!
عام شاعروں پر قیاس کرکے لوگ اکبر سے بھی فرمائشی شاعری کی توقع رکھتے تھے۔ اور فرمائشوں کی
بھرمار سے انہیں زچ کر دیتے تھے۔ آپ نے ہی یہ کیا کہ ساری توقعات سارے تقاضوں کے جواب
میں ایک پر لطف اور اچھوتی تشبیہ پیش کردی ـــ

عشاق کو بھی مالِ تجارت سمجھ لیا اس قہر کو ملاحظہ للہ کیجیے
پھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف ہیں کہتے ہیں فیس لیجیے اور آہ کیجیے

اخباروں، رسالوں کی طرف سے فرمائشوں کی حد ہی نہ تھی۔ اکبر کا نام چلا ہوا، شہرت خوب پھیلی ہوئی
ہر ایک یہی چاہتا کہ اس شہرت و ناموری سے خود فائدہ اٹھائے۔ اکبر کہاں تک سب کو خوش رکھتے
اور پھر پیرانہ سالی میں، مروت میں انکار کرتے بھی نہ بن پڑتی۔ آخر ایک مرتبہ یہ شعر چھاپ دیا ـــ
یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسالِ خدمت ہے ÷ ہمارے لختِ دل ہیں، آپ کا مالِ تجارت ہے
یہ ضرور نہ تھا کہ تشبیہیں ہمیشہ نادر اور اچھوتی ہی ہوں بعض جگہ معروف و مانوس بلکہ پامال
تشبیہوں کو بھی استعمال کیا ہے، مگر اس حسن و صنعت کے ساتھ کہ اس تقلید پر جدتیں نثار ہو جائیں
شاطر فن کا کمال اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ ۶۰ سال کی بوڑھی ہاڑھی خاتون میں ۱۶ سال کی حسین
و نوخیز لڑکی کا حسن و جمال رعنائی و محبوبی پیدا کردے! بعض نامور استادوں کو دیکھا ہوگا کہ شعر
کہنا تو کچھ واجبی ہی سا آتا ہے، البتہ محاورہ خوب باندھتے ہیں، لفظ کوئی غلط نہیں آنے پاتا، عروض
کی لغزش کوئی نہیں ہونے پاتی، متروکات سے بہت محتاط رہتے ہیں، ذم کا پہلو کلام کے پاس
نہیں پھٹکتا۔ اکبر کے نگار خانہ میں تشبیہ ان حضرات کی ملاحظہ ہو ـــ

عشق کے معنی کے عالم تھے، مگر عاشق نہ تھے صورتِ عذرا سے واقف تھے، مگر وامق نہ تھے

ایک دوسرا تعارف انہیں حضرات کا یوں کراتے ہیں ـــ

صورت لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوانِ قیس، شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

طبیعت میں مضمون آفرینی غضب کی تھی۔ نمونے اوپر ہی سے آپ دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک اور ملاحظہ ہو۔ اردو رسم الخط کے دشمنوں کا کہنا یہ ہے کہ اس کو گھسیٹ میں لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ۔ یہ کہنا کچھ صدقِ دل سے نہیں۔ تمام تر پروپگنڈا کے ماتحت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دیوناگری کی گھسیٹ تحریر، اردو سے کہیں زیادہ چوپٹ ہوتی ہے اور اس کی مضحکہ انگیز مثالیں، عدالتی کارروائیوں، دستاویزوں وغیرہ کے حوالہ سے اخباروں میں بارہا نکل چکی ہیں۔ ... اب دیکھئے کہ اکبر کی نازک خیالی نے اس خشک حقیقت سے کیا طرفہ مضمون نکال کھڑا کیا ؎

دوستو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو | بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
لکھا تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں | کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

زمانہ کی ناقدری، شاعری کی دنیا کا بڑا پٹا ہوا مضمون ہے۔ سب ہی سب شاعر سامعین کی بدمذاقی کا رونا روتے چلے آتے ہیں لیکن یہی صدائے درد، جب چمنستانِ ظرافت کے اس عندلیب کی زبان سے نکلتی ہے تو نغمۂ لطیف بن کر سنائی آتی ہے۔ رُلاتی نہیں ہنساتی ہے، اور چشمک گدگدی میں تبدیل ہو کر رہتی ہے ؎

قدر دانوں کی طبیعت کا عجب رنگ ہے آج | بلبلوں کو ہے یہ حسرت کہ وہ الّو نہ ہوئے

اردو دانوں، اردو خوانوں، اردو دلیسوں کی بزم میں "مرحبا" اور سبحان اللہ کی کیا کمی۔ تحسین کے وہ غلغلے، آفرین کے وہ آوازے بلند ہوں کہ محفل گونج جائے۔ در و دیوار ہل جائیں لیکن لفاظی کے اس شور و ہنگامہ سے آگے؟ بس خلا ہی خلا۔ بڑی سے بڑی علمی تحقیق و کاوش میں سر کھپا دیجئے۔ اس کے بعد خود ہی اپنے ہاتھ سے مسودہ صاف کیجئے۔ مطبع والوں کے دروازہ پر

دستک دیجئے۔ ان کے سارے نشتر غمزے برداشت کیجئے۔ وعدے وعید آزما کر پریس کے شکنجہ میں کتاب کے صفحوں کے ساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی شکنجہ میں دبوا لیجئے۔ اور جب کتاب پریس سے باہر آئے۔ تو خود ہی اشتہار لکھئے۔ اور پھر مدتوں خود ہی پڑھتے رہئے۔ کتابیں یا تو دوستوں کو ہدیۃً تقسیم کر دیجئے، ورنہ ڈھیر اپنے سامنے لگا دیکھ کر بس خوش ہوتے رہئے۔ یہ خشک حقیقت اردو اہلِ قلم کے لئے کیسی ہی یاس انگیز، دل شکن، ہمت توڑ سہی، لیکن دیکھئے ظرافت کی مسیحائی نے اس بے جان لاشہ میں کیسی جان ڈال کر ہنسے گویا کر دیا ہے ؎

کھلا دیوان مرا تو شورِ تحسین بزم سے اٹھا   مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

شاعروں کا ضعف و ناتوانی، العظمۃ للہ، ضرب المثل کے درجہ تک پہنچا ہوا۔ جسے دیکھئے سب ہی اپنی صحت سے نالاں، اپنی لاغری سے متعلق نوحہ خواں، ہمارے حضرت اکبر نے اس پامال مضمون میں ندرت یہ پیدا کی، کہ کمزور و ناتواں اپنی صحت ہی کو نہیں، اپنی بیماری کو بھی باندھا، اور اپنے مرنے کو اپنی بیماری ہی کی کمزوری کے بل پر ثابت کر دکھایا۔ فرماتے ہیں ؎[2]

کمزور ہے میری صحت بھی، کمزور مری بیماری بھی   اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا، بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ندرتِ قوافی کے تو بادشاہ تھے، ایسے ایسے نادر قافیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے کہ ان کے تصور ہی سے دوسروں کا قافیہ تنگ ہو جائے۔ یوں کہئے کہ ان کے نمکدان ظرافت کی ڈلیاں اکثر یہی جنسِ نایاب قائم کئے ہوئے، ایک جگہ بڑھاپے کی آپ بیتی، دکھ درد کی کہانی سناتے ہیں، لیکن طبیعت کی شوخی کا یہ عالم کہ سننے والوں کو رلانے کی جگہ ہنساتے جاتے ہیں ؎

---

[1] اردو میں یہ لفظ شاید پہلی بار آ رہا ہے، میرے مذاق میں یہ عربی و ہندی کی ترکیب جائز ہے

[2] غیر مطبوعہ یعنی اب تک کسی کلیات میں درج نہیں۔

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے — قافیہ آن کا ملا تھا آنت سے
صحت اب بگڑی تو ان میں درد ہے — اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے
خواب راحت کس طرح آ کر کھلے — رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے
درد کے آگے رہا منجن بھی گرد — مصطگی بھی رہ گئی ہو کے زرد!

ایک دوسرا زعفران زار اس سے بھی بڑھ کر ملاحظہ ہو ؎

دانت کا درد بدستور چلا جاتا ہے — وہی مازو، وہی کافور[1] چلا جاتا ہے
ڈارون[2] کے اسی لکچر کا سبق ہے اب تک — وہی بندر وہی لنگور چلا جاتا ہے
برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ — روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

"روشنی" اور "نور" کا یہ نازک فرق اس کے قبل کسی کو کیوں سوجھا ہوگا! اور پھر برقی لیمپ، سبحان اللہ نور علیٰ نور! قطعہ کا آخری شعر ہے ؎

شیخ صاحب کی کمر جھک گئی اور دل نہ جھکا — آج تک شوق سقنقور[3] چلا جاتا ہے

اشعار ذیل میں جان محض قافیہ نے ڈالی ہے ؎

جو سچی بات ہے کہوں گا بے خوف و خطر اس کو — نہیں رکنے کا میں ہرگز پڑی ہو سر کے کچنر کے
آثار آتے جو کابل سے تو پٹتے سب کے حصے ہیں — امیر آئے تو کیا آئے مزے ہیں لارڈ منٹو[4] کے

"منٹو کے" کا قافیہ "کچنر کے" لاٹ اکبر ہی کا حصہ تھا۔

---

[1] مازو اور کافور دانت کے امراض کی مشہور دوا ہیں [2] انگلستان کا مشہور سائنسدان۔ اس کے نظریات کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے دوسری نوع بنتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ حیوانات کا ارتقاء انسان پر ختم ہوا، اور انسان ترقی یافتہ بندروں ہی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے [3] ماہی سقنقور، مردانہ قوت کے لئے ایک مشہور دوا [4] لارڈ منٹو ہندوستان کے وائسرائے۔ امیر حبیب اللہ خاں مرحوم والی افغانستان انہیں کے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے۔ شاہ افغانستان اس وقت امیر ہی کہلاتے تھے۔

ایک غزل اسی زمین میں ہے "مجلس تو باقی ہے"، "نرگس تو باقی ہے"۔ اس کے مقطع میں قافیہ "پیرس" کالائے ہیں، اور وہ بھی کس روانی و بے تکلفی کے ساتھ ؎

یہ مصرعہ قافیہ ہی کے لئے ہے خوب اے اکبرؔ — جو اُجڑا لکھنؤ کچھ غم نہیں، پیرس تو باقی ہے

اگرچہ اس میں واقعیت پر ظلم اچھا خاصہ ہو گیا ہے۔ لکھنؤ غریب انتہائی اوجِ شباب کے زمانہ میں بھی بھلا پیرس کے مقابلہ میں کیا ٹھہر سکتا تھا! ظریفانہ کلام میں بارہا لفظ پست و مبتذل لاتے، لیکن موقع محل ایسا چھانٹ کر نکالتے، بندش اس خوبی سے کرتے اور مصرعہ اس ٹھاٹھ کا رکھتے کہ پستی و ابتذال غائب، کلام میں بجائے تنافر کے لطف و شگفتگی قائم۔ مذاقِ سلیم پکار اٹھتا کہ بے شک اس خاص موقع کے لئے یہی لفظ مناسب تھا اور یہی موزوں! ایک شعر چند ہی صفحہ ادھر نقل ہو چکا ہے ؎

شانِ نماز اکبر شاہانہ ہو چکی ہے — مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاقی

"میاں وفاقی" کے لفظ سے بڑھ کر جامع اور بلیغ اس موقع کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے!۔

اقبال کی مشہور نظم "جوابِ شکوہ" کا وہ مشہور بند تو سب کے ذہن میں ہو گا ؎

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب — زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب — پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب

اُمرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملّتِ بیضا غُربا کے دم سے

اکبرؔ نے مضمون کے اس سارے دریا کو اپنے دو مصرعوں میں، بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی مصرعہ کے کوزہ میں بند کر دکھایا ہے ؎

اسلام کی رونق کا کیا حال کہوں تم سے — کونسل میں بہت سیّد، مسجد میں فقط جمّن

"کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن" بہت خوب، بہت خوب۔ فرمانے لگا، کہ ایک بار دلّی جانا ہوا۔ زمانہ کوئی ۱۹۱۳ء کا۔ دارالسلطنت بہادر بنگلہ سے منتقل ہوکر دلّی آچکے تھے اور دلّی بڑی تیزی کے ساتھ "نئی دلّی" بنتی جا رہی تھی۔ اجلاس امپیریل کونسل[1] کا ہو رہا تھا۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے مشاہیر مسلمان ہر ہر صوبہ کے جمع تھے۔ ایک دن محلہ کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھنے گیا۔ نماز کے وقت پھٹے حالوں ایک مؤذن صاحب نظر آئے، اور انہیں کے طبقہ کے دو، ایک نمازی، بس کل اتنی ہی جماعت۔ نماز کے بعد میں نے مؤذن سے پوچھا کر کیوں میاں، امر .... بھی کبھی نماز پڑھنے تشریف لاتے ہیں؟ مؤذن بے چارے نے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ میں نے اور سوال دو ایک اور مشہور لیڈروں کے متعلق کئے۔ کہ اچھا فلاں خان بہادر، فلاں نواب صاحب، فلاں آنریبل بیرسٹر صاحب تو ضرور ہی کبھی آتے ہوں گے وہ غریب ہر مرتبہ ہکا بکا۔ تب میں نے کہا اچھا تو یہ کہو کہ

"کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن"

پیش مصرعہ بعد کو لگایا۔

ذکر غالباً ۱۹۱۵ء کا ہے۔ اس خاکسار کو الٰہ آباد میں حضرت اکبر کے مہمان ہونے کا شرف حاصل تھا، اتفاق سے شیعہ کانفرنس کا جلسہ بھی اس زمانہ میں الٰہ آباد میں ہو رہا تھا۔ ایک روز شب کے کھانے پر حضرت اکبر نے دو ایک صاحبوں کو اور بلایا تھا۔ کھانے کے بعد حضرت اکبر، مسلمانوں کی زبوں حالی پر تاسف کر رہے تھے کہ ایک صاحب بول اٹھے کہ کچھ بھی سہی، بہرحال

---

[1] جو قانون ساز مجلس اب (۱۹۴۲ء میں)، سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کہلاتی ہے، اس وقت اس کا نام امپیریل کونسل تھا۔

شیعوں سے تو ہماری اخلاقی و معاشرتی حالت بہت ہی بہتر ہے"۔ لسان العصر بولے کہ "جی، کیا بات آپ نے پیدا کر دی ہے، ہم ساری خدائی سے ذلیل سہی، پھر بھی یہ اطمینان کچھ تھوڑا ہے کہ شیعوں کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے"، اور جب ہی تو ہیں نے بھی عرض کیا ہے ؎

"ہر چند بے وقار ہیں مرزا کو غم نہیں   کیا کم ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں"

"کیا کم ہے یہ شرف" اس ٹکڑے کو مکرر پڑھئے۔

ایک جگہ "صاحب" کے مقابلے میں صاحبیت کے مارے ہوئے گروہ کا چربہ ان الفاظ میں اتارتے ہیں ؎

مسجد میں شیخ صاحب، اگر جا ہیں لاٹ صاحب   بدھو فلاسفی کے کمرے میں ہٹ رہے ہیں

کسی پچھلے کلیات میں مسلمانوں کے پاس اکبر مستقبل کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچ چکے تھے ؎

محکم پرستش کا، ملک ہندو کا   اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

پھر جب ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کے ایک مشہور و ممتاز عالم نے تحریک ترک موالات میں بالکل گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے کا اعلان کیا، تو ارشاد ہوا ؎

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں   گو مشت خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبر حرفوں سے مرکب لفظ نہیں بولتے، پوری کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں۔

لفظ "بدھو میاں" سے بڑھ کر اور جامع تر   اس موقع کے لئے اور ہو کیا سکتا تھا!

کلیات اول میں مسلمان خاتون کی تعلیم کا عکس بھی ایسے ہی آئینہ میں دکھا چکے ہیں ؎

ترقی کی تپیں ہم پر چڑھا کیں   گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں

رہیں ہر سپہ کے آیا، بی نصیبن   وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

غرض یہ کہ کلو، صلو، پیرو، حسو، بدھو، گنگو، گھورن، جمن، وفاتی، اشراقی، کریمن، نصیبن

وغیرہ کوئی لفظ بھی اکبر کی ٹکسال سے باہر نہیں اور وہ ہر جگہ کام ان سے اپنی مرضی کا لیتے رہتے ہیں۔ اور خیر یہ تو پھر بھی عَلم تھے، یعنی مردوں، عورتوں کے ذاتی و شخصی نام، کمال یہ تھا کہ زبان کے عام لفظ مبتذل طبقہ سے اٹھا کر لاتے اور اپنے حسن بندش و کمال مرصع سازی سے کرخت بدزیب و بدہیئت سنگ ریزوں کو نگینہ بنا کر خاتم شعر میں جڑ دیتے۔ داغؔ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اکبر نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے، مطلع ملاحظہ ہو ؎

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ "فالتو" بھی کیا خوب! اکبر کے سوا یہ کس کے بس کی بات تھی کہ ردی میں یہ بلا کا حسن و جمال پیدا کر دے! شاعر کے ذہن میں جو تحقیری تصور، ایسی عقل سے متعلق تھا، اُسے کس خوبصورتی سے اس لفظ نے ادا کر دیا!

کلیات دوم میں ایک قطعہ آزادیٔ نسواں پر ہے، کوئی صاحب اپنے گھر میں بے پردگی کے خلاف کوئی وعظ شروع کرتے ہیں، لڑکیاں تردید پر آمادہ ہو جاتی ہیں اور سند میں "دولہا بھائی" کی رائے پیش کرتی ہیں ؎

دولہا بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اس کے آگے یہی لڑکیاں، خاندان کے مردوں سے مخاطب ہو کر لیتی ہیں ؎

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیے دیتے ہو ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

"گٹ پٹ"! جی ہاں انگریزی کی ابجد نہیں، اے۔ بی۔ سی۔ ڈی نہیں، صرف گٹ پٹ! حق یہ ہے کہ زبان کا کوئی لفظ بھی بجائے خود نہ مبتذل ہے، نہ خلاف متانت۔ اصل شے اس کا موقع و محل استعمال ہے، اور اکبر اس موقع شناسی کے بادشاہ تھے۔

الفاظ سے گذر کر یہی سلوک محاوروں، مثلوں کے ساتھ کرتے رہتے۔ بازار میں چلتے پھرتے کہیں سے یہ محاورہ ہتیا لائے۔ کہیں سے وہ۔ بلاغت کے سانچہ میں ڈھال رنگ روپ ان کھلونوں کو کچھ اس طرح کا دے دیا کہ آپ جس کی نظر پڑی، لٹو ہو گیا۔ لڑکوں کا ذکر نہیں۔ اچھے ثقہ، بڑے بوڑھے انہیں کمال صناعی کا نمونہ سمجھ کر اپنی میز پر، ڈرائنگ روم کی کانسوں پر جگہ دینے لگے۔ فرش کو ان آرائشوں سے سجانے لگے، گلدانوں میں ان پھولوں کو رکھنے لگے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں سہ

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج　　اب ڈم کی جگہ بلت، نمدے کی جگہ کالج

"بات تری ڈم میں نمدہ" بہ زبان شرفا کی نہیں، عوام کی ہے لیکن اکبر کی کان نمک میں آ کر ہر شئے نمک ہی بن جاتی ہے۔ اس لطف و لطافت کے ساتھ انہوں نے اس کو کھپایا کہ بزرگان محفل کے چہروں پر شکن پڑنے کے بجائے اور مسکراہٹ آ گئی۔ ظرافت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ الفاظ و حروف کی باہمی مناسبتوں کی جانب ذہن بڑی تیزی کے ساتھ منتقل ہوتا، اور پھر ان مناسبتوں کے بل پر تخیل، دلچسپ و پر لطف نکتے طرح طرح کے پیدا کرتا رہتا، فرماتے ہیں سہ

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا　　سر[1] ہو گئے تو بال[2] کا بھی شوق ہو گیا

سرحد کے قریب کیمبل پور کے کوئی صاحب منشی الف دین نامی تھے، ان بے چارہ نے ایک مثنوی حقانیت اسلام پر لکھی، اور حضرت اکبر کے پاس ریویو کے لئے ارسال کی۔ بیر ظریف نے دو مختصر مصرعوں میں جامع و مانع ریویو کر دیا، تصنیف و مصنف دونوں پر سہ

---

[1] (SIR) ایک بڑا انگریزی خطاب [2] (BALL) انگریزی ناچ۔

الف دین نے خوب لکھی کتاب — ملی جس سے تب لے دین کو راہ صواب

پہلے مصرعہ میں "الف" کے لام کو ساکن نہیں کسرہ کے ساتھ پڑھئے۔ دوسرے مصرعہ میں اس "الف" کے مقابلہ میں "ب" پڑھئے۔ سارا کھیل بس "الف بے" کا ہے۔

ذیل کا قطعہ کیا ہے، ایک مستقل گدگدی ہے، بڑے سے بڑے خشک مزاج کے لئے بھی اور بات کچھ نہیں لفظی بھی نہیں، محض لفظی ہیر پھیر ہے

یہ کہتے ہے اک لالۂ باوقار — کہ عربی حروف اب تو ہیں ہم پہ بار
مگر کی نہے انہیں سے ہماری نمود — یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا "حرام" اور کہاں کا "حلال" — ہٹے حائے حطی، رہیں "رام لال"

"حرام" اور "حلال" سے حائے حطی ہٹا کر دیکھ لیجئے نا، وہی "رام" اور "لال" باقی رہ جائیں گے۔

کبھی یہ بھی کرتے کہ کوئی عام و معمولی سا لفظ لے لیتے، اس کے حروف میں قطع و برید کر کے نئے نئے شگوفے معانی و مطالب کے پیدا کر دکھاتے۔ الفاظ وہی جو روز ہم آپ بولتے، سنتے رہتے ہیں۔ اکبر کی ذہانت بس ان کے اجزائے ترکیبی میں الٹ پھیر کر کر، نئے نئے قالب تیار کر دیتی، اور قوتِ خلاقی ان کاغذی پتلوں میں نازک خیالی، اور معنی طرازی کی روح پھونکتی جاتی۔ ایک آدھ مثال اس صنعت گری کی ابھی اوپر گذر چکی ہے، دو ایک مثالیں وہ بھی بے ساختہ دکھا دیئے، زبانِ قلم پر چلی آرہی ہیں۔ لکھنؤ سے ۱۹۱۱ء میں جب روزنامہ ہمدم پہلے پہل نکلا ہے، جالب مرحوم دہلوی کی ادارت میں اور اس نام کے موجودہ اخبار سے بالکل ہی مختلف۔ تو اس پر ارشاد ہوا ہے

خوب ہے نام اس کا گر ہمدم رہے — "دم" نکلنے پر بھی باقی "ہم" رہے

کیا بے تکلف سجع ہے!

" الف، ب، ت کے نام سے واقف تو جاہل تک ہیں، لیکن کسی بڑے عالم نے بھی محض ان ناموں" سے تصوف و معرفت کا یہ درس کیوں حاصل کیا ہوگا ؎

الف، ب ت ہی کو پڑھ کر میں سمجھا — الف اللہ کا، اور ماسوا بت

"ب" اور "ت" کو ملایئے تو بت، بن جاتا ہے یا نہیں؟ بس تو اکبر کا کہنا یہ ہے کہ الف تو اللہ کا ہو گیا، اور اللہ کے سوا اب جو کچھ ہے وہ بت ہی بت ہے اکیا نیا رنگ وحدت الوجود کو دے دیا ہے!

"تعلیم" کا لفظ ہر شخص کی زبان پر ہے۔ علیؓ کا نام بھی عالم و عامی سب جانتے ہیں، اور پڑھے لکھے تو انہیں باب مدینۃ العلم بھی مانتے ہیں۔ اب اکبر کی شاعری اور ساحری یہ ہے کہ ان دو بظاہر بالکل بے تعلق لفظوں کے درمیان رشتہ؟ اور وہ بھی کیسا گہرا پیدا کر دیتے ہیں! ؎

سمجھائی ہے مجھے نکتہ یہ میری طبع سلیم — "علیؓ" کی "تم" میں جب جگہ ہو تو بس وہی تعلیم

ظاہری پہلو تو یہ ہوا کہ لفظ "علی" کو اگر "ت" اور "م" کے حصار کے اندر لے لیا جائے تو لفظ تعلیم بن جاتا ہے۔ معنوی پہلو یہ ہے کہ حبّ علیؓ کو قلب میں جگہ دینا حقیقی تعلیم ہے۔

سیاسیات کے دائرہ میں خود بلاغت اُن کے اس تراشش و خراش کی بلائیں لیتی ہے تخیل سنجی سر دھنتی ہے، معنی طرازی وجد میں آکر رہتی ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

"ہ" ہے ہند و "م" ہے مسلم یہ دونوں مل گئے "ہم" — سر پہ انگریزی "الف" اس سے ہوئی حالت "اہم"

ہے "الف" ہم سے جدا، لیکن محافظ اور معین — اس کے سایہ میں رہیں "ہ" "م" شامل ہو تو "ہم"

لفظ "اہم" کی کتابت میں دیکھئے نہ حرف "الف" کیسا اکیلا کھڑا، الگ تھلگ، سرکشیدہ نظر آتا ہے۔ بخلاف اس کے "ہ" اور "م" باہم شیر و شکر، ایک دوسرے سے مدغم! "ہ" اور

"یوں بھی کہا کرتے کہ شاعری سے مقصود تفریح و تفنن نہیں - یہ تو ایک آلہ ہے نفس کی تربیت و اصلاح کا - اور کہیں یوں ارشاد فرماتے ہیں

تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے راہ کے لئے
ہے میری شاعری دلِ آگاہ کے لئے

ہے یہ دعا کہ ترکِ فضولی نصیب ہو
جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لئے

اِک غل مچا کہ اس کو بھی لیسنس ہے ضرور
منہ کھل چکا تھا، ورنہ میرا آہ کے لئے

سنجیدہ بیانی کے باوجود آخری شعر میں ظرافت کے چٹخارے کے بغیر نہ رہ سکے۔

مشہور و پُر عظمت شخصیتوں کی مخالفتیں بھی بڑے زور شور کی ہوئی ہیں - اکبر کی مخالفت اس درجہ میں تو نہ ہوتی - پھر بھی کبھی کبھی تو یار لوگ فن عروض و لغت کی کتابیں بغل میں دبا نکلتے ہی رہتے اور کلام اکبر کی طرف انگلیاں اٹھا دبی زبان سے کہتے ہی رہتے کہ یہاں یہ فن کی غلطی ہے - وہاں یہ لغزش ہے - اکبر بحث و مباحثہ کے قریب بھی نہ جاتے، نہ زبانی نہ تحریری - دوسروں کو نصیحت کیا کرتے کہ کبھی مدعی کے منہ نہ لگنا، اور کسی صاحب دعویٰ سے سوال و جواب میں نہ پڑنا - پھر بھی بشر تھے - منہ میں زبان رکھتے ہی تھے کبھی کبھی کچھ کہہ ہی اٹھتے - جو بول ان کے منہ سے نکل جاتے - ظریفانہ ادب میں پتھر پر لکیر بن جاتے - ایک جگہ فرماتے ہیں

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے
ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے

کہاں بلبل کی قدرتی بے ساختہ ہم آہنگی، کہاں سارنگی کی مصنوعی رُوں رُوں! خیر یہ تقابل تو ہے ہی، باقی یہ سارنگی کے ضلع میں "استاد" بھی کیا خوب! ایک دوسری جگہ شوخی کا رنگ ذرا تیز کر دیا ہے

قاعدوں میں حسنِ معنی گُم کرو
شعر میں کہتا ہوں ہے تجھے نم کرو

اب چند شعر بلا کسی تنقید و تبصرہ کے یوں ہی ملاحظہ کر لیجئے - باغ کی سیر آزادی و بےفکری

ہے، خود بھی تو ایک جیسپینز ہے۔ یہ کیا کر پھولوں کے نام، نشان، رنگ و بو کی پوچھ پاچھ قدم قدم
پسالی سے ہوتی رہتی ہے ؎

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز　　جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

ہمیں کیا بالشویک آ گیا یا آ دس آتا ہے　　یہاں تو فکر سرائی ہے ماہ اور برس آتا ہے

ایر شپ سے ہم اماں لے چرخ پائیں گے کہاں　　آسماں پر لا رہا ہے آ کے جائیں گے کہاں

ممبر علی تمراد ہیں یا سکھ نددان ہیں!　　لیکن معاشہ کو وہی نادان ہیں

ہجر کی شب یونہی کاٹو بھائیو!　　ان کا فوٹو لے کے چپاٹو بھائیو

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے　　جو مارتے تھے مکھی، اب مارتے ہیں چوہے

شاعر جو ملازم ہو اکبر، دو دو نیتین ہے اس کا لقب　　پوچھو گے یہ کیوں، از شیخ سنو، تنخواہ بھی ہے، اور واہ بھی ہے

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی　　ملا کی دوڑ مسجد، اکبر کی دوڑ بھٹی

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا کہوں　　گفتنی در حج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

اعتقادِ نو کی برکت دیکھیے!　　تاجر اب اہل قلم ہیں بالس کے

محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب　　"ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے "پا برکاب"

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے　　ایک ہیں خفیہ پولیس میں، ایک پھانسی پا گئے

یہ سب زیادہ تر وہی شعر ہیں جو ان کے مطبوعہ کلیات میں موجود ملیں گے، لیکن طرز افادہ
کلام کا ایک اچھا بڑا حصہ ایسا بھی ہے، جس کے چھاپنے کے وہ اپنی زندگی میں کسی طرح روادار نہ

۱؎ جس زمانہ کا یہ شعر ہے، روس میں نیا نیا "بالشویک" انقلاب ہوا تھا، اور بالشویک حملہ کا دھڑکا ہر
وقت ہندوستان کو لگا رہتا تھا ۲؎ ہوائی جہاز (AIR SHIP)

ہوںگے۔ شاعر، آخر شاعر، خدا جانے کیسے کیسے وہم انہیں گھیرے رہتے، اور چھپانا تو الگ رہا ناجنسوں کو سناتے تک بھی نہیں کسی بے تکلف دوست یا نیاز مند کو اگر کہیں سنا بھی دیا۔ تو سو تاکیدیں کہ خبردار اسے میری زندگی میں شایع نہ کر دینا! اس مخفی کلام کا بیشتر حصّہ تو ایسا ہے کہ حضرت اکبر کی زندگی میں بھی بے تکلف شائع کیا جا سکتا تھا، اور اب دُنیائے فانی سے ان کے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد تو تھوڑا بہت مضائقہ بھی! اس کی اشاعت میں باقی نہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ کلام بجز ان کے "صاحبزادہ" کے اور کسی کے پاس ہے کہاں؟ اور صاحبزادہ صاحب اس خزانہ کے سانپ کی حیثیت رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ دو چار شعر، متفرق طور پر اِدھر اُدھر سے سُننے سُنانے یاد رہ گئے۔ وہ آگے حاضر ہیں۔ ہائے اسوقت کیا خبر تھی، کہ چند ہی روز میں یہ گوہر بے بہا ایسے نایاب ہو جائیں گے! اسوقت اس کا احساس ہوتا تو جبراً کر چھپا کر مِنّت کر کے، بنا کر غرض "زاری سے، زور سے، زر سے" جس طرح بھی ممکن ہوتا، نقلیں اُن مُنہ سے نکلے ہوئے الہامات کی ضرور ہی حاصل کر لی جاتیں!

* اکبر بڑے گہرے مذہبی! لیکن تقشف و تنگ خیالی سے بالاتر، عابد، عالم، صوفی تھے، "زاہد خشک" نہ تھے۔ سید احمد خانی تحریکوں کو ملّت کے حق میں زہر قاتل سمجھ رہے تھے۔ خود سر سیّد کی زندگی میں اُن کی تحریکوں کو اپنی میٹھی چھری سے کچو کے ہی دیتے رہتے۔ اور کلیات کے ہر حصّہ میں تو خوب کھلی کھیلے ہیں۔ تاہم ذات سر سید احمد خاں کے مخالف نہ تھے۔ اور اُن پر جو فتاویٰ کفر کی بارش ہو گئی تھی؟ اس کے قائل نہ تھے۔ کہتے تھے، خدائے رحمٰن ورحیم کی رحمت و مغفرت ہر کلمہ گو کے لئے بے پایاں ہے ہمارے مولوی صاحبان نے خواہ مخواہ اسے اس قدر ضابطوں، قاعدوں میں جکڑ رکھا ہے۔ وہاں تو نیّت کا سوال سب پر مقدم ہے۔ مسلمان گنہگار کے حق میں بالکل مولانا رُومؔ کے ہم مسلک و ہم زبان تھے ؎

ما درون را ننگریم و حال را　　　ما بروں را ننگریم و قال را
ناظر قلبیم کر خاشع بود　　　گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود

آخر زمانہ کی ایک غزل "دوا ہو یا نہ ہو" - "شفا ہو یا نہ ہو" کی زمین میں ہے، اس میں کہتے ہیں ؎

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخش دے　　　گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

مولوی صاحبان کی تشبیہ پولیس والوں سے ہی بڑی پُر لطف ہے، ایک طرف ان کا احترام بھی فرض شناسی کی داد بھی، دوسری طرف ان کی ضابطہ پرستی پر طعن بھی! خیر یہ شعر تو عمومی پہلو رکھتا ہے - ایک رُباعی اپنے مخصوص رنگ میں سید احمد خاںؒ اور سید احمد خانیوں ہی کو پیش نظر رکھ کر کہی ہے - چوتھے مصرعہ میں شوخی ذرا اپنے حد سے تجاوز کر گئی ہے - یہ طریقہ اکبرؔ کا نہ تھا ہر بزرگ کے نام کا بڑا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے - پہلے اور تیسرے مصرعہ کے الفاظ پوری طرح حافظہ میں نہیں ممکن ہے کہ فرق ہو گیا ہو ؎

گو سید نیچری خلیفہ دوڑے　　　یوں دہر پہ نیچری خلیفہ دوڑے
جب مر کے چلے ہیں سوئے جنت حضرت　　　لٹھ لے کے امام ابوحنیفہؒ دوڑے

آخر ۱۹۱۶ء تھا، جب لکھنؤ میں رُباعی اس زندہ دل زندہ جاوید شاعر نے اپنی زبان مبارک سے سنائی تھی - مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ - دیکھئے میری زندگی میں کہیں چھاپ نہ دیجئے گا - ورنہ مولوی صاحبان جان عضب میں کر دیں گے - میں نے تو جنت کا سماں دکھلایا ہے، یہ لوگ اسی دنیا میں میرے اوپر لٹھ لئے دوڑ پڑیں گے"

۱۹۱۹ء میں جب ترکی سے برطانیہ کی جنگ ختم ہو چکی تھی اور برطانوی مدبرین قسطنطنیہ سے ترکوں کے اخراج کا منصوبہ باندھ چکے تھے - اس وقت اسی قافیہ کے ساتھ پھر ایک رُباعی ارشاد ہوئی - فرمایا یہ تھا کہ اسلام کا مذہبی اثر تو مدت ہوئی ملک سے مٹ چکا ہے، اب نہ کر کے قسطنطنیہ اور

بنگلوں میں کہیں عبادت کے چرچے ہیں۔ اور نہ درسگاہوں میں کہیں دینی تعلیم کا رواج ہے۔ لے ہوئے تھے۔ نبوی اقتدار کی یادگار ایک ترکی سلطنت باقی تھی۔ یہ جھلملاتی شمع بھی زمانہ کی تیز آندھی کے جھکڑوں سے گل ہو کر رہی! مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ قیامت کا حکم رکھتا ہے مجازاً بھی حقیقتہً بھی۔ مجازاً تو ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر مصیبت مسلمانانِ عالم کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کا شیرازہ ہی منتشر ہو گیا۔ اور حقیقتہً اس لحاظ سے کہ حدیث نبوی کی پیش گوئی کے مطابق قسطنطنیہ کے اسلامی حکومت کا اٹھ جانا قرب قیامت کی علامت ہے۔ اب دیکھیے اس سارے مضمون کو کیا کوزہ میں بند کرتے ہیں سے

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت کالج سے امام ابو حنیفہ رخصت !

"صاحب! سے سنی ہے اب قیامت کی خبر قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

مرثیہ کے مضمون کو لطیفہ کی صورت میں پیش کرنا، اکبر ہی کا حصہ تھا، اللہ اکبر!

ایک بار صوبہ کی حکومت، علی گڈھ سے ناخوش ہوئی ادھر کا اشارہ پا، اودھ کے شیعہ رئیسوں نے لکھنؤ میں ایک شیعہ کالج کی طرح ڈالدی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں "تعلیم" کے متوالے "روشن خیالوں" کو بھلا کالج سے کیوں اختلاف ہونے لگا۔ انہیں منہ مانگی مراد ملی۔ لیکن شیعوں میں بھی جو ذرا دور اندیش تھے، وہ تاڑ گئے کہ یہ تو عین ضرب ہے علیگڈھ کی مرکزیت پر۔ عین اس زمانہ میں حضرت اکبر کا آنا لکھنؤ ہوا۔ ایک نامور شیعہ رئیس کے ہاں کے متوسل ایک صاحب ملنے آئے۔ چرچے تو ہر جگہ ہی ہو رہے تھے۔ یہاں بھی بات اسی کالج کی چھڑی۔ وہ صاحب بولے "ہمارے سرکار اس لئے تو کالج سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ خواہ مخواہ شیعہ سنی کے درمیان ایک اختلاف کی بنیاد پڑ رہی ہے۔" اکبر تھے بڑے پکے سنی۔ لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی کالجوں کے حقیقت شناس کچھ اس سے بھی زائد۔ بولے "جی نہیں،

علی گڈھ والوں کو رشک کیوں ہوگا، وہ تو اور خوش ہوں گے کہ چلئے ہماری تحریک کو اور کامیابی ہوئی اور ہماری ہی ایک شاخ اور کھل کر رہی۔ جب ہی تو میں نے کہا ہے سے

سید صاحب کو فکر کیوں ہونے لگا — کالج ہے یہ کچھ امام باڑا تو نہیں

یہ بھی کیا کوئی مذہبی چیز ہے؟ کوئی مسجد ہے؟ امام باڑہ ہے؟ علیگڈھ والے اس سے کیوں چڑھنے لگے۔ اس سے تو اور خوش ہوں گے کہ عین ان کے مشن کی اعانت ہوئی۔"

کیا نگاہ تھی۔ قومی، ملی، مجلسی زندگی کے ہر بڑے چھوٹے، ایک ایک جزئیہ پر نظر رکھتے۔ نظر بھی کیسی، عقابی ہمہ گیر نظر۔ لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاھا[1] کی مصداق۔ مجال کیا کہ ادھر کوئی واقعہ غیر معمولی نہیں، معمولی سا بھی ہو، اور ادھر وہ پیر ظریف کے رجسٹر میں درج نہ ہو جائے! اور پھر جو تصویر تیار کرتے، اس میں کیسے کیسے بظاہر بے جوڑ واقعات میں جوڑ، اور بے ربط حالات میں ربط پیدا کر دیتے تھے! دلکشی اور دلآویزی ترجمہ تھی اُن کے تخیل کا۔ ذکر شروع سنہ ۱۷ء کا ہے۔ علیگڈھ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی بڑی چہیتی اور سب سے بڑی مرکزی انجمن ہے۔ اس کے کارفرما صاحبزادہ صاحب پر لے دے زور شور سے ہو رہی تھی کہ وہ انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر ولایت تشریف لے گئے۔ ان کے جاتے ہی طوفان دھیما پڑ گیا۔ ایک واقعہ یہ اپنی جگہ پر تھا۔ دوسرا واقعہ عین اسی زمانہ میں پیش آیا کہ لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے۔ مولوی نظام الدین حسن نیوتنوی، ایک اعلیٰ پنشنر عہدہ دار اور فنون حساب و ہیئت کے بڑے ماہر۔ انہیں رویت ہلال کے مسئلہ پر طبع آزمائی کی سوجھی، لکھنؤ کے اخبار ہمدم

---

[1] قرآن کی آیت (سورہ کہف) نامۂ اعمال کا ذکر ہے کہ قیامت میں اسے دیکھ کر کافر چلا اٹھیگا کہ ہائے میری کم بختی، یہ کیسا رجسٹر ہے کہ چھوٹی بڑی کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں۔

ہیں زندہ ہمدم مرحوم ، موجودہ ہمدم سے بالکل مختلف تھا) لکھ دیا کہ علم ہیئت کا حساب کافی ہے ، ہر مہینہ چاند دیکھ کر تاریخ شروع کرنے کی ضرورت نہیں ۔ علماء شریعت اس بدعت پر کیسے سکوت اختیار کر سکتے تھے ۔ فرنگی محل سے جواب پہ جواب نکلنے شروع ہوئے ۔ کچھ لوگ اِدھر سے اُٹھ کھڑے ہوئے ، کچھ اُدھر سے ۔ اچھا معرکہ اکھاڑہ قائم ہو گیا ۔ قلمی اور اخباری اکبر کی ذہانت کب چوک جانے والی تھی ۔ دونوں بے تعلق ، بے ربط واقعات کو ایک رشتہ میں پرو کر موتیوں کی لڑی تیار کر دی ۔ پوری نظم تو اب ذہن میں پڑی رہی ہے ۔ قطعہ کی جان آخری مصرع تھا ؎

آفتاب احمد گئے تو چاند خاں پیدا ہوئے

کیا کہنا ہے زندہ دل قوم کا ؟ کوئی نہ کوئی پھلجھڑی ہر روز اس کو چاہیئے ۔ کل تک قوم کے آفتاب پر گرم گرم لگا ہیں پڑتی رہیں ۔ اُن بیچارہ کی جان بچی ، تو لیجیے رات ہلال پر چاند ماری شروع ہو گئی !

۱۹۲۰ء کا آغاز تھا کہ تحریک خلافت کے سلسلہ میں ایک وفد کا ریپ جانا طے پایا ۔ صدر وفد بہ حیثیت ملت مولانا محمد علی تھے ۔ ایک رکن مولانا سید سلیمان ندوی (صاحب معارف) بھی قرار پائے ۔ اکبر کو یہ بات ذرا کھٹکی ، کہ ایک عالم دین سیاسیات کا ضمیمہ بنے ہوئے ولایت جا رہے ہیں ۔ شاعری کی ساحری اور الفاظ کی نظر بندی ملاحظہ ہو ، کہ چڑھی ہوئی تیوریوں کو بشرہ کی خندہ جبینی اور لبوں کی مسکراہٹ میں تبدیل کر کے یوں گویا ہوئے ؎

سلیمان کی بات کیسی بنی ! | کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھنچے | مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں ! | خدا غیر سے اُن کو کر دے غنی

دِل کُرشتہ کیا معنی، یقین ہے کہ یہ نظم بس اتنی ہی سی نہ ہوگی، کچھ اور بھی ضرور شعر ہوں گے، لیکن اپنی زبان مبارک سے سُنایا صرف اسی قدر تھا۔ اور اسی، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ شوخ نگاری کی آگ ذرا ڈھیل چھوڑ دیتے، اور ظرافت کے حمام میں محلّا بالطبع ہو کر داخل ہوتے۔ اس وقت متانت اپنا منہ پھیر لیتی اور شائستگی کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ ایک لطافت اس صنعت کا بھی ملاحظہ ہو۔ یورپ میں جنگ عظیم برپا ہے۔ ترک غریب پر ہر طرف سے یلغار ہے بتیس دانتوں میں ایک زبان۔ روز یہی دردناک خبریں آرہی ہیں۔ آج یہ مقام گیا، کل وہ، یہاں تک کہ حریف کا قدم سالونکا تک پہنچ گیا (اس مقام کا نام یاد ہے) سارا عالم اسلامی ہیجان و اضطراب میں مبتلا، مرکز خلافت کی مظلومیت و بےکسی پر دنیائے اسلام کا ایک ایک گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ اس وقت حضرت اکبر اپنے بند کمرہ میں یہ چار مصرعے بے تکلف دوستوں کو سناتے ہیں۔ منٹ دو منٹ کے لیے بھی اُداس چہروں پر بشاشت دوڑ جاتی ہے اور غمناک آہیں بھرنے والے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

یورپ کی لیڈیاں بھی ترکی حرم میں آئیں ملحوظ رکھے دُنیا اس رشتہ باہم کو
پکڑ کر کے اس پہ قبضہ کہہ دیں یہ ترک اُن سے سالونکا ہے اب تو سالونکا تو ہم کو

نظم شدہ شدہ دلّی کے ایک ہفتہ وار کو ہاتھ لگ گئی، اور اُس نے اپنے یہاں چھاپ بھی دیا۔ حضرت اکبر کو خبر ہوئی، بہت بگڑے، جز بز ہوتے۔ اس خاکسار نے عرض کیا کہ آتنی ناخوشی کیوں؟ جس لفظ کو آپ آتنا کریہہ خیال فرما رہے ہیں، اس میں آپ نے کراہت اور اُس کی رشتہ داری حیثیت باقی ہی کب رہنے دی ہے؟ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں تو آپ نے خود ہی رشتہ کا اعلان کر کے دُنیا کو خوب جتا دیا ہے۔ اب وہ رشتہ کا مستقل نام ہو گیا ہے، اب گالی کہاں باقی رہا؟

سیاسیات

سیاسیات سے براہِ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ آن کا یہ فن، نہ اس موضوع سے انہیں کوئی خاص مناسبت، لیکن تھے پورے مشرقی، اور مشرقی سے بھی بڑھ کر پختہ مذہبی۔ اور دل و دماغ نہایت درجہ حساس، اس لئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے، اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے دیکھتے تو قدرتاً یہ بات اُن کے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خارزارِ سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کر کے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا، اور آخری حصہ تو خاصے اعلےٰ عہدوں پر۔ اس کے بعد بھی پنشن کے طوق سے گرانبار، اور خطاب خاں بہادری کی زنجیر طلائی سے پابجولاں اس لئے زبان پر آخر وقت تک مصلحت اندیشیوں کی مُہر لگی رہی، اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی نہ کرسکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے اور اُوپر شکر کا غلاف اس قدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولیاں اُتارتا اور اُدھر زبان ہے کہ فرطِ حلاوت و شیرینی سے ہونٹ چاٹتی رہتی ۔ ۱۹۲۱ء میں تحریکِ خلافت و تحریکِ ترکِ موالات دونوں کا ہیجان اپنے پورے شباب پر تھا، وفات سے چند ماہ، بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے کہہ ڈالا اس میں خلافت و ترکِ موالات کی تحریکوں کے تمام پہلوؤں کے متعلق ہر فریق کے خیالات کی ترجمانی کی ہے افسوس ہے کہ ایسی پُر لطف نظم نہ مرحوم کے زمانہ میں شائع ہوئی، نہ اب اس کے بعد ہی، جب شاعر اور خود ان تحریکات کو بھی ختم ہوئے اتنا عرصہ ہوچکا ہے اور اب اس نظم میں ظاہر ہے کہ کوئی زندہ لطف بھی باقی نہیں رہ سکتا زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے جب تک وہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں، ہاں تاریخی لطف البتہ

بالکل دوسری چیز ہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل، جب آخری بار الہ آباد میں حاضر خدمت ہوا ہوں، چند شعر زبان مبارک سے سُننے میں آئے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں نقل لینے کی اجازت تو اس وقت کیا ملتی ہے؟ خود میری ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی، کلیات سوم میں سیاسی اشارے کنائے، رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں پچاسوں سیکڑوں جگہ ملیں گی۔ کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے چنانچہ جب نظر بندیوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام سب نظر بند ہو چکے تھے۔ ذیل کی بلیغ و پُرمعنی غزل ارشاد ہوئی ہے

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند — مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
ہماری بے کسی کب تک چھپے گی! — خدا پر تو نہیں راہ خبر بند!
بیاد رنج یاران نظر بند — کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں درد ہی کی کچھ کمی ہے — نہیں ہے آہ پر راہ اثر بند
محبت مشرق نہیں محتاج ساماں — کمر ہی جب نہیں، کیا کمر بند!
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا — کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیال چشم فستاں میں ہوا محو — مرا دل اب ہے سینہ میں نظر بند

لیکن اظہار خیال کی یہ صورت بس خال ہی خال ہے، عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح و ترقی کی کوئی خاص اصل بیان تحریر کرتے ہیں یا اسباب تنزل میں کسی متعین سبب کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ یا موجودہ صورت حال سے مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور یا پھر حریف کے کسی زبردست وار کو رد کرتے ہیں۔ تحریری سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گذار ہے، سب کو معلوم ہے۔ بڑے بڑے محتاط مسافروں اور بڑے بڑے ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہے، تو اپنے تیئں زخموں سے چُور اور جراحتوں سے فگار ہی پایا ہے۔ لیکن اس پیمبر سخن کا

اعجاز یہ تھا کہ اس کے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا۔ سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہو گئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزور شمشیر کی۔ ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے۔ لیکن اب توپ پر بھی کبھی نظر کی ہے؟ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی تو کی، توحید و رسالت ہی کے لئے تو کی۔ گردنیں اس لئے ماریں کہ دوزخ کے دائمی عذاب سے بچائیں، جنت کی دائمی راہ دکھائیں۔ مے فروشی، سود خواری، بے حجابی، حرامکاری، زرپرستی، زن پرستی کی اشاعت کے لئے تو نہیں کی۔ توپ دم قوموں کی قوموں کو، قبیلوں کے قبیلوں کو اس لئے تو نہیں کر دیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، اُن کی جائیدادوں پر، اُن کی دولت پر کر لیا اور ان کی جانوں کو، اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں! سارے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے — غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام — یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور و ناتواں قوموں کی قوت مقاومت توڑنے، اور ان کے جسموں کو ہلاک کرنے کے لئے تو، توپ گولہ، بندوق، مشین گن، استعمال ہوتی ہیں، پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما، انہیں بدبختوں کے دلوں اور دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیمگاہیں کھول دی جاتی ہیں۔ غرض کمزور اقوام کے مقابلہ میں، صاحبؑ کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی اُن کی روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ اس خشک حقیقت کو کس خوش زبانی سے بیان کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے — جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری اصلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لے لےکر جس قدر بھی کارگذاریاں ہمارے یہ "خداوند" کرتے رہتے ہیں، ہمارے لئے درسگاہیں کھولتے ہیں عدالتیں قائم کرتے ہیں معیشت میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں، ان سب کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں ؎

وہ اس کو محو کلیسا بنا کے چھوڑیں گے — اس اونٹ کو خر عیسےٰ بنا کے چھوڑیں گے

کریں گے شوق سے مسلم، غذا میں تم داخل — شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

کہا یہ شیخ نے اکبر سے روک اپنی زباں — کہ تجھ کو بھی وہ مجھی سا بنا کے چھوڑیں گے

"اونٹ" اور "خر عیسےٰ" اکبر کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں "مسلمان" اور "صاحب" کے لئے "اونٹ اور گائے" کا ذکر بھی بڑی کثرت سے آتا ہے، مسلمان اور ہندو کے لئے خر عیسےٰ کے بجائے کہیں کہیں "جان بل" بھی استعمال کیا ہے اور کہیں "بندر" بھی۔

اکبر کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصول قوت تھا، اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں، سیاسیات نام ہے توازن قوت کا، جو قوم جس قدر قوی ہوگی، اسی قدر دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہوگی طاقتور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی، اور کمزور کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑے گا۔ تحصیل قوت کی بار بار تعلیم دیتے ہیں، مثلاً ؎

مذہب سوسائٹی ہے اور دین آخرت ہے — پولٹیکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت ہے

صحیح طریقۂ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے۔ نہ یہ کہ شکوہ و شکایات یا خوشامد و تملق میں وقت ضائع کیا جائے ؎

نہایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مردہ — مناسب داد دینا ہے مجھے یارب کہ رونا ہے

لہٰذا آج مناسب یہ ہے کہ جیسا اپنا ثابت کر   خوشامد یا شکایت دونوں ہی ہیں وقت کھونا ہے

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بننا لاحاصل ہے۔ یہاں ہاتھ بن کر رہنا چاہیئے ؎

زورِ بازو ہی نہیں تو کیا اسپیچ   ہاتھ بھی دے خدا زباں کے ساتھ

ترک ہوں خواہ عرب[1]، اسلام کے اقتدار دنیوی کے محافظ وہی ہو سکتے ہیں، جن کی تلواریں دم موجود رہے ہے ؎

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ   کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زورِ بازو ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل، اور وہ بھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں، تاہم کم از کم اس محدود دائرہ کے اندر تو وہ اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں ؎

گو رہتے ہیں ممبری فانی پر شاد   لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر شاد

کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی   غافل ہیں مکرمی بھوانی پرشاد

جب تک قوت ہاتھ میں نہیں، زبانی چیخ و پکار، شور و غل، تقریر و محفل طرازی سب بیکار ہے۔ پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہئے۔ مگر کیا اتنے سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی؟

رزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب   پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

اس وقت صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جو تذبذب، کشمکش و دو دلی میں مبتلا ہیں۔ باقی قومیں یا تو حکمران قوت میں جذب ہو گئی ہیں، اور یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہیں۔ اس حقیقت کو کس

---

[1] ترک اس وقت تک محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا۔

اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ؂

شیخ صاحب تو ادھر فکرِ مساوات میں ہیں ‌ ‌ ‌ بھائی صاحب کو شنا ہے کہ حوالات میں ہیں[1]

قوم کے حق میں تو انجمن کے سوا کچھ بھی نہیں ‌ ‌ ‌ صرف آمد کے مزے اُن کی ملاقات میں ہیں

سربسجدہ ہے کوئی، اور کوئی تیغ بکف ‌ ‌ ‌ اکثر میں اس رزولیوشن کے خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خودخفیفی و کمزوری کی دلیل ہے، اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کرسکتے ہیں، جن کا مادہ خودداری پہلے سے رخصت ہوچکا ہے ؂

کونسل میں سوال کرنے لگے ‌ ‌ ‌ قومی طاقت نے جب جواب دیا

اس سوال وجواب کا پورا لطف جب ہے، جب یہ یاد رہے کہ "سوال کرنا" اُردو محاورہ میا خیرات مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شئے کو ہم اپنی ترقی سمجھ رہے ہیں، یہ سب انہیں کی ترقی ہے۔ ہم خوش ہوتے کہ ہم نے اپنی آپ نئی بہ نیر کرشنی نبالی وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک نیا سانچہ تیار ہوگیا۔ ہم تالیاں بجا رہے ہیں کہ اب تو گزر تری تک ہمیں ملنے لگی، جبکہ صیاد اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ نادان چڑیا کیسی جلد اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہوگئی بس اتنا ہی ہوا نہ کہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی دینی پڑیں! اس صورتِ حال کی تصویر کتنی موثر اور سچی ان اکبر کے مرقع میں ملے گی ؂

اُنہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زباں میری ہے بات اُن کی

اُنہیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی

فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے اُنہیں کا مطلب نکل رہا ہے

اُنہیں کا مضمون انہیں کا کاغذ، قلم انہیں کا، دوات اُن کی!

---

[1] حضرت اکبر نے یہ اشتہار ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے بعد موزوں کئے تھے سادنمبر ۱؟ ایک گرامی میں کی تحریر فرمائے تھے تا سوم میں پہلا شعر کسی قدر مختلف ہو کر چھپا ہے۔ یعنی پہلے مصرع میں "بھائی صاحب" ہے اور دوسرے میں شیخ صاحب درج ہے جو متن میں درج کی گئی اور جو مکتوب اکبر کے موافق ہے۔

بت کدہ میں ہماری عزت کیا خاک ہوسکتی ہے۔ جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو قشقہ ہماری پیشانی پر ہے، وہ بھی ہمارا اپنا نہیں، غیروں کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ ہماری بے دست و پائی کا نشان اور کلنک کا ٹیکا ۔۔۔ سید احمد خانی سیاست، وفاداری کی مسلمہ پالیسی جو ملت پر کہنا چاہیئے کہ کرتی۔ ۴۰ سال تک مسلط رہی۔ یہ تمام تر اسی کی تفسیر و تفصیل بیان ہو رہی ہے سہ

عزتِ اکبر نہ مثلِ برہمن در دیر بود!
قشقہ بودش بر جبیں، لیکن ز دستِ غیر بود

اپنی اس بے بسی، بے کسی، بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہ سنیئے۔ نئی اور لطیف، پھڑکتی ہوئی چھدکتی ہوئی۔ اسے کمند ڈال کر گرفت میں لانا حصہ تھا اکبر ہی کی ظرافت کا، ذہانت کا سہ

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں
ہاں یہ جب اترے مداری کو مبارکباد دوں

گویا گوری قوموں کو تو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں جس خطہ میں جس جتن سے بھی چاہیں، قابض ہو جائیں، حکومت قائم کر لیں، اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی کہ حکمرانی و جہانبانی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے۔ لیکن کوئی مشرقی قوم، خصوصاً مسلمان، اگر کہیں ذرا بھی سنبھلنا چاہیں، اپنے پیروں اٹھ کر کھڑے ہونے لگیں، تو انہیں روکیے، تھامیے، ماریئے پیٹئے، نوچئے پھاڑیئے۔ بلگیریا، سرویا، رومانیہ، یونان، اگر بڑھیں، ترقی کریں، تو یہ ان کا حق ہی ہے، انہیں خوب بڑھاوے پر بڑھاوے ملتے رہیں، لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی محض اپنی کمر بھی کسنا چاہیں، تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھے، کہ لو، وہ پین اسلامزم کا ہوا نکل آیا۔ اب مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں۔ حالات و واقعات کی اس رفتار سے واقف تو

اسب اچھ کچھ بھی ہو چکا ہے۔ لسان العصر بھی اس حقیقت کو اپنی زبان میں دہراتے چلے ہیں،
لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں ظرافت کے کھلونے لئے ہوئے ہیں، انہیں زور زور سے اچھالتے
جاتے ہیں، اور زیر لب مرثیہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں اور زیر لب
آواز ہے کہ کسی کے کان میں آتی ہے اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے اُن کی
اگر "بندر" کی بن آئے تو فیضِ ارتقا۔ کہیئے

کہا جاتا ہے، کہلایا جاتا ہے، کہ عہد حاضر کی برکتیں دیکھو خدا کی رحمتوں کی طرح شمار و حساب
سے باہر، اسکول ہیں، کالج ہیں، ریل ہے، تار ہے، اسپتال ہیں، امن و امان ہے، وغیرہا ـــ
عندلیب گلشن حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری "برکتیں" برکتیں مان بھی لی جائیں جب بھی بلبل
تو ملدادہ اپنی قوت پرواز کا ہے، اُسے صیاد کا سجا سجایا، رنگین پُر تکلف قفس درکار نہیں ؎

کہا صیاد نے بلبل سے، کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اُس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی
نشاط طبع کی مہلک، اگر بیکاریِ پر ہے

مسلمانوں کے لئے یہی قہر الٰہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی
کھو چکا تھا، ستم پر ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے ہوئے "آپ" بل گئے۔ اونٹ راستہ تو بھول ہی چکا
تھا، لیکن شاید کہ بھٹکتے بھٹکتے منزل مقصود تک کبھی پہنچ ہی جاتا۔ لیکن اب اس کا کیا علاج کہ
زمین پر ٹپکتی ہوئی نکیل بندر کے ہاتھ آگئی اور وہ اُچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اب خدا
ہی ہے جو کبھی بھی اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکے! زبانی خاطر داریوں میں لفظی واہ واہ میں اب بھی

کمی نہیں، لیکن یہ مجال کس کی جو مساوات کا کلمۂ کفر زبان پر لا سکے ؎

گم کی تھی میں نے راہ، مصیبت یہی تھی سخت — اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے
باتیں بھی مجھ سے کیں، مری خاطر بھی کی بہت — لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے
کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت — دو چار برگ خشک تو دو چار پر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشۂ چشم بھی ہمارے لئے طرۂ افتخار۔ "صاحب" کا ادنیٰ سا التفات بھی ہمارے لئے موجب ناز۔ فرنگیت سے شرمانا کیسا، وہ تو الٹی ہمارے خون میں رچ گئی ہے، روح میں بس گئی ہے ؎

ان کو لبکٹ کے لئے سوجی کی ٹھیلی مل گئی
کمپ میں غل مچ گیا، مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

بیمار ہم پڑیں، تو علاج سرکاری شفاخانوں میں کرائیں نیچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کرایا ہوا پڑھیں۔ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں، مدد سرکاری پولیس کی لائیں جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و اسناد سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ پیٹ خالی ہو، بھوک لگے، تو روٹی کا سوال وہی سرکاری محکموں سے حل کریں۔ غرض سرکار دولت مدار کا دامن عاطفت جو آغوش مادر سے بھی بڑھ کر وسیع ہو گیا ہے، اور ہمیں ہماری زندگی کے ہر ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے، ہماری خودی سے دور کرتا جا رہا ہے۔ آخر اس صورتِ حال کا اثر ملت کی سیرت پر کیا پڑے گا اور کیا پڑ رہا ہے؟ یہ سوال اکثر زبانوں پر ہے، جواب آیئے اکبر کے جام جہاں نما میں دیکھیں ؎

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج — بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید
ہر گام پر، جو طاعتِ حق سے الگ پڑا — ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید

اں اختشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب ۔۔۔ ہو جاؤ گے بتانِ کلیسا کے تم مرید

شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے نفس یہی ۔۔۔ ہر چند ابھی ہے قدس کے پردہ میں پلید

حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خنزیر نے پڑھا ۔۔۔ حافظ کا ایک شعر، جو مئی کو تھا مفید

"سِرّ ازل کہ عارف سالک بکس نہ گفت ۔۔۔ در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید"

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستاران وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے، اور ظاہری خاطرداری کے عقب میں خلوص اور قدر کتنی رہتا ہے، اس کی توضیح و تشریح سے تو خشک نثر میں اخبارات کے کالم روز ہی لبریز رہتے ہیں۔ اکبر کی قادرالکلامی نے اس سارے دفتر کو بس ایک مصرعہ میں سمیٹ لیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مثل بولی بہت دفعہ جاتی ہے، صحیح تر مثال اس کی مشکل ہی سے ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھا اے واعظ طریقت ۔۔۔ دنیا کے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق

اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو ۔۔۔ انگریز کو ہے ہندو سے جس قدر تعلق

سیکڑوں پُرجوش اخباری مضامین، سینکڑوں شعلہ بار سیاسی تقریریں، ان چار مصرعوں کی بلاغت جامعیت، نکتہ وری پہ قربان ہیں!

بیرونیوں اور بدیسیوں کی کفش برادری سے آزادیوں کی غلامی، چاہے وہ اپنے کوئی بھی ہوں، بہرحال وصورت بہتر ہے، اس خیال کو ذرا دیکھئے کس مزے سے ادا کیا ؎

دھن دیس کی تھی جس میں گاما تھا اک داتی

لنکٹ سے ہے ملائم، پورزی ہو یا چپاتی

"دیس" کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں، باقی دیس ایک راگنی کا بھی نام ہے۔ گانا، دھن، دیس، اب سب اکٹھے ہو گئے۔ لنکٹ کا اشارہ صاحب کے بسکٹ کی طرف، پورزی کا ھندو کی رسوئی کی

طرف، اور چھپانی کا مسلمان کے باورچی خانہ کی طرف بالکل کھلا ہوا ہے۔

ہندیوں کی باہمی ناچاقی، ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ شاہ صاحب اُبھی اس رمز سے خوب آگاہ ہیں، جب کبھی اس آگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو کبھی بندش، ذبح گاؤ کا شغلہ چھوڑ دیا، کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قضیہ لے بیٹھے۔ مسجد کے آگے باجہ کا سوال چھیڑ دیا، اور اب تو نہیں، لیکن کچھ روز قبل تک ایک بڑا ہوا "حملۂ افغانستان" کا بنا کر پیش کر دیا۔ اکبر کی نگاہِ دور رس نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے۔ زبان کے معاملہ میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کے لئے تیار نہ ہو گا، اتحاد وطنی کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی سادہ مزاجی، کم فہمی و نادانی پر تاسف و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

کہتا ہے مجھ کو جو کچھ سُننے گا اس صدی میں | پوچھا کہ اس صدی میں کیوں چپ رہو گے جی میں
بولے کہ یہ صدی ہے ان بحث اور بیاں میں | کہتا ہے جو، کہیں ہم وہ کون سی زباں میں
سُنکر یہ بات ان سے ہر اک کو آیا چکر | ایک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہہ کر
پیرِ فلک نے کیونکر ا ابواب بحث کھولے | جیتے رہیں گرو جی، زندہ رہیں یہ بھولے

غیر ملکی حکومت کی بدگمانیاں اور سخت گیریاں، خدا کی پناہ! بات بات پر شبہ، بے بات کی بات پر گرفت۔ خود غزلیہ اور عاشقانہ شاعری کے اندر بھی غدر، بغاوت، و قانون شکنی کے جراثیم سرکاری خوردبین میں عیاں۔ اس دارو گیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر، شاعر کے نگارخانہ میں ملاحظہ ہو ؎

اک غزل میں اتفاقاً میرا ایک مصرع یہ تھا | دیدۂ عبرت سے رنگِ دیر فانی دیکھیے
کوئی بول اٹھا، زوالِ حسنِ بت مقصود ہے | اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھیے
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے | بزمِ دنیا میں یہ زور بدگمانی دیکھیے

اکبر کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی جنگِ عظیم شروع ہوئی ہے۔ تو یاد ہوگا کہ بالکل ابتدا میں اعلانِ جنگ صرف آسٹریا اور سرویا کے درمیان ہوا تھا۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا۔ اکبر نے معاً ایک نظم کہی، ایک مصرعہ یہ تھا ع

بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلہ میں گولی چلنے اور مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ تازہ تھا۔ ''خونِ شہیداں'' کی تلمیح اس جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لئے گئے۔ اکبر صاحب بھی نرے شاعر تھے اکر ئی وار وزنداں کے مردِ میدان تو تھے نہیں۔ اعلان کر دیا کہ بہت اچھا، آئندہ شعر گوئی ہی سے توبہ، نہ معلوم کس وقت کیا نکل جائے، اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں۔ لیکن رندِ قدح خوار کی طرح شاعر کی توبہ ہی کیا، اور کے دن کی! توبہ کیجیے! خیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی۔ لیکن تخلیہ کی مجلسوں میں، ناصح و محتسب کی دسترس سے دور، شغل اس وقت بھی جاری ہی رہا، ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سینے اِدھر ایسے کہ سہیں جورِ قنسل بھی
کان اُن کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

حکم اکبر کو ملا ہے کہ نہ لکھو اشعار   خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

جنگِ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں تک خالی نہیں۔ نئی نئی تشبیہیں، میدانِ جنگ سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لاتے۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بن کر
میرا تقویٰ کہاں تک اُن کو روکے بلجیم[1] بن کر

---

[1] پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کا حملہ اتحادیوں پر بلجیم کے راستہ سے ہوا تھا، اور بلجیم بیچارہ پہلی ہی بار دو میں گر گیا تھا

یہ کونسلیں، یہ اسمبلیاں، یہ ووٹ بازیاں، اور الکشن جنگیاں، یہ علامتیں ہیں ہماری ترقی اور آزادی کی! یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے؟ اور ہمارے حق میں مزید پھندے؟ اکبر کے ہاں یہ تعلیم بار بار اور وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا | اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ | اس کو سمجھیں قند مکفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی | سیلف گورنمنٹ کے آگے آئی
پاؤں کا ہوش، اب فکر نہ سر کی | ووٹ کی دُھن میں بن گئے پھرکی

ایک دوسری جگہ ان کی دُور اندیشی، قوم کی غفلت و کوتاہ بینی کی فریاد یوں کر رہی ہے تاسف اور دلسوزی کا رنگ اب اور گہرا ہے ؎

ہاں تو ہے ہوس کا، دستہ ہر پالسی کا | لیکن اُدھر تصور جاتا نہیں کسی کا
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں | ہر سُو اچھل رہے ہیں اور جوڑ ہو رہے ہیں
اس قبلہ و جماعت کا انتشار دیکھو | اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو
لکھے گا کلک حسرت، دنیا کی ہسٹری میں | اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

ایک اور مقام جس کی شاعرانہ دُور بینی اور حقیقت سنجی، اس ظاہر فریب اور اوپر سے خوش نما منظر کو یوں بے نقاب کر رہی ہے ؎

نیٹو ہے نمود کا محتاج | کونسل تو اُن کی جن کا ہے راج
کہتے جاتے ہیں یا الٰہی! | سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں | اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
در اصل نہ دین ہے نہ دنیا | پنجرہ میں پھدک رہی ہے مینا

اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں!   لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

مئی و جون کی گرم گرم لو، اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں۔ قاضی و محتسب کی دھڑ پکڑ کی گرما گرمی دیکھ شاعر غریب کو اپنی خیریت تو اسی میں نظر آتی ہے کہ زبان بند رکھی جائے اور بات کرنے کے لئے انتظار کسی مناسب موسم کا رہے۔ بے فصل اگر بیج ڈال دیا جائے تو پودا ہر گز نہ اُگے گا۔ کہتا ہے کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہے، اسی طرح ایک موقع سکوت و بے تعلقی کا بھی ہوتا ہے، اور آج وہی موقع ہے ۔

گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ لیکن   کس سے کہیئے کوئی مستفسر حالات تو ہو

داستانِ غمِ دل کون کہے، کون سنے   بزم میں موقع اظہار خیالات تو ہو

عدم نشو و نما سے نہ ہو تخم کو بد   وقت بالیدگی تخم و نباتات تو ہو

تینوں شعر سوز و درد کی تصویر ہیں، اور انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو لئے ہوئے۔

پھر کہتا ہے کہ ۔

زمانہ نے مساعدت کی تو کبھی ہماری بھی زبان کھلے گی۔

ورنہ یہ سکوت، سکوتِ اجل سے ہم آغوش ہو رہے گا

ہم اس زمانہ میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے

ہوا ہی بدلی ہوئی ہے، فلک سے کون لڑے

خدا ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے

ابھی تو چپ ہیں، کوئی لاکھ اعتراض جڑے

اگر اٹھے تو علم اپنا گاڑ لیں گے کہیں

جو اٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم، خود ہی گڑے

حق پرستوں کے لئے کھلے ہوئے راستہ تو دو ہی ہیں۔ یا سیدھے اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائیں، اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ؎

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے
اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط ایک جبر ہے

فرماتے ہیں کہ مومن کے لئے فضا یکسر تاریک، ماحول تمام تر ناسازگار، ہر ہوا جو چلتی ہے ناموافق۔ اہلِ ایمان کے لئے اس عالمِ یاس و حسرت میں بھی بھروسہ صرف رحمتِ باری کا، تاریک خانہ میں بھی ایک شعاع امید ؎

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھپک، جب منہ میں زبان جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے
کیا ناز ہو ایسی ساعت پر، افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے، یا کچھ نہ کہے، یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے
قاتل کو بھروسہ قوت کا، اور ہم کو خدا کی رحمت کا
ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا، وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

"صاحب" کا ساتھ دیجئے تو دین رخصت، بے نیازی اختیار کیجئے تو دنیا رخصت ؎

بے گزٹ ہو کے جو چلیئے تو محلہ میں حقیر   با گزٹ ہو کے جو رہیئے تو فرشتوں میں خفیف

"گزٹ" کے لفظ سے بھی اکبر نے خوب کام نکالے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بے سرکاری خلق کے، بغیر سرکاری اعزاز کے، گھر رہیئے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا؟ مادی ترقی، منصب و اعزاز کو ذہن میں رکھیئے تو پھر دین سے ہاتھ دھو رکھیئے۔

اور تو اور، آپ اپنے کو محض مسلمان کہنا اور کہلانا بھی تو مشکل ہو گیا ہے۔ ادھر آپ

نے اعلان اپنے اسلام کا کیا، اُدھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آپ مضحکہ کے ہدف بنکر
بیسے رمسلمان کہلائے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو چارہ بجز اس کے نہیں کہ اپنے کو گجدو کا بندہ،
صاحب زوہ مسلمان کہلاتیے ؎

جو پوچھا مجھ سے دور چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوف قہر یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے، خانساماں ہے

لیکن اس ساری پستی وادبار کے اسباب اکبر کی تشخیص میں خارجی نہیں داخلی ہیں، جن معائب
کے ہم شکار ہو بیٹھے ہیں، یہ خود ہمارے ہی ہاتھوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے
کا ساتھ چھوڑ دیا، اغیار ہم پر دلیر ہو گئے۔ ہم نے اپنے ملّی طور طریقوں کو خیرباد کہا۔ اغیار ہم
کو نگلنے لگے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید ونقالی شروع کی، بیگانوں نے دیکھتے
دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑو جب تک بندھی ہوئی ہے۔ تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ
ہے، ادھر اس کا مٹھا کھلا، اُدھر اس کی ایک ایک سینک ہوا کے ہر معمولی جھونکے کے
رحم وکرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شئے تو صرف قوم وملت میں خودی وخودداری
کا احساس ہے۔ اقبال کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہی ہے۔ لیکن اس کی جھلکیاں اکبر کے
یہاں بھی موجود ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

طریق حکمت وتربیت ہر ایک رنگ میں ہے نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے

نگاہِ غور کرو سوئے ٹرکی و ایران نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویران!

تمہارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے تمہارے جسم میں کیوں دوسرے کی جاں آئے

جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا

جو بات ٹھیک ہے اکتا ہوں میں اسے کھل کر کہ سلطنت نہ سہی، تم رہو تو ہل جل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبالمند نظر آتے ہیں۔ ان کی بھی اقبال مندیاں، خوش بختیاں، کامرانیاں کب تک، کتنے دن کے لئے؟ ایک دن احتساب کا آغاز ان کے لئے بھی آنے والا ہے، جہانِ فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر کبھی کبھی دن بدستوں کے کان تک پہنچا دیتا ہے

مجبور بدلنے جانے پہ یہاں اقبال و حشم کے دور بھی ہیں
یکتائی کا دعویٰ خوب نہیں، اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ نقیب ہندوستان غفلت کے فقیروں کے سامنے آکر صدائے عبرت بلند کرتا ہے ؎

حرج کیا وقعت نہیں میری جو بزمِ غیر میں
غیرتِ مسلم ہے اس کی کس مپرسی تو یہیں
تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ روس[1]
شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دیر میں
آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد
لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو تیر میں

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہو گیا۔ زارِ روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعونِ باسامان، اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا۔

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدودِ انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے ؎

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے، منو یا نہ منو — ساتھ رہنا ہے اس ملک میں اے ہم وطنو
اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد — آسمان تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اس وقت کا ہے جب پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر صلح نامہ مرتب ہو رہا تھا، اور اس کا خاص اہتمام تھا کہ اب کی یورپ کی تنظیم جدید کی جو قبا سیا رہو، اس کا دامن بھی ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے ؎

کورانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ آن کر دیں گی نہیں
نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں جڑ لیں گی نہیں۔

واہ واہ واہ، دوسرا مصرعہ تو اپنی بلاغت، ایجاز و جامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت حاصل کرے۔

آج جنہیں اپنی طاقت و توانائی پر غرّہ ہے، کیا انہوں نے کبھی خیال نہیں کیا، کہ شمع نے دم بھر میں سینکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں، لیکن خود صرصر فنا کے ایک طمانچہ کے مقابلے کی تاب نہ رکھتی۔ ہاتھی نے ایک قدم اٹھاتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا، لیکن قضائے الٰہی کے پیلتن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے تودۂ خاک تھا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو، زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے، لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، روما کے قیصروں کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، اسپارٹا کے ویرانے، مذبوح و مقتول زارِ روس کے جسم کی تڑپ، اور زندہ درگور قیصرِ جرمنی کے دل کی حسرتیں دیں گی۔ اکبر کا مرقع سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دُنیا ہے آج اُن کی رَفل کی زَد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ اجل کی زَد پر

سُنتِ الٰہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینۂ ظلم و جور چشم زدن میں غرق ہو کر ضرور رہتا ہے۔ لیکن شروع میں نہیں، قہر و انتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اسوقت ہیں، جب پہلے خوب مُہلت مِل چکتی ہے اور تمرد و رعونت، خود فراموشی و خدا فراموشی کی کشتی حد سے زیادہ ہی بھاری ہو چکتی ہے۔ اکبر کی ذہانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامانِ مشرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کر رہا ہے، جب تک اس طغیان و تمرد کی کشتی پوری طرح گرانبار نہ ہو چکے گی، غضبِ الٰہی جوش میں نہ آئے گا۔ گویا اس مشغلہ میں دیر تک مصروف رہنا، آنے والے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

ابن تمام سیاسی کشمکش و بین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہونے والی ہیں اُن سے تو اب کسی کو بھی انکار نہیں، البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی؟ صاحبؔ اور صاحب زدوں کا کہنا یہ ہے کہ آخری جیت، ہمت و حوصلہ مندی، باقاعدگی و خوش نظمی "علم" و "روشن خیالی" تہذیب و شائستگی کا رہنا یقینی ہے۔ اکبر کا فیصلہ یہ ہے کہ مشیتِ الٰہی تائید اسی فریق کی کرے گی جو نیکو کار ہے اور حسنِ عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے۔ اور استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظِ خشک میں بھی زندہ دِلی کی ادائیں بھر دی ہیں ؎

شامت آئی سب نے یہ مسلّم ہے
بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی؟
میری جانب اشارہ غالب ہے
یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اُس کی

خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو! کُھل ہی جائے گا، آئی ہے جس کی
اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے بڑھ گئی ہے بہت مری وہ میکی

اہلِ ملک کے لئے اس صورتِ حال کا آخر علاج کیا ہے ؟ جتنی زبانیں، اتنی راتیں، اکبر نے کی تشخیص اور طریقِ علاج سب سے مختلف ہے۔ اور کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا ؟ کس نے اُسے مجبور کیا۔ ؟ کسی نے بھی نہیں، بجز خود اس کی ہوس و طمع کے، اکبر بے نیازی، بے طمعی، بے غرضی کا آئیڈیل (مطمحِ نظر) پیش کرتے سیاسیات کے ساتھ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تصوف کی تعلیم دیئے جاتے ہیں ؎

ہو مجھ پہ جنوں کی چشمِ کرم دل کو یہ طلب اصلا نہ رہی
مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی، اُن کو جو مری پروا نہ رہی
دُنیا کا تردد جب تک تھا، جب تک کہ ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم، رغبت نہ رہی، دُنیا نہ رہی
پہ سچ پوچھئے تو راحت ہی ملی دُنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اُداسی ہے بھی تو آفت تو مگر برپا نہ رہی

تحریکِ ترکِ موالات" جو ان کے زمانہ میں چلی۔ اکبر اس کے متفق ضرور تھے، پھر بھی تحریک کے علمبرداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے۔ کہتے تھے، یہ بھی کوئی جنگ ہے، کہ روٹی نہ ملی، نوکری نہ ملی، تو حکومت سے بگڑ بیٹھے، اور روٹھ کر جھنجھلاہٹ میں لگے غصہ اسی پر اتارنے، مولوی ہوں یا گریجویٹ، جھنجھلاہٹ دونوں کی ایک ہے ؎

نئی روشنی کا ہوا استیل کم حکومت نے اس سے کیا میل کم
اِدھر مولوی کس مپرسی میں تھے نہ آفس میں تھے، اور نہ کرسی پہ تھے

یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جائیے — سیاسی کمیٹی میں پل جائیے !!
ابھی روشنی کا ہے بس یہ ظہور — خدا جانے ظلمت ہے یہ یا کہ نور؟

حضرت اکبر نے شخصاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا، ان کا مطمحِ نظر وطن کے بجائے عاقبت، ملک کے بجائے حقانیت، اور قوم کے بجائے خدا تھا، اس لئے جن مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں، وہ خاموش رہتے، اور اس خاموشی کی تعلیم دوسروں کو بھی دیتے ہیں ؎

آزادی کا شور مبارک — یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر — میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو بے ہوشی زیبا — عاقل کو خاموشی زیبا

اُن کے خیال میں سیاسی، ملکی، ملّی، اجتماعی، ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی۔ طاعت، عبادت، عبدیت۔ مومن کے لئے ابتلا و آزمائش کا وقت آنا لازمی ہے، مومن وہی ہے جو اس آزمائش میں پورا اُترے، اور انتہائے کرب و اضطراب میں بھی نظر شافیٔ مطلق پر رکھے، اس مضمون کو لے کر پوری ایک غزل کہہ ڈالی ؎

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ — مایوس نہ ہو دُعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں — مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقت بے حجابی — تم پیروی حیا کئے جاؤ
امیدِ شفا خدا سے رکھو — کیوں ترک کرو، دوا کئے جاؤ

غلامی و محکومی کا راز صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے سلطنت و حکمت تو مادی حیثیت سے خلافت و نیابتِ الٰہی ہے۔ آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کر لیں تو مادی غلبہ ابھی حاصل کر لیں ؎

قوتِ ایمان سے کہ مد سب کو سمجھاتی ہے

نیکیاں کثرت سے ہوں ، مقلوبیت جاتی ہے ۔

اس حقیقت[1] کا مشاہدہ ، تاسف و حسرت کی نظروں سے کرتے رہتے کہ نام وطنیت و قومیت کا لے لے کر ساری دنیا ، کیا مشرق اور کیا مغرب محض مادی غرض مندیوں کے لئے ایک دوسرے سے معروفِ کارزار ہے ۔ خوفِ خدا ، حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جاتا ہے ۔ اور اسی لئے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہو رہا ہے ۔

دین خدا ہے حق کی تسلی کے واسطے ۔ دنیا اٹھی ہے اپنی تعلی کے واسطے
عارف جو ہیں ، رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ ۔ اللہ ہی ہے ان کی تسلی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج و زوال ، زمانہ کی کوئی نئی چیز نہیں ہے ۔ آج اس قوم کا طبل اقبال بج رہا ہے ۔ دولت کا تاج آج ایک قوم کے سر پر ہے ، کل دوسری کے ، یہ مد و جزر زمانہ کے سمندر میں ہر وقت ، اور ہر آن لگا رہتا ہے ، ترک اگر اس وقت حکومت سے بے دخل کئے جا رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ۔ ماتم انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صبر و عزم ، غیرت و خودداری ، صدق و ثبات ، ہم سے رخصت ہو رہا ہے ، اور ہم روز بروز بجائے توفیق الٰہی اور قوتِ ذاتی پر اعتماد کرنے کے

---

[1] جس عہد کے کلام پر یہ گفتگو چل رہی ہے ، ترک اس وقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے سب سے بڑے اور زبردست نمائندہ تھے ۔ سلطان المعظم ہر وقت تک خلیفۃ المسلمین تھے ، اور خادم الحرمین الشریفین ۔ ترکوں کو جنگِ عظیم اول میں جو شکست ہوئی (۱۹۱۸ء میں) یہ محض ایک سلطنت یا جغرافی اقلیم کی شکست نہ تھی ۔ عالم اسلامی اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضرب کاری سمجھا ، ہندوستان میں جو عظیم الشان و بے نظیر تحریک ، تحریک خلافت کے نام سے قائم ہوئی ، وہ اسی احساس کا نتیجہ تھی ۔

دوسروں کے محتاج و دستِ نگر ہو جاتے ہیں، حسرت ہماری اس قلبِ ماہیت پر توجہ کرنی - اور
عبرت آنسو بہانی ہے ؎

انتظامی بات ہے یہ، ہوتی رہتی ہے یونہی اس کا کیا شکوہ جو ہم پر اس کو غالب کر دیا
ہاں یہ ہے افسوس، ہم سے چھن گیا صبر و قرار طالبِ حق کو فلک نے اس کا طالب کر دیا

اسوقت دنیا صرف "صاحب" ہی پر ٹھوس سے ہی مسلط ہے، ہماری ساری جد و جہد کا مرکز بھی تو دنیا
اور محض دنیا رہ گئی ہے - اس سے آگے کی دوڑ ہی نہیں رخصت، فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ
ہم سے سر رشتۂ صبر بہر حال نہ چھوٹنے پائے ؎

ارماں بہ قدرِ طاقتِ ہر سو نکل رہے ہیں "صاحب" توا ڑ رہے ہیں اور ہم اُچھل رہے ہیں
غصہ میں ہیں ہم اُن پر، وہ ہم پہ ہنس رہے ہیں دامِ فریبِ دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہیے یہ طاقت سے منہ نہ موڑیں وہ اپنا جبر چھوڑیں، ہم صبر کو نہ چھوڑیں

تحریکِ ترکِ موالات کو درجۂ قبول صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب اس ضابطہ کی پہلی دفعہ
کلمۂ عبودیت ہو نہ یہ کہ اس کی بنا خود بینی پر ہو کہ یہ نوعین البلیسیت[1] ہوتی ہے

---

[1] جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا (آہ کہ وہی آخری ملاقات تھی) میرے اوپر نشہ تحریکِ خلافت
و ترکِ موالات کا سوار تھا - "مہاتما" گاندھی کی روحانیت اور تقدس کی تعظیم و احترام میں سرشار تھا - بات بات
پر انکی بزرگی اور حیثیت کا حوالہ، دل میں اس کی آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی یہ جادو چل جاتے، دو چار منٹ تو
صبر کیا، اس کے بعد ایک بار گی پوچھ بیٹھے "اچھا صاحب آپ تو گاندھی جی کی روحانیت کے بڑے قائل ہیں
اپنی اس کمیٹی میں داخلہ کی پہلی شرط انہوں نے لا الٰہ الا اللہ تو ضرور ہی رکھی ہو گی؟ ــــــ بس ساری
چوکڑی بھول گیا - مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ جی نہیں، ایسا تو نہیں - بولے "بس تو سمجھے تھا آگے
کچھ پوچھنا نہیں، ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آج کل ہیں"

تو اب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم
کہ دل کو طاعتِ حق سے یہ دُور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خللِ انداز
ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی، ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو تحریک ترکِ موالات سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت "خانگی" اتنی ہے کہ کسی نامحرم کی زبان تک ادا ہونے کے لائق نہیں، بہتر ہوگا کہ اسے خود انہیں کی زبان سے سُنیئے

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا :
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سنا کر بولے کہ "یہ بھی آپ سمجھے، میں نے اپنے کو مدخولۂ گورنمنٹ کیوں کہا ؟ پنشن پاتا ہوں نا ! ملازمت میں ہوتا، تنخواہ پاتا ہوتا، تو مدخولہ نہیں منکوحہ کہتا"

(ج) عشق و تغزل

اکبر کی شہرتِ عام، غزل گو کی حیثیت سے نہیں، تاہم کلیاتِ اوّل و دوم میں اُن کی متعدد غزلیں ایسی اچھی موجود ہیں، ایسی کہ انہیں بلا تأمل اُستادانِ غزل اردو کے پہلو میں رکھا جا سکتا ہے۔ کلیاتِ اوّل کا سالِ طبع ۱۹۰۶ء ہے، اس میں حضرت اکبر نے خود اپنی غزل گوئی کے تین دور قائم کئے ہیں۔ سلسلۂ بیان کے لئے ان میں سے ہر دور کے نمونہ کلام پر ایک سرسری نظر کرتے چلئے۔
پہلا دور تا ۱۸۶۶ء اکبر کا سالِ ولادت ۱۸۴۶ء ہے۔ گویا یہ دور ان کی شاعری کے بچپن کا تھا۔ شاعر کا سن بیس سال کے اندر تھا۔ یہ سن بھی کوئی سن ہے۔ اپنے اور اپنی

شاعری دونوں کے اُن لڑکپن میں وہ عام غزل گویوں کے بالکل ہم نوا ہیں، تاہم برجستگی، شوخی روانیِ طبع و لطفِ زبان کے جوہر جو آگے چل کر اس آب و تاب سے چمکے، اُس وقت بھی مخفی وغیرہ نمایاں نہیں، اور رعایتِ لفظی، لکھنؤ کے رنگ کی بھی خاصی موجود ہے۔ اشعار ذیل کے پڑھتے وقت یہ خوب یاد رہے کہ زمانہ ۱۸۰۱۶ء اور اس سے قبل کا ہے، اودھ میں انگریزی نئی نئی قائم ہوئی ہے۔ نوابی کو گئے ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں، اودھ و مضافات اودھ میں زندگی کے ہر شعبہ میں، خصوصاً شعر و ادب میں تو ابھی لکھنؤ کی خوبو پوری طرح باقی ہے بلکہ وہی مذاق ابھی تک حاکم ہے ؎

بے تکلف بوسۂ زلفِ چلیپا لیجیے — نقدِ دل موجود ہے پھر کیوں نہ سودا لیجیے
دل تو پہلے لے چکے، اب جان کے خواہاں ہیں آپ — اس میں بھی مجھ کو نہیں انکار اچھا لیجیے
پاؤں پڑ کر کہتی ہے زنجیرِ زنداں میں رہو — وحشتِ دل کا ہے ایما، راہِ صحرا لیجیے

سنتا ہوں چمن میں جو تری زمزمہ سنجی — "یاد آتی ہے بلبل، مجھے تقریر کسی کی"
دوسرا مصرعہ غالباً طرحی ہے۔

پھر گئی آپ کی دو دن کی طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب، یہ مروت کیسی
کوچۂ یار میں جاتا تو نظارہ کرتا — قیس آوارہ ہے جنگل میں، یہ وحشت کیسی

جذبۂ دل نے میرے تاثیر دکھلائی تو ہے
گھنگھروؤں کی جانب در، کچھ صدا آئی تو ہے

عشق کے اظہار میں ہرچند رسوائی تو ہے
پر کروں کیا، اب طبیعت آپ پر آئی تو ہے

آپ کے سر کی قسم، میرے سوا کوئی نہیں
بے تکلف آیئے، کمرہ میں تنہائی تو ہے

دوسرا دور ۱۸۶۶ء تا ۱۸۸۴ء۔ رندی و ہوسناکی کے مضامین اس دور میں بھی باقی ہیں، تاہم جذبات نگاری کی بنیاد پڑ چکی ہے، رنگ تغزل کہیں زیادہ نکھر گیا ہے اور لطفِ زبان و حسن بیان کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

آج آرایشِ گیسوئے دوتا ہوتی ہے — پھر مری جان گرفتارِ بلا ہوتی ہے
شوقِ پابوسیٔ جاناں مجھے باقی ہے ہنوز — گھاس جو اگتی ہے تربت پہ حنا ہوتی ہے
پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انساں — سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے
جس نے دیکھی ہو وہ چتون، کوئی اس سے پوچھے — جان کیونکر ہدفِ تیرِ قضا ہوتی ہے
ہوں فسردہ سببِ ستم یار کا قائل اکبر — مر کے مرنے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اسی زمین میں ایک مشہور و مقبول غزل مرزا لکھنوی کی ہے۔ اکبر کی غزل اس کے ٹکر کی ہے۔

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا — آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا
جلوہ نہ ہو معنی کا، تو صورت کا اثر کیا — بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا
ہیں نزع میں ہم، آئیں تو احسان ہے ان کا — لیکن وہ یہ سمجھیں کہ تماشا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

دوسرے شعر میں اکبری معنویت پوری طرح جلوہ گر ہے، اور چوتھا شعر تو گویا اب ضرب المثل کی حیثیت

اختیار کر چکا ہے۔

یار نے کچھ خبر نہ لی، دل نے جگر نے کیا کیا
نالۂ شب سے کیا ہوا، آہ سحر نے کیا کیا
کھل گیا سب پہ حالِ دل، ہنستے ہیں دوست برملا
ضبط کیا نہ رازِ عشق، دیدۂ تر نے کیا کیا

دورِ سوم ۔ ۱۸۸۵ء ، ۱۹۰۸ء ، اس دور کا کلام ، رنگِ تغزل میں پختگی کا نمونہ ہے طرز ادا میں سنجیدگی بڑھ گئی ہے ۔ مضمون آفرینی پر توجہ زیادہ ہو گئی ہے ۔ غزل میں اخلاقی و رُوحانی مضامین کی آمد بے تکلفانہ شروع ہو گئی ہے ۔ ظرافت کا چٹخارہ بھی جا بجا موجود ہونے لگا ہے ۔ پھر بھی تغزل کا جو رنگ مسلم و مستند اور ثقہ اُستادوں کے درمیان متعارف ہے اُس سے مجال نہیں کوئی مصرعہ الگ جا پڑے ۔ ملاحظہ ہو ؎

دِل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا ۔۔۔ بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزمِ یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس ۔۔۔ ایک سر بھی اُسے آمادۂ سودا نہ ملا
گُل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش ۔۔۔ طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر ۔۔۔ مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی مجھ سا نہ ملا

دِل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی ۔۔۔ درد کے ساتھ ہی ساتھ اُسکی دوا بھی آئی
آئے کھوئے ہوئے بالوں کو تو شوخی سے کہا ۔۔۔ میں بھی آیا ترے گھر میری بلا بھی آئی

وائے قسمت کہ میرے کُفر کی قسمت ہنر آئی ، جب کہ دیکھا تو مجھے یادِ خدا بھی آئی
ہو گئیں آغازِ جوانی میں نگاہیں نیچی ، نشہ آنکھوں میں جو آیا تو حیا بھی آئی

غنچۂ دل کو نسیمِ عشق نے وا کر دیا ، میں مریضِ ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا
شانِ محبوبی صانع کا نشاں رکھا ہے یہ ، ورنہ کیا تھا جس نے دل میں درد پیدا کر دیا
کیا مرے بابک دل از کشش کرنے پہ وہ قادر نہیں ، ایک گُن سے دو جہاں کو جس نے پیدا کر دیا
سب کے سب باہر ہوئے، ہوش و خرد، وہم و تمیز ، خانۂ دل میں تم آئے ہم نے پردہ کر دیا
شاہدِ بزمِ ازل نے اک نگاہِ ناز سے ، عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا
شورِ شیریں کا مزہ رکھا اسیرِ فرہاد میں ، قیس کو دیوانۂ اندازِ لیلیٰ کر دیا
گردنِ پروانہ میں ڈالی کمندِ شوقِ شمع ، رنگِ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

جس نے یہ سب کچھ کیا اکبرؔ میں تم سے کیا کہوں
اس نے مجھ کو کیا کیا ، دل کو مرے کیا کر دیا

وہ حجاب اُن کا آج تک نہ گیا ، نہ گیا اُن کے دل سے شک نہ گیا
اک جھلک اُن کی دیکھ لی تھی کبھی ، وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

سینہ کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا ، اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا
اے سنم کیسے کہ مرا قلب ہل گیا ، اور اس طرح کہ سینہ کا ہر داغ چھل گیا
تیرا پتہ چمن کو صبا سے جو مل گیا ، بلبل کو وجد آ گیا غنچہ بھی کھل گیا

خوش قسمتی پہ اپنی بجا ہے کروں جو ناز
اپنے ہی دل میں مجھ کو مرا رب مل گیا

الجھا نہ میرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے سر طول امل سے

ان کی نگہ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

ادراک نے آنکھیں شب اوہام میں کھولیں
واقف نہ ہوا روشنی صبح ازل سے

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے[1]

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ
ہیبت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے

درجہ متحیر کا ہے، بے خود سے فروتر
ہے روح کی امید ترقی کی اجل سے

بحث کہن و نو میں سمجھتا نہیں اکبر
جو ذرہ ہے موجود ہے وہ روز ازل سے

یہ تین دور تو خود حضرت اکبر کے قائم کئے ہوئے تھے، کلیات اول کے زمانہ تک۔ اب اس کے بعد دور چہارم۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک سمجھئے۔ یہ کوئی مستقل دور نہیں، اسے دور سوم کا تکملہ ہی سمجھنا

---

[1] یہ غزل حضرت اکبر نے لکھنؤ میں ایک مشاعرہ میں پڑھی لکھنؤ کے ایک مشہور وکیل منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم، ایک صاحب علم و صاحب دل بزرگ بھی مشاعرہ میں موجود تھے۔ اکبر نے خود یہ روایت مجھ سے بیان فرمائی کہ "جب اس شعر پہ پہنچا، ابھی پہلا ہی مصرعہ زباں سے نکلا۔ کہ آنکھیں منشی صاحب سے چار ہو گئیں۔ منشی صاحب کے تیور پہ بل تھے، کہ قرآن اور خدا سے یہ شوخی کیا معنی۔ میں تاڑ گیا۔ برجستہ عرض کیا کہ مصرعہ ملاحظہ ہو۔ اور پھر دوسرا مصرعہ پڑھا، تو منشی صاحب پھڑک اٹھے، بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔"

چاہیئے۔ دورِ سوم تک کا کلام، کلیاتِ اوّل میں موجود ہے، اس کے بعد کے چار سال کا کلام کلیاتِ دوم میں ہے، بس اسی لئے اس حصّے کے لئے ایک جداگانہ دور قائم کرنا پڑا، سنہ ۱۹۰۸ء تک غزل میں جتنی پختگی آ سکتی تھی، سب آ چکی تھی، شاعر کی عمر اب ۶۰-۶۲ سال کی ہو چکی تھی، اور شمار اب استادوں میں تھا اس کے بعد صنفِ غزل میں کسی جدت کی نہ توقع تھی اور نہ کوئی جدت واقع ہوئی۔ کیفیت وہی قائم رہی، البتہ کمیت کے لحاظ سے پستی ہوا، کہ کلیاتِ اوّل میں بڑا حصّہ غزلوں ہی کا ہے۔ کلیاتِ دوم میں اوّل تو یہ تناسب ہی گھٹ گیا ہے، اور پھر جتنا حصّہ غزلیات کا ہے بھی، اس میں بھی معاملات صرف عشق و محبت ہی کے بندھے ہوئے نہیں، بلکہ مضمون، اخلاق، معاشرت، فلسفہ، ریاست تصوف و معرفت سب ہی کے شامل۔ با ایں ہمہ اس دور کا عاشقانہ حصّہ بھی کسی معیار سے نظرانداز کرنے کے قابل نہیں۔ لطف و کیفیت ہر ہر سطر سے نمایاں۔ پختگی اور خوشگفتگی کے ثبوت ہر ہر صفحہ پر مضمون آفرینی اور استادی کا رنگ ایک ایک شعر سے پھوٹا پڑتا ہے۔ طبیعت کی آمد، جدتِ مضامین کے ساتھ ردیف و قافیہ میں بھی ندرت کی بہار دکھانے لگی ہے ؎

وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا — اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا
اس نے خدا کو مانا، وہ ہو رہا بتوں کا — یا اس نے خوب سمجھا یا اس نے خوب دیکھا

نہ یہ رنگِ طبع ہوتا، نہ یہ دل میں جوش ہوتا — یہ جنون اگر نہ ہوتا، تو کہاں یہ ہوش ہوتا
غمِ دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا — مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا
تمہیں دیکھ حسن کے فطرتی میں نقش کھینچے ورنہ — نہ یہ ہوتی چشمِ نرگس، نہ یہ گل کا گوش ہوتا
دل و دیں سب اس کے صدقے، جو وہ خود نما بنا ہے — کوئی زندہ ہی نہ رہتا جو وہ خود فروش ہوتا
حسن نظامی! اکبر کا کلام سن کے بولے — تجھے میں ولی سمجھتا جو نہ خرقہ پوش ہوتا

بتوں سے میل، خدا پر نظر، یہ خوب کہی — شبِ گناہ و نمازِ سحر، یہ خوب کہی

تمہاری خاطرِ نازک کا ہے خیال فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر، یہ خوب کہی

شباب و بادہ و فکرِ مآل کار، چہ خوش — جنونِ عشق و خیالِ خطر، یہ خوب کہی

سوالِ وصل کروں یا طلب ہو بوسہ کی — وہ کہتے ہیں مری ہر بات پر، یہ خوب کہی

آہ دل سے جو نکالی جائے گی! — کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

یاد اُن کی ہے بہت عزلت پسند — آہ بھی دل سے نکالی جائے گی

نزع کہتی ہے کہ رُوٹھی تجھ سے جاں — حشر کہتا ہے منالی جائے گی

یادِ ابرو میں ہے اکبر محو کیوں — کب تری یہ کج خیالی جائے گی

ایک صوتِ سرمدی ہے جس کا آمنا ہوش ہے

ورنہ ہر ذرّہ ازل سے تا ابد خاموش ہے

آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس

شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحبِ آغوش ہے

حضرتِ منصور کہتے ہیں "انا" بھی حق کے ساتھ

دار تک تکلیف فرمائیں، جب آمنا ہوش ہے

(یہ تیسرا شعر منصورِ حلاج کی پُرشور و معرکۃ الآرا بحث میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے

دوسرا مصرعہ پڑھتے وقت "تکلیفِ شرعی" کی اصطلاح یاد رہے)

شوقِ وصلِ شعلہ رُویاں، کیوں نہ ہو برسات میں — ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے!

رنگِ شراب سے مری نیت بدل گئی — واعظ کی بات رہ گئی، ساقی کی چل گئی
تیار تھا نماز پہ میں سن کے ذکرِ حور — جلوہ بتوں کا دیکھ کے نیت بدل گئی
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے — صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی
چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام — پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی
حسرت بہت ترقیِ دختر کی تھی انہیں — پردہ جو اٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

دورِ پنجم ۱۹۱۴ء (۱۹۱۹ء) سنہ اس دور کا کلام کلیاتِ سوم میں ہے اور وہی اس تبصرہ کا اصل موضوع ہے۔ شاعر کی عمر اب ستر کے لگ بھگ یا ستر سے اوپر ہے۔ اور اب وہ شاعر سے کہیں زیادہ مفکر ہے۔ دل شاہد و شراب، چنگ و رباب کے تذکروں سے اچاٹ ہو چکا ہے۔ آگ معرفت اور عشقِ حقیقی کی بھڑک چکی ہے۔ مزاجی، مجازی، تغزل کا رنگ ہلکا پڑ چکا ہے۔ غزل کہنا بھی اس زمانہ میں بہت کم ہو گیا تھا، عموماً سیاسی اخلاقی، عارفانہ و ظریفانہ نظمیں کہا کرتے تھے۔ عنوان غزلیات کا کلیاتِ سوم میں بھی خاصہ بڑا نظر آتا ہے، لیکن درحقیقت غزلیت کا عنصر ان میں بہت ہی کم ہے۔ عموماً وہ واقعات حاضرہ پر شاعر کے خیالات اور تبصرے ہیں۔ صرف غزل کے سانچے میں انہیں موزوں کر دیا گیا ہے یہ خصوصیت موجود تو کسی قدر اُن کی ابتدائی غزلوں میں بھی ہے، درمیانی کلام میں بڑھ گئی اور آخری زمانہ میں تو یہی خصوصیت، دوسری خصوصیتوں پر چھا گئی اور غالب آگئی۔

کلیاتِ اول کے پہلے ایڈیشن کے شائع ہونے پر ایک ناقد نے اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ :-

- مصنف بہ نسبت شاعر کے بہت زیادہ ایک تفکر (سوچنے والا / صاحبِ فکر) یا فلاسفر

ہے جس نے اپنے خیالات کو خوبی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔"

حضرت اکبر کو یہ رائے بڑی پسند آئی، اسے وہ اپنی حقیقی داد سمجھے، اور واقعہ ہے بھی
نا کہ جوں جوں اُن کی شاعری نکھرتی گئی وہ روز بروز اس خیال کے مصداق صحیح سے صحیح تر ہوتے
گئے۔ مثال کے طور پر کلیات سوم کی دو ایک غزلیں درج ذیل ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ قالب
چہ غزل کا ہے لیکن روح ذرا بھی غزل کی نہیں (غزل اپنے عام عرفی و مقبول معنی ہیں)
سبُو کی شکل پر جائیے تو اب بھی ہر طرف شراب ہی شراب نظر آئے گی، لیکن چکھ کر دیکھیے تو آپ
ہی پکار اُٹھیں گے کہ "استغفر اللہ، شراب یہاں کہاں۔ یہ تو پیالیوں ہیں اخلاق و موعظت
یخنی رکھی ہوئی ہے یا گلاسوں ہیں طریقت و معرفت کا آب طہور چھلک رہا ہے۔ بوتلوں ہیں
قت کی چاشنی سیاسیات کے شربت ہیں شیر و شکر ہوتی نظر آرہی ہے"

ذیل کی غزل کو آپ غزل کہیں گے یا ایک درس تصوف؟ "سخن بازناں گفتن" یہ کسی معنی
ہے؟

نگاہ اُٹھی ہے احساس ماسوا کے لئے
کہاں ہے دل ذرا روکے اسے خدا کے لئے
رواں ہو کار جہاں کیوں ہماری مرضی پر
خدا ہمارے لئے ہے کہ ہم خدا کے لئے
عمل خدا کے لئے ہو تو اس کا کیا کہنا
مگر ریا یہ بُری صرف واہ وا کے لئے

ئے تغزل کے مجنوں دُور سے محمل کو دیکھ شوق سے اس کی طرف لپکتے ہیں، پاس آکر اندر جھانکتے
، تو نہ کوئی عشوہ فروش ہے، نہ کوئی زہرہ جبیں، بلکہ ایک شیخ وقت مع اپنے جُبہ

غزل کی تعریف انہیں الفاظ میں کی گئی ہے۔

ودستار کے تسبیح و تہلیل میں معروف نظر آتے ہیں ؎

خدا کے نام کا ہے احترام عالم میں — نہ صرف آپ میں ہم میں، تمام عالم میں
اسی کا نام نہ کیوں مرکز زباں ہو جائے — کہ اختلاف سے خالی ہر کلام عالم میں
خدا پرست کو کافی ہے مثلِ ابراہیمؑ — زوالِ شمس و قمر صبح و شام عالم میں
یہی مشن تھا جناب رسولؐ اکرم کا — اور آج انہیں کا تو روشن ہے نام عالم میں

ذوق نظر کے شیدائی اچنگ و رباب کے رسیا، دودے باجے گاجے کی آواز سن سنا دوڑتے ہوئے آتے ہیں کہ چلیں اندر سبھا کے ناٹک کا لطف اٹھائیں۔ جلوہ گاہ کا جیب پہ دہ اٹھتا ہے تو سارا وہم و تخیل ہی برباد۔ نہ مطرب ہے، نہ ساز، نہ ساقی ہے نہ انداز، محفل میں بجائے ساز کے سوز ہے، لبوں پہ بجائے واہ کے آہ ہے۔ طبلہ کی تھاپ کی جگہ ضربیں اللہ ہو کی لگ رہی ہیں۔ چہروں پر بجائے ہنسی کی کھلکھلاہٹ کے خشیت الٰہی۔ درمیان میں ایک صاحب حال درویش اپنی آگ سے دوسروں کو گرما رہے ہیں ؎

گو سعی ہوائے شوق نے کی، تو اس کی نہ نکلی محفل سے
مجنوں نے اڑائی خاک بہت، لیلےٰ نے نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں جس شیدائے جمال باری کو!
پروانہ کو مطلب شمع سے ہے، کیا کام ہے رنگ محفل سے
احساس ہی ایذا کا نہ ہوا، اس یاد و فغاں میں کیا کرتا
جس وقت تہ خنجر تھا گلا، آنکھ اپنی لڑی تھی قاتل سے

طبیعت زہد خشک سے اکتا چلی ہو، اور دل میں ظرافت کی گدگدی اٹھ رہی ہو، تو اس

رنگ کو بھی لینے کہیں دور نہیں جاتا ہے۔ ندرت قوافی کے طلسم ساز کے لیے آگ کو برف بنا کر پیش کر دینا کیا مشکل ہے۔ اس رنگ کا کلام بھی غزلوں ہی کے تحت میں موجود ہے ؎

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے — صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جناب قبلہ میں — کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

غرض آخری دور کا جو کلام غزلیات کے زیر عنوان رکھا گیا ہے، اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ بس وہ نام ہی کی غزلیں ہیں۔

بایں ہمہ جب کبھی غزل سرائی پر آئے ہیں، پورے عاشق بن گئے ہیں۔ جو کچھ بھی عاشقانہ رنگ میں کہا ہے خوب کہا ہے۔ اپنے مرتبہ کمال کو اس رنگ میں بھی قائم رکھا ہے، اور درجۂ استادی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ لطف زبان و سلاست بیان، ان کی غزل کی جان ہے۔ دشوار پسندی نے بعض اچھے اچھے غزل گویوں کو غارت کر دیا ہے، اکبر کا گلستان ان کانٹوں سے بالکل پاک ہے، پھر بیان کی لطافت کے ساتھ خیال کی بلندی بھی موجود۔ صورت کے بناؤ سنگار میں اتنا محو نہیں ہوتے کہ سیرت کی تہذیب و شائستگی سے غافل ہو جائیں جانتے ہیں کہ قافلہ میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایسے بھی جو محض محل کی آب و تاب چمک دمک سے جی خوش کر لیں گے۔ ایسے بھی جو محمل نشین کی زیارت کئے بغیر دم نہ لیں گے۔ دونوں طبقات کے دلوں کی مہار یہ ناقہ بان سخن اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔

رسمی شاعروں کے خلاف ایک غزل میں تماشہ گاہ فطرت کا نظارہ کرتے ہیں، اور فطرت کے کھلے ہوئے میدان میں، دن دوپہر وہ مزے حاصل کرتے ہیں، جن کی تلاش رسمی شاعروں کو خدا جانے کہاں کہاں سرگرداں رکھتی ہے۔ اور یہ لطف انہیں خلوت ہی میں نہیں، جلوت میں بھی ہمہ وقت حاصل ہے۔ لیکن پھر آخر جذبات مشرقی شاعر کے رکھتے ہیں، اور اس کو مقطع میں نباہ لیجاتے ہیں۔

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا ۔۔۔ کیا دل کشا یہ سین ہے فصل بہار کا
نازل ہیں جوش حسن پہ گلہائے دلفریب ۔۔۔ جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم ابھار کا
ہیں دیدنی بنفشہ و سنبل کے پیچ و تاب ۔۔۔ نقشہ کھنچا ہوا ہے خط و زلف یار کا
سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے ۔۔۔ شبنم ہے، بحر ہے کہ گہر آب دار کا
مرغان باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں۔ ۔۔۔ اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا
موجِ ہوا سے زمزمۂ عندلیب مست ۔۔۔ اک ساز دل نواز ہے مضراب تار کا
ابر تنک نے رونق موسم بڑھائی ہے ۔۔۔ غازہ بنا ہے روئے عروس بہار کا
افسوس اس سماں میں بھی اکبر اداس ہے ۔۔۔ سوہان روح ہجر ہے اک گلعذار کا

رسمی شاعر بے چارے حقیقت سے بے نیاز، محض الفاظ کی تراش خراش میں لگے رہتے
ان کی شاعری پر، یہ حقیقی شاعر کیسی جنچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ رائے شاعرانہ بھی
صحیح بھی ؎

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں ۔۔۔ وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

ذیل کی غزل میں تغزل کے پامال مضمون کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے، آخری
اس بیت کا ہے کہ کہنے والے کی نجات کے لئے بس کرتا ہے ؎

گھٹتا جاتا ہے مری نظروں میں مقدور مرا ۔۔۔ بڑھتا جاتا ہے شمار ان کے خریداروں کا
بحث میں عفو و سزا کے یہ لڑتے مرتے ہیں ۔۔۔ فیصلہ کر ہی دو اب اپنے گنہگاروں کا
بے خطر پھرتا ہوں بازار جہاں میں ہر سو ۔۔۔ کیسہ خالی ہے تو کیا خوف ہے عیاروں کا

فطرت اٹھی ہے شفاعت کو، ملائک ہیں خموش
حشر ہے عشق و محبت کے گنہگاروں کا!

غزلیہ شاعری کا سب سے زیادہ پامال مضمون عشق ہے۔ ہر سخن گو کا تختۂ مشق یا تکیہ کلام دفتر کے دفتر اس کی شرح میں سیاہ ہو چکے ہیں اور عاشقوں کی تعداد کا تو کوئی شمار و حساب ہی نہیں۔ لیکن کیفیتِ عشق، لفظ و عبارت کی مدد سے کچھ بھی واضح ہو پائی ہے؟ اکبر اس گونگے کے خواب کی مصوری اپنے مرقع میں کرتے ہیں ؎

عشق میں حسنِ بیاں وجہ تسلی نہ ہوا   لفظ چمکا مگر آئینۂ معنی نہ ہوا

اسلوب بیان کی ندرت و بلاغت ملاحظہ ہو۔ شاعر کو دعویٰ اپنی قوتِ گویائی پر ہے، بڑے بڑے پیچیدہ مسئلوں کو وہ باتوں باتوں میں سمجھا دیتا ہے، دقائق کی گتھیاں وہ ایک اشارے میں سلجھا دیتا ہے۔ "حسن بیان" اس ساری داستان کا ترجمان ہے۔ لیکن عاشق ہونے کے بعد اسے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتِ گویائی بیکار ہی گئی۔ الفاظ کا ذخیرہ اب بھی وہی، بیان کا ملکہ اب بھی وہی، قدرتِ زبان وہی، لفظ سجل اور سڈول، تقریر بلیغ و شستہ یہ سارا مفہوم "لفظ چمکا" سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے، لیکن پھر بھی کوئی بات تو ایسی ہے کہ معنی کی توضیح نہیں ہو پاتی۔ کیفیتِ قلب کا عکس دوسروں پر نہیں پڑنے پاتا۔ شیشہ میں آب و تاب، چمک دمک سب موجود۔ لیکن عکس قبول کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے "آئینۂ معنی نہ ہوا" جام بلور میں اس پوری کیفیت کا آئینہ ہے۔ ضمناً یہ پہلو بھی "وجہ تسلی نہ ہوا" سے آ گیا ہے، کہ تسلی کا تعلق زبان و بیان سے نہیں، بلکہ قلب اور اس کے احساس سے ہے۔

اسی زمین میں ایک دوسرا شعر بھی ہے، افسردگی یاس و حرماں نصیبی کی ایک بولتی ہوئی تصویر۔ ایسے کلام کی قدر، چڑھتی جوانی میں نہیں، بڑھاپے کو پہنچ کر ہوتی ہے ؎

دل میں کہتے تھے کہ یہ ہوگا وہ ہوگا لیکن

کٹ گئی عمر امیدوں ہی میں، کچھ بھی نہ ہوا

اکبر کے دورِ آخر کی اکثر غزلوں کی تان، یاس و افسردگی کی آہوں پر آکر ٹوٹتی ہے
دُنیا کی بے ثباتی، اور اس سے اپنی بے تعلقی، لذاتِ دُنیا کی بے حقیقتی یہ موضوع
اکثر غزلوں میں مشترک ہے۔ ذیل کی غزل انہیں جذبات کی ترجمان ہے بعض تشبیہوں کی ندرت
پر لطافت لوٹ لوٹ جاتی ہے ـــــ

دنیا میں ہوں، دنیا کا طلبگار نہیں ہوں — بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
زندہ ہوں مگر زیست کی لذت نہیں باقی — ہر چند کہ ہوں ہوش میں ہشیار نہیں ہوں
اس خانۂ ہستی سے گزر جاؤں گا بے لوث — سایہ ہوں فقط نقش بہ دیوار نہیں ہوں
افسردہ ہوں عبرت سے، دوا کی نہیں حاجت — غم کا مجھے یہ ضعف ہے، بیمار نہیں ہوں
وہ گل ہوں خزاں نے جسے برباد کیا ہے — اُلجھوں کسی دامن سے، میں وہ خار نہیں ہوں
یارب مجھے محفوظ رکھ اُس بت کے ستم سے — میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
گو دعوئی تقوی نہیں درگاہِ خدا میں — بت جس سے ہوں خوش، ایسا گنہگار نہیں ہوں
افسردگی و ضعف کی کچھ حد نہیں اکبر — کافر کے مقابل میں بھی دیندار نہیں ہوں

دُنیا میں رہ کر دُنیا سے بے لوث و بے تعلق رہنے کو بہت سے شاعروں نے باندھا ہے، لیکن
یہاں پہلے اور تیسرے شعر میں حسن لطیف و دلنشیں تشبیہات کی مدد سے یہ مضمون باندھا
گیا ہے وہ اکبر ہی کا حصہ ہیں ضعف کا مضمون بھی پامال ہو چکا ہے، لیکن اکبر چوتھے شعر میں
ایک نیا پہلو یہ نکالتے ہیں کہ غم و افسردگی میں اس قدر لاغر ہوں کہ لوگ مجھے بیمار سمجھتے
ہیں، اور دعا کی فکر میں ہیں۔ چھٹے اور ساتویں شعر میں سیاسی رمز اور کنائے ہیں۔
عشق کا دم بھرنے والے لاکھوں کی تعداد میں ہوں، لیکن واقعی عشق رکھنے والے کہیں
دو چار ہی ملیں گے، آہیں سب کرتے ہیں، لیکن مجنوں کا سوز کسی کی آہ میں نہیں ملتا۔ سوزِ عشق

کی اہلیت بس مخصوص ہی اشخاص میں ہوتی ہے، عام خلقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا، اس مفہوم کو یہ شاعر یوں ادا کرتا ہے ؎

باطن بہت ہیں ایسے جو مشتغل نہیں ہیں،

سینہ میں سب کے دل ہیں، سب اہل دل نہیں ہیں

اس مضمون کو ایک مطلع میں بھی ادا کیا ہے ؎

مقبول جو ہوں شاذ ہیں، قابل تو بہت ہیں

آئینہ کے مانند ہیں کم، دل تو بہت ہیں

"مقبول" و "قابل" کا تقابل بھی کیا خوب ہے!

اسی زمین میں ایک اور شعر بھی ہے اور وہ اسی مضمون سے متعلق ہے ؎

وہ کم ہیں تڑپنے میں جنہیں ملتی ہے لذت

یوں آپ کی شمشیر کے بسمل تو بہت ہیں

تیغ کے بسمل تو ہزار ہا نکل آئیں گے، لیکن اس تڑپ میں لذت پانے والے کتنے نکلیں گے؟ مجاز پر محمول کیجئے یا حقیقت پر، سیاست میں لے جائیے یا معرفت میں۔ بہرحال جس پہلو سے بھی چاہیے اُلٹ پلٹ کرکے اس شعر کو دیکھئے، واقعیت سے خالی کوئی بھی پہلو نہ نکلے گا۔

عاشق خوب جانتا ہے کہ کوئے قاتل میں پھر کر جان سے ہاتھ دھونا ہے، لیکن اگر انجام بینی اس قصد سے باز رکھے، اور دل پر اسے اتنا ہی قابو حاصل رہے تو پھر عاشق کیوں کہلائے ؎

ذوق ہوائے کوچۂ قاتل کو کیا کروں!

مہلک سہی یہ شوق مگر دل کو کیا کروں

اس کی تڑپ، اس کا سوز، اس کا جوش و خروش، ان میں سے کوئی شے وہ اپنے قصد و

اختیار سے نہیں پیدا کرتا، یہ ساری کیفیات اضطراری ہوتی ہیں اس کا متاثر قلب اس سے خود بخود یہ سب کچھ کراتا رہتا ہے ؎

اظہار اضطراب کا شائق نہیں ہوں میں
پہلو میں لیکن اس دل بسمل کو کیا کروں

ناصح کہتے ہیں کہ نظارۂ گل ترک کرلے تو دل قابو میں آجائے گا لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہوا کی مستی اور دوسرے عاشقوں کی صدائیں کب دل پر قابو رہنے دیں گی ؎

قطع نظر گلوں سے نہیں مانع جنوں!
بوئے بہار و شور عنادل کو کیا کروں

داغؔ کی ایک مشہور غزل ہے ؎

بات میری کبھی سنی ہی نہیں — جانتے وہ بری بھلی ہی نہیں

اس کا یہ شعر خوب چلا ہوا ہے ؎

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد — ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

اس زمین میں اکبرؔ نے جو گل بوٹے کھلائے ہیں، خدا اس کی بھی سیر ہو جائے ؎

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں — آرزو میں نے کوئی کی ہی نہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو — مگر افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرض حال کیا ہوتی — نظر لطف اس نے کی ہی نہیں
اس مصیبت میں دل سے کیا کہتا — ایسی کوئی مثال تھی ہی نہیں
آپ کیا جانیں قدر "یا اللہ" — جب مصیبت کوئی پڑی ہی نہیں

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں!

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا ہنس کے بولے وہ آدمی ہی نہیں

"فالتو" کو کس خوبی سے کھپا دیا ہے! اور "سوسائٹی" کا قافیہ لانا تو اکبر کا مخصوص حصہ تھا۔ گردشِ چرخ کا شکوہ سب ہی شاعر شروع کرتے آئے ہیں۔ اکبر نے دوسروں کے تجربہ سے فائدہ یہ اٹھایا کہ سرے سے کوئی آرزو ہی فلک سے قائم نہ کی۔ اور مزے میں رہے۔ پانچویں شعر میں ایک نادر مضمون باندھا ہے مصیبت زدہ کی تسکین کے لئے دوسروں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن ہمارے شاعر کو جن مصائب کا سامنا ہوا ہے، ان کی کوئی نظیر اب تک موجود ہی نہ تھی، وہ کس کی مثال سے اپنے دل کو تسکین دیتے۔ مصائب کے فوق الحد ہونے کا یہ ایک نادر پیرایۂ اظہار ہے۔ چھٹے اور ساتویں شعر کا تعلق ذاتی تجربہ سے ہے، ان کی داد دینا بغیر آپ بیتی کی مدد کے ممکن نہیں۔

ایک اور غزل ملاحظہ ہو

جلوۂ ساقی و مے جان لئے لیتے ہیں

شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو پئے لیتے ہیں

دل میں یاد اُن کی جو آتی ہوئی شرماتی ہے

درد اٹھتا ہے کہ ہم آڑ کئے لیتے ہیں

دورِ تہذیب میں پریوں کا ہوا دور نقاب

ہم بھی اب چاکِ گریباں کو سئے لیتے ہیں

خودکشی منع، خوشی گم، یہ قیامت ہے مگر

جینا ہی کتنا ہے اب، خیر جئے لیتے ہیں

لذتِ وصل کو پروانہ سے پوچھیں عشاق
وہ مزہ کیا ہے جو بے جان دیئے لیتے ہیں

دوسرا شعر عاشقانہ رنگ میں لاجواب ہے۔ عارفانہ پہلو بھی ہے۔ مضمون کتنا سچا ہے کہ بغیر درد کے اِن کی یا دہی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے کس بانکپن سے ادا کیا ہے۔ آخری شعر بھی اسی رنگ میں ہے۔ تیسرے اور چھٹے شعر میں شاعر پھر اپنے اصلی عالم میں چلا گیا ہے۔

نامانوس قافیہ لاکر کلام میں شعریت باقی رکھنا، بلکہ اس کے لطف و ذوق کو دوبالا کر دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ ازل سے یہ دولت اکبر کے حصہ میں آچکی تھی۔ فرماتے ہیں اور کس بے تکلفی کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اس دور میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے
اس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے

نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا
سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب فعل و فعل
چرخا ہی چلا جاتا ہے اور سوت نہیں ہے

نیچری کا مبلغ ہے بہت معتبر اکبر
تم دیکھتے ہو پل میں کہیں چھوت نہیں ہے

اکبر کا اصلی مقام معرفت وحقائق کا "لاہوت" ہے، لیکن جب قافیہ پیمائی کے "ناسوت" میں اترتے ہیں تو دیکھنے والوں کو "مبہوت" کر دیتے ہیں۔ اب مزید توصیف سے "سکوت" ہی اولیٰ
خالص عاشقانہ رنگ کے شیدائی، اپنے ذوق کی تسکین کا سامان عجب نہیں کہ ان غزلوں

یلی ہباکس سے

عشق کہتا ہے بیانِ حال کی پروانہ کر
تیرے دل کی خود بخود اُن کو خبر ہو جائیگی
میں شبِ فرقت میں تڑپوں اور وہ سوئیں چین سے
کس طرح مانوں محبت بے اثر ہو جائے گی

تجھے اے امیدِ فردا، دل و جاں سی پیار کرتے
مگر اپنی زندگی کا نہیں اعتبار کرتے
ہے بتوں کی خود نمائی مری غفلتوں سی قائم
میں اگر نظر نہ کرتا تو وہ کیوں سنگار کرتے
ترے ہاتھوں کی زینت تو ہے شاخِ گل سی افزوں
ہمیں دسترس جو ہوتا تو گلے کا ہار کرتے

صبر رہ جاتا ہے اور عشق کی چل جاتی ہے
ضبط کرتا ہوں، مگر آہ نکل جاتی ہے
کچھ نتیجہ نہ سہی عشق کی امیدوں کا
دل تو بڑھتا ہے، طبیعت تو بہل جاتی ہے
شمع کے بزم میں جلنے کا جو کچھ ہوا انجام
مگر اس عزم سے بے سانچہ میں تو ڈھل جاتی ہے

کتانِ رازِ عشق مرے آب و گِل میں ہے
خاموش ہے زبان، جو کچھ ہے وہ دِل میں ہے

افعی وزلفِ مِس کا تو سودا برا نہیں!
پیچیدگی جو کچھ ہے نقطہ اس کے بِل میں ہے

بِل" دفرو حساب) کا تعلق "سودے" سے تو خاص انگریزی دکانداری کا ضلع ہے۔ لکھنؤ کا ذوقِ قدیم اس کی زیادہ قدر نہ کرسکا، البتہ "افعی" و "زلف" دونوں کے لئے "پیچیدگی!" عجب نہیں جو اہلِ لکھنؤ ان مناسبتوں پہ "لوٹ لوٹ" جائیں، اکبر کے سارے قصور معاف کردیں، داد میں "دفتر کے دفتر" سیاہ کردیں، لفظ لفظ کیا، "نقطہ نقطہ" کی تشریح "مُو بمُو" کرنے لگیں، بال کی کھال نکالنے لگیں اور سلسلۂ "بیان و بیتک" "برہم" نہونے پائے۔

کہیں کہیں شعر اس رنگ کا بھی نکل گئے ہیں جو استاد امانت کی روح کو وجد میں لے آئے، مثلاً ؎

اس سرو قد پہ اکبر مُدت سے مر رہا ہوں!
اللہ راست لائے کوشش تو کر رہا ہوں

بے ساختگی تو یہاں بھی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ عموماً کہتے وہی ہیں جو دل میں محسوس کرچکے ہوتے ہیں، اُن کی شاعری اکھاڑہ کا کرتب نہیں، واردات قلب کا عکس ہے۔ اپنے پر جو گذرتی ہے وہی دوسروں کو بھی سناچلتے ہیں۔ خود بھی اپنے اس ہنر سے واقف ہیں، اور اعتراف کرتے ہیں کہ بجز اس کے اور میرے کلام میں ہے کیا؟ ؎

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں
دِل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

اپنے میں اور رسمی شاعروں میں جو فرق پایا، اُسے بھی صاف صاف بیان کر دیا ہے سے

"میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں
سخن اُن سے سنور تا ہے، سخن سے میں سنورتا ہوں"

اتنا نمونہ حضرت اکبر کے آخری دورِ تغزل کا کافی ہوگا ضمناً ابتدائی اور وسطی دور کے کلام سے بھی تعارف ہوگیا۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کی عظمت کی بنیاد اُن کے عاشقانہ کلام پر نہیں، دوسرے اصنافِ سخن پر ہے، لیکن اس کے باوجود خاص تغزل میں بھی اُن کا مرتبہ اُردو شاعروں میں کچھ ایسا گیا گزرا نہیں، کہ اُن کے لئے باعثِ توہین، اور اُن کے پرستاروں کے لئے باعثِ شرم ہو۔ روزمرہ، سلاست اور زبان کی صفائی میں تو اُن کی اکثر غزلوں پر داغ کے کلام کا دھوکا ہوجاتا ہے، اور معنوی بلند پروازیوں میں اگر وہ غالب کے ہم سطح نہیں، تو بھی مومن و شیفتہ وغیرہم کے طبقہ میں تو انہیں بے تکلف جگہ مل ہی سکتی ہے۔ مثالیں کلام کے ابتدائی اور درمیانی دور میں بکثرت ملیں گی۔ آخری دور میں کمتر۔

(د) اخلاق و معاشرت

اکبر کے صحیفہ کمال کا روشن ترین عنوان اخلاق و معاشرت ہے۔ ان کی شاعری کی رُوح، ان کی اخلاقی و معاشرتی تعلیمات ہیں، ابتدائی دور میں تغزل کی شوخیاں غالب تھیں آخری دور میں تصوف کے خرقہ پوش ہوگئے تھے۔ لیکن دو چیزیں ایسی تھیں، جنہوں نے اوّل سے آخر تک کبھی ساتھ نہ چھوڑا، بلکہ ہر دور میں رفاقت قائم رکھی، ایک تو پیرایۂ ادا و اندازِ بیان کی ظرافت، دوسرے مفہوم سخن و موضوع کلام کے حدود میں اصلاحِ معاشرت و تزکیہ اخلاق

اکبر کی شاعری کے عروج و شہرت کا زمانہ بیسویں[۲۰] صدی عیسوی کی دوسری دہائی ہے لیکن انکی اصلاحی شاعری کی بنیاد ۱۹ ویں صدی کی آخری چوتھائی میں پڑ چکی تھی۔ اور بیسویں صدی کے شروع ہی سے

وہ خاصے مشہور بھی ہو چکے تھے۔ ہندوستان، خصوصاً مسلمانانِ ہندوستان میں عین یہی زمانہ، مغربی تمدن، مغربی معاشرت، مغربی علوم، غرض مغربیت کے ہر شعبہ کے انتہائی عروج، مقبولیت و فروغ کا ہے۔ اکبر جب دنیا میں روشناس ہوئے ہیں، تو اس وقت کی صورتِ حال کا نقشہ ذرا تفصیل کے ساتھ تصور میں لے آیئے۔

ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں فرو ہوئے، ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں اور ہندوستان پوری طرح مزہ چکھ چکا ہے کہ زبردست کے مقابلہ میں کمزور کے سر اٹھانے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ ملتِ اسلامی خصوصیت کے ساتھ اپنی غفلتوں اور عیش پرستیوں کے نتائج بھگت رہی ہے۔ صدیوں تک جس ملک میں حکومت کی۔ بڑے کروفر کے ساتھ، بڑی شان شوکت کے ساتھ، کبھی غوریوں کے نام سے کبھی خلجی بن کر، کبھی سیدوں کے نام سے، اور کبھی تغلق کا جھنڈا اٹھا کر۔ اور آخری صدی دو صدی مغلوں کے نام سے اس ملک میں مسلمان، اب سب سے زیادہ حقیر و ذلیل تھے، ہر سمت سے پٹے ہوئے، چاروں طرف سے مار کھائے ہوئے۔

اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعائر مدت ہوئے رخصت ہو چکے۔ وہ اگر زندہ ہوتے تو مغلوبیت کی یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ثروت و خوشحالی اول تو باقی ہی کہاں، جائیدادیں بارِ قرض سے دبی ہوئی، مکان اور زیور، مہاجنوں ساہوکاروں کے یہاں رہن، اور پھر جو کچھ روپیہ پیسہ رہا بھی وہ ناچ رنگ، کھیل تماشا، ٹیم ٹام کی نذر۔ نہ تعلیم و تربیت نہ اتحاد و تنظیم، نہ ہمت و خودداری، نہ جوشِ توحید و ولولۂ دینی نہ قناعت و ایثار۔ عقیدے مشرکانہ، اخلاق جاہلانہ، عادتیں مسرفانہ، آپس میں حسد و بغض، ایک کی ناک میں ایک لگا ہوا، عجمیت اور ہندیت کے حملے تو سینکڑوں سال سے جاری تھے، اب آخری زبردست ٹکر، فرنگیت سے ہوئی، اور اس لئے کہنا چاہیئے کہ پرانے عربی جہاز کو پاش پاش

ہی کر دیا۔ ادھر مغرب کی اس زیرک وزمانہ شناس اور اقبالمندی کے لحاظ سے پُرشباب قوم انگریز نے تیر و تبر، توپ و تفنگ سے، کہیں زیادہ بے پناہ حربہ پروپیگنڈا کا استعمال شروع کر دیا، اور اپنے ایجنٹوں، گماشتوں، کارندوں کو اسکول اور کالج کے ادبی قالب میں بنا کھڑا کیا! نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دل پر برطانیہ کی عظمت کا نقش، ہر زبان پر اقبال سرکار کا کلمہ! داد خواہی کے لئے گھر سے نکلئے تو قانون انگریزی، عدالتیں انگریزی، لڑکوں کو پڑھنے بٹھایئے تو اسکول انگریزی، کالج انگریزی، کتابیں انگریزی، زبان انگریزی۔ سفر کے لئے باہر نکلئے تو سڑکیں انگریزی، سواری (ریل) انگریزی، ٹکٹ انگریزی، سفر کی منزلیں (اسٹیشن) انگریزی! دُکھ درد میں مبتلا ہو جیئے، تو علاج کے لئے دوائیں انگریزی، تشخیص انگریزی، شفاخانے انگریزی، مرہم پٹی انگریزی۔ خط بھیجئے، پارسل لگایئے تو ڈاک انگریزی، ڈاک خانہ انگریزی! روپیہ جمع کرنے، یہی کھاتہ کھولنے کا شوق ہو، تو بینک انگریزی، سیونگ بینکس انگریزی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں انگریزی۔ قصّہ کہانی کے لئے جی لہرائے تو افسانے انگریزی، ناول اور ڈرامے انگریزی۔ ورزشی کھیلوں کے لئے دل للچائے تو کھیل انگریزی، فٹ بال اور کرکٹ اور ٹینس اور انٹا[1] شام کو سیر و تفریح کے لئے قدم اٹھایئے تو سامان تفریح انگریزی، پارک

---

[1] ایک بہت پرانا انگریزی کھیل۔ اب مدت ہوئی متروک ہو گیا ہے۔ شروع انگریزی راج میں اس کا بڑا رواج تھا۔ جن شہروں میں شروع شروع انگریزی چھاؤنیاں قائم ہوئی تھیں، وہاں "انٹاگھر" کے نام سے عمارتیں اب بھی موجود ہیں۔ میاں منیر شکوہ آبادی ایک پرانے اردو شاعر ہوئے ہیں، صاحب دیوان۔ وہ بھی ایک جگہ اسے باندھ گئے ہیں ؎

جیت جاتے اک مہینہ بھر کے بوسے بات میں ہم جو انٹا اس قمر سے فیس دے کے کھیلتے!

ہیں، لان میں، کلب میں، ہوٹل اور ریسٹوراں میں، رات کو رنگ رلیاں منانے کو جی چاہے تو تماشے انگریزی، تھیٹر، کنسرٹ، آپیرا۔ ماضی کو جاننا چاہیئے تو تاریخیں انگریزی۔ حال سے باخبر رہیئے تو اخبارات انگریزی، تار برقیاں انگریزی، پیشہ انگریزی، بیرسٹری، وکالت، ڈاکٹری، انجینیری عہدے انگریزی، علوم انگریزی، فنون انگریزی، صنائع انگریزی، خلاصہ یہ کہ گویا زمین انگریزی آسمان انگریزی۔

اپنی اس پستی اور "صاحب" کی اس بلند پروازی، اپنی خاک نشینی، اور صاحب کی فلک پیمائی دیکھ کر اکبر بجا کس کے رہ سکتے تھے؟ خصوصاً جبکہ اپنے دل کا سرمایہ پہلے ہی لُٹ چکا ہو، ہوش گم۔ نگاہیں خیرہ، عقل دنگ، مرعوبیت غالب، دماغ مفلوج، ڈوبتے کو گھاس کے تنکے کا سہارا کافی نظر آیا۔ اندھیرے میں اپنے سایہ پر بھوت کا گمان گذرا۔ لباس حواس میں دیو پریوں کا حسن و جمال معلوم ہوا۔ دَیر میں حرم کا تقدس دکھائی دینے لگا۔ اچھے اچھے ہوشمند اور مخلص سید احمد خان اور ان کے سارے رفیق یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" بھائیو بجز مذہب کے ہر چیز میں انگریز بن جاؤ۔ فلاح اور زندگی کا سہارا بس اُدھر ہی ہے ـــــــ حالی بڑے شوع و خضوع سے مسدس اسلام کھول کر بیٹھے لیکن مناجات کا خلاصہ بس یہی کر لے پاک پروردگار ہم کو انگریزوں سا بنا دے۔ شبلی نے بڑے ٹھاٹھ سے اموران اسلام کا دربار سجایا۔ لب لباب اس کا بھی یہی، کہ ہمارے اکابر سلف بھی دانایان فرنگ سے کتنا قریب تھے! اور نذیر احمد، ذکاءاللہ، محسن الملک، چراغ علی بیچاروں کا تو ذکر ہی نہیں۔

اب قوم تھی اور اس کے سر پر جادوئے فرنگ! ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بولنا آجائے، لب و لہجہ

"صاحب" کا سا ہو جائے۔ ڈگریاں اور امتحانات سرکاری تعیب میں آجائیں۔ اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے۔ اپنی زبان، اپنے علوم، اپنے ان کے کھانے پینے، اپنے طرز کے پہلنے اور رہنے، اپنی ساری معاشرت، اپنے خاندان، اپنی برادری، یہاں تک کہ اپنے ماں باپ سے بھی شرم آنے لگے۔ اپنے ملک کی ایک ایک چیز میں ذلت و حقارت نظر آنے لگے۔ معزز صرف "صاحب" اور "میم صاحب" ٹھہر جائیں۔ اپنے ہاں کی شرم و حیا حجاب نقاب اس لئے قابل نفرت کہ میم صاحب کھلے بندوں سب کچھ دیکھتی دکھاتی پھرتی ہیں۔ جن و ملائک کا شمار اس لئے اوہام میں کہ بل اور اسپنسر ان کے قائل نہیں۔ عرش کا وجود اسلئے باطل کہ جغرافیہ کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں۔ وحی، نبوت توحید کے بنیادی مسائل اس لئے فرسودہ و متروک کہ پادری صاحب اپنی گڑھی ہوئی مشرکانہ مسیحیت ہی ان پر دلائل عقلی نہ قائم کر سکے۔ داڑھی منڈانا اس لئے واجب کہ صاحب منڈاتے ہیں۔ سود جیسی حرام کمائی اسلئے جائز کہ صاحب کے دیس میں شہر شہر بینک کھلے ہوئے ہیں۔ "سر" ذلیل "ہوٹل" معزز، مختار کار رندہ، حقیر "ایجنٹ" قابل عزت، "حکیم" غریب کس مپرسی میں پڑے ہوئے "ڈاکٹر" الفقراء اٹھ لئے جار ہے ہیں!

غرض فرش سے لے کر عرش تک، ذرہ سے لے کر آفتاب تک علم و عمل معاشرت اخلاق عقائد کے دائرہ میں کوئی شے ایسی نہ تھی جو "صاحب" کے نام کا کلمہ، پڑھ رہی ہو۔ ساری فضا اسی مرعوبیت سے معمور، "دانش فرنگ"، "حکمت مغرب"، "عقلائے فرنگ"، "اقبال سرکار"، "دانایان مغرب" وغیرہ خدا جانے کتنے فقرے اور ترکیبیں اس دور مرعوبیت کی یادگار، علوم متعارفہ کی طرح بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے، اور ادب کا گویا جزو بن گئے۔ "فرنگی" کا لفظ اس سے قبل ذم و ہجو کا پہلو لئے ہوئے تھا۔ اس دور میں "فرنگ" محل مدح و عظمت میں استعمال ہونے لگا ——— دنیا کی تاریخ میں یہ واقعہ انوکھا نہیں۔ زبردست جب کمزوروں پر غلبہ پا جاتے

ہیں، تو بس یہی ہونے لگتا ہے۔ ہرچند انہیں کی عینک سے یہ خود بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اب نہ اپنی عقل باقی رہ جاتی ہے، نہ اپنی نظر۔ اور تاریخ والوں کا بیان ہے کہ قوموں کی قسمت میں یہ دستور ازل سے لکھا چلا آرہا ہے ؎

وفا جفا کی طلبگار ہوتی آئی ہے　　ازل کے دن سے یہ ایسے ہوتی آئی ہے

تو یہ تھی وہ فضا جس میں اکبر نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ یہ تھا وہ ماحول جس میں انہیں اپنا پیام پہنچانا تھا۔ رسمی شاعر نہ تھے، ہوتے تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جس طرح اور ان کے ہم عصر اچھے اچھے خوش فکر، زینت مشاعرہ ہو رہے تھے، یہ بھی آراستہ پیراستہ طرحی غزلیں کہتے رہتے، بلکہ طرح بھی قافیہ پیمائی میں لگے رہتے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ صاحب نظر تھے، ایک خاص دل و دماغ رکھتے تھے، ایک خاص مقصدیت لے کر آئے تھے۔ ایک مخصوص پیام کی تبلیغ کا بار ان کے شانہ پر تھا۔ یوں کہیے کہ فطرت کی جانب سے ایک "رسول" ہو کر آئے تھے "صاحب کتاب" حقیقی رسولوں کے جانشین اور ادنیٰ خادم۔ دل کڑھتا، دماغ متاثر ہوتا، آنکھوں نے بہت کچھ دیکھ لیا، جو دوسروں کی نظر سے اوجھل تھا۔ ان کا پیام اسی تحریک مغربیت کے خلاف ردعمل تھا۔ ان کی شاعری اوّل سے آخر تک، اسی مادیت و فرنگیت کا جواب ہے۔ ان کے ترکش کا ایک ایک تیر اسی نشانہ پر آکر لگتا ہے۔ ان کے فلسفہ، ان کی ظرافت، ان کی سیاسیات کے دائرہ کی معمولی سی بھی پیمائش ممکن نہیں، تاوقتیکہ نظر اس مرکزی نقطہ پر نہ جمالی جائے۔

یہ رنگ موجود شروع ہی سے تھا، سن و تجربے میں پختگی کے ساتھ نکھرتا گیا، یہاں تک کہ آخر میں ہر سانس سے یہی نغمہ پیدا ہونے لگا۔ عورتوں کی بے پردگی سے متعلق ان کا مشہور و ضرب المثل قطعہ ان کے آخر زمانہ کا نہیں، شروع ہی کا ہے، اور کلیات سوم میں نہیں "کلیات اوّل" میں درج ہے ؎

کل بے حجاب آئیں نظر چند بی بیاں　　اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہُوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

"عقل پر پردہ پڑ جانا" اس محاورہ کا تصرف اس خوبی سے، اس سے قبل کبھی کیوں ہُوا ہو گا!

قوم کی انتشاری و اضطرابی حالت خود اپنی ہی شامت اعمال کا نتیجہ ہے، اس کا نقشہ بھی، اُن کے قلم کا کھینچا ہُوا، بہت مدت کا ہے ؎

مذہب کو لیا تو بحث میں سر ٹوٹا　　چاہی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر　　اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

کلیات سوم میں اصلاح معاشرت ہے، تزکیۂ اخلاق ہے، شعائر اسلامی کا احیاء ہے، تہذیب اسلامی کی تجدید ہے، اور یہ وعظ سطر سطر میں موجود ہے، لیکن مولانا حالی کی طرح خشک واعظ نہیں وہ پہلے شاعر ہیں، پھر کچھ اور۔ پہلے ظریف ہیں، پھر مصلح۔ پہلے نقاش فطرت ہیں۔ پھر معلم اخلاق، اُن کی مجلس میں شراب کے گلاس گردش میں رہتے ہیں، خوش رنگ، خوش مزہ، یخنی کے پیالے تقسیم نہیں ہوتے[1] اور یہ اس رند پاکباز کی کرامت ہے کہ حلق سے اُترتے ہی وہ شراب خانہ خراب نہیں رہ جاتی۔ شراب طہور ثابت ہوتی ہے لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ،

اکبر سے قبل بنگال کا ایک نامور فرزند بنکم چندر چٹرجی بھی یہی مشن لے کر پیدا ہُوا ہوا تھا، تہذیب جدید کے خطرات کا اس نے پوری طرح اندازہ کر لیا تھا، اور بنگالی زبان

---

[1] یہ تشبیہ بھی خود حضرت اکبر ہی کی سجھائی ہوئی ہے۔ کہیں فرما گئے ہیں (افسوس ہے کہ کلیات میں کہیں وہ قطعہ نہ ملا) کہ لوگ مجھ میں اور حالی میں فرق دریافت کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کہاں وہ آفتاب۔ آخری مصرعہ کا آخری ٹکڑا ہے" وہ یخنی میں شراب"

میں اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعہ سے اس سیلاب کے روکنے کی اپنے امکان بھر کوشش کی تھی۔ اردو میں بھی اس کا ایک آدھ ترجمہ درگیش نندنی وغیرہ کے نام سے آچکا ہے۔ بنکم نے اپنا حربہ نثر کی شمشیر عریاں کو رکھا تھا۔ اکبرؔ نے اس کے بجائے نظم کے نشتر کو اختیار کیا۔ بنکم کی تلوار کا کاٹ سب نے دیکھا، اکبرؔ کا نشتر عموماً زیر آستین رہا۔

جدید تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا مظہر آنا دی نسواں کا ہے، اس شاندار لفظ کے عقب میں حقیقت عریاں، بے پردگی، بے حجابی، و بے عصمتی کی ہے۔ اکبرؔ کے ترکش کے اکثر تیروں کا ہدف یہی ہے۔

اس تہذیب کا ایک نمایاں کرشمہ یہ ہے کہ جہاں بیوی سے شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے۔ وہاں شوہر سے بھی حمیت و غیرت سلب ہو جاتی ہے۔ اکبرؔ کے نگار خانے میں یہ مرقع ایک ممتاز مقام پر آویزاں ملے گا ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں

حجاب اُن کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق جس کثرت سے دائر ہوتے رہتے ہیں، اور شہادتوں میں جیسے جیسے حیاسوز واقعات کا انکشاف ہوتا رہتا ہے وہ وہاں کی زندگی کا جزو بن چکے ہیں، اور "صاحب" کے قدموں کے طفیل ہندوستان بھی ان برکتوں سے مستفید ہو چلا ہے۔ اب یہاں بھی ایسے واقعات الشاذ کالمعدوم کے حکم میں نہیں رہے ہیں۔ لیکن یہاں ابھی احساس حمیت و غیرت بہرحال کچھ نہ کچھ زندہ ہے، اس لئے واقعہ ہو چکنے کے بعد حسرتیں بھی ہوتی رہتی ہیں، اور ندامتیں بھی۔ یہ کیفیت اکبرؔ کی زبان سے سنیئے ؎

کیا گزری جو اک پردہ کے عدو در دو کے پولیس سے کہتے تھے

عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بیوی بھی گئی، زیور بھی گیا

اس غزل کے چند اور شعر بھی ہیں، درد و عبرت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے۔ بہت بے محل نہ ہوگا اگر انہیں بھی اسی سلسلہ میں سن لیا جائے ؎

اکبر نہ تھا بت خانہ میں، زحمت بھی ہوئی اور زر بھی گیا

کچھ نام خدا سے انس بھی تھا۔ کچھ ظلم بتاں سے ڈر بھی گیا

پروانہ کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشک اے اہلِ نظر

اک شب ہی میں یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا، اور مر بھی گیا

کعبہ سے جو بت نکلے بھی تو کیا، کعبہ ہی گیا جب دل سے نکل

افسوس کہ بت بھی ہم سے چھٹے اور چھوٹ خدا کا گھر بھی گیا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اس قصر پہ کل میں رویا بہت

کوئی متنفس تھا نہ وہاں، اندر بھی پھرا، باہر بھی گیا

آخری شعر میں شاعر جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اکبر دنیوی حیثیت سے بھی ایک خاصے بڑے آدمی تھے۔ وطن (الہ آباد) میں عشرت منزل کے نام سے کوٹھی بنوائی (اپنے صاحبزادہ کے نام پر) ایک زمانہ میں وہ واقعی عشرت منزل ہی تھی۔ دعوتیں جلسے، اسپیچیں، شعر و سخن چہل پہل، فرنیچر اور سامان آرائش وغیرہ۔ آخر زمانہ میں حالت اس کے ٹھیک برعکس۔ پہلے محبوب بیوی نے داغ مفارقت دیا، پھر نوجوان محبوب بیٹا رخصت ہوا۔ جج صاحب کی پنشن ہوئی۔ آنکھیں خراب ہوئیں صحت نے جواب دیا۔ بڑے صاحبزادے پردیس میں ملازم۔ مکان سنسان، پائیں باغ ویران، سامان آرائش و نمائش غائب۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا۔ ہو حق

کا عالم، ایک حضرت اکبر، خود ایک مرد ملازم، ایک بڑھی اا۔ بس کل آتنی آبادی۔

خیر، یہ ایک جملۂ معترضہ آ گیا تھا۔ اب پھر پہلے شعر کیا گزری جوائع کو وہ کر کر بہہ گئے چاہیے۔

ایک جگہ بے پردگی اور تعلیم نسواں کو لازم و ملزوم بتاتے ہیں، اور دو مختلف مفہوموں (پردہ اٹھنے اور تعلیم کے لئے اٹھنے) کے لئے لفظ "اٹھنے" کے اشتراک سے کیا خوب شاعرانہ استدلال کا کام لیتے ہیں ؎

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو
پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تخییل تو شاعرانہ، لیکن اس واقعیت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے، کہ پردہ شکنی کی حمایت میں سب سے بڑی دلیل یہی، کہ پردہ کی چار دیواری کے اندر رہ کر علم کی تازہ ہوا نصیب ہونا ممکن کہاں ؟ اور "علم و تعلیم" کے جو معنی اس گروہ کے ذہن میں ہیں، ان کے لحاظ سے یہ قول ہے بھی بالکل بجا۔

ہمارے ہاں بہترین عورت کا تخیل یہ تھا کہ شرع سے دبی لپی رہے، خانہ داری کے طور طریقے سیکھے، کہ آگے چل کر اسے گھر کی ملکہ بننا ہے۔ بچپن میں والدین کی اطاعت، اور شادی کے بعد شوہر کی رضامندی کو پروانۂ جنت خیال کرے۔ خانگی شیرازہ اسی کی ذات سے بندھا ہوا رہے، خاندان کی سرتیں اس کے دم سے قائم رہیں۔ صحیح معنی میں اہل حسنات ثابت ہو۔ اولاد کو تربیت کے بہترین راستہ پر ڈال سکے۔ شوہر کی عزت و محبت، بڑوں کی تعظیم و خدمت گزاری اور چھوٹوں کے الفت و شفقت کے جذبات لے کر دنیا میں آنکھ کھولے اور انہیں جذبات کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ فرنگیوں کے یہاں عورت کی عزت کا معیار ہی کچھ دوسرا ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا یہ مشرقی تخیل عورت کے لئے باعث توہین ہے، موجب تحقیر ہے۔ ان کی فرہنگ میں

ادب و تعظیم، اطاعت و خدمت گذاری مرادف ہیں محکومی کے، غلامی کے۔ اُن کا قول کہ عورت اپنے کو چھپانے کے لیے نہیں، دکھانے کے لیے آئی ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ جب دیکھئے گھر ہی کے اندر، شوہر کے، یا ساس نند کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے۔ وہ عورت ہی کیا جس کے حُسن گفتار حُسن رفتار، حسن صورت، زیب و زینت، خوش لباسی، گلے بازی، رقاصی کے چرچے "سوسائٹی" میں عام نہ ہوں، اخبارات میں اس کے فوٹو شائع ہوں۔ اس کا نام زبانوں پر لذت کے ساتھ آئے، اُس کا جلوہ آنکھوں میں چمک پیدا کرے، اور اُس کا تصور دلوں میں شوق۔ بہترین عورت وہ نہیں جو بہترین بیوی ہو یا بہترین ماں۔ بلکہ وہ ہے جس کی ذات، دوست احباب کی خوش و تفریح کا دلچسپ ترین ذریعہ ہو، اور ایسی ہو کہ اس کی رعنائی و دلربائی کے نقش ثبت ہوں، کلب کے ورودیوار پر، پارک کے سبزہ زار پر، ہوٹل کے کوچ اور صوفے پر۔

"ہمارے" اور "اُن کے" تخیل کے اس بُعد المشرقین کو اقلیم لفظ و معنی کا یہ تاجدار دو لفظوں میں جس جامعیت اور حسن بلاغت کے ساتھ بیان کر جاتا ہے، یہ اس کا حصہ تھا ؎

حامد چمکی نہ تھی، انگلش سے جب بیگانہ تھی

اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

"چمکی" میں وہ بے پناہ بلاغت ہے کہ سننے والا لوٹ لوٹ جائے۔ یہ "چمک" مخصوص ہے "نئی روشنی" کی چمنیوں کے ساتھ پرانے فانوسوں میں، ڈیوٹ والے چراغوں میں چمک دمک بھلا کہاں! شرم و حیا سے آزادی، دنیا کی دلستانی کے لئے ناز و انداز، قابلیت کے جوہر کی جلا، یہ سب کچھ اس منتخب لفظ "چمکی" سے ظاہر و آشکار، اور یہ "شمع انجمن" اور "چراغ خانہ" کی مثال کس قدر روشن، کیسی ضیا بار! تشبیہ کی تشبیہ اور پھبتی کی پھبتی! شعر کیا ہے بیسویں صدی کی "کالج گرل" کی قد آدم تصویر۔

حسن ناز کی دنیا میں قابل داد اب تک کم سخنی، کم گوئی دبے دبانی تھی، مشرقی شوہر "چاند سی دلہن" بیاہ کر اسلئے لاتا تھا کہ وہ اسے اپنے اندھیرے گھر کا چراغ بنائے، اور تخیل "خانہ آبادی" کا غالب رہتا۔ اب جو جاکر دیکھتے ہیں تو محفل کے طور ہی کچھ اور ہیں، نقشہ ہی بدلا ہوا۔ ٹھاٹھ بزم آرائی کے جمے ہوئے حجاب کی جگہ بے حجابی۔ سکوت کی جگہ طوفان تکلم۔ مستوری کی جگہ نمائش۔ عاشق بیچارہ، اس کایا پلٹ پر دنگ۔ حیران گم صم۔ کل تک جو تصویر تھا، وہ آج گرامو فون نظر آرہا ہے ہے

خامشی کا نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق

اب سینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شان سالی سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں

بت جو سے وریہ ہیں، ناموس ہوئے جاتے ہیں

چوتھا مصرعہ، اپنی لطافت کے، بلاغت کے، جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب بس آپ! تیسرا مصرعہ اس پہلو کی جانب رہنمائی کر رہا ہے کہ۔ جو کچھ ہوتا ہے قدرتی نتیجہ ہے گنترا ماحول کا۔ جب فضا میں آسائش کی جگہ آرائش نے لے لی، راحت پر لذت مقدم ہوگئی۔ مردوں کا مطمح نظر بجائے تسکین قلب کے ہیجان نفس قرار پاگیا، تو قدرتاً عورت نے بھی اپنی محبوبیت کے انداز بدل دیئے۔۔ مردوں کے دل میں جگہ پانے کے طریقے بھی اب دوسرے ہوگئے۔

اکبر کے اس مربع کا ایک اور منظر ہے

اعزاز بڑھ گیا ہے۔ آرام گھٹ گیا ہے   خدمت میں ہے وہ لیزی[1] اور ناچنے کو ریڈی[2]

---

[1] سست، کاہل (LAZY)   [2] آمادہ، تیار، مستعد (READY)

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر شوہر پرست بیوی، پبلک پسند لیڈی

"شوہر پرست بیوی" اور "پبلک پسند لیڈی" ان دو لفظوں کے کوزہ میں کیسا مشرق و مغرب کا سمندر سمو دیا ہے! مشرق کا منتہائے نظر تو خدمت کا تھا، زچہ خانہ اور باورچی خانہ کا۔ اور مغرب کے ہاں ناچ کا ہے، بال روم اور کنسرٹ کا۔ اور عورت غریب بھی کرے کیا۔ نظام تعلیم بھی اسی ڈھنگ کا ہے۔ شروع سے سکھایا یہی جاتا۔ دل میں بٹھایا یہی جاتا ہے۔

آج یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے ماہرین نفسیات (سائیکالوجی) و حیاتیات بشری (ہیومن بیالوجی) کہہ رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں، کہ دونوں صنفوں کے درمیان، کشش جنسی بالکل طبعی ہے۔ دونوں جب باہم ملیں گے، اور کوئی امر مانع موجود ہو گا نہیں، تو آگ کا دفعتاً بھڑک اٹھنا اس بجلی کا اکبارگی رگڑ سے پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ شریعت اسلام نے اس گہری اور بنیادی حقیقت کے پیش نظر، بدکاری کے نفس عمل کو ہی حرام نہیں قرار دیا، بلکہ اس منزل تک پہنچنے کی جتنی راہیں ہیں، ان پر بھی پہرے بٹھا دیئے۔ گویا دشمن کی پوری "ناکہ بندی" کر دی۔ بانس ہی نہ ملے گا تو بانسری کہاں سے بجے گی۔ بیگانہ عورت و مرد کو اختلاط کے جب موقع ہی نہ ملیں گے تو پینگ بڑھنے ہی کہاں پائیں گے۔ بالکل بچپن کو چھوڑ کر، باقی آگے بڑھ کر مشترک پڑھنا لکھنا حرام، مشترک کھیل کود حرام۔ بلا ضرورت یکجائی ناجائز، تاک جھانک حرام، تاکہ سوسائٹی میں، مفاسد کا زہر سرے سے پھیلنے ہی نہ پائے معاشرت ہمیشہ بے داغ رہے تعلیم جدید نے، تہذیب جدید نے، ان میں سے ایک ایک بند کو توڑا۔ نتیجہ وہی نکلا جو ممکن تھا آزادیاں بڑھیں، بے حیائیاں آئیں، بے حجابیاں دلیل ترقی بنیں۔ جو باتیں کل تک آن ہونی تھیں آج ہو کر، گزر کر رہیں، بھولے بھالے لوگوں نے کہا "کہ محافظ عصمت یہ تعلیم ہو گی نہ"۔ سبحان اللہ! زنگی کا نام اگر کافور رکھ دیا گیا تو گویا چہرہ

کی سیاہی بھی دور ہو جائے گی! توقع لیڈروں سے پہرہ داروں کے کام کی کی جانے لگی! اب تو شالیں کوئی کہاں تک گنا سکتا ہے۔ لیکن اکبر کے زمانے میں بھی فرانس کی میڈیم ڈی اسٹیل[1] اور انگلستان کی جارج ایلیٹ[2] کی سی ہستیاں نامعلوم نہیں تھیں۔

اکبر کے توسط سے ایک مختصر سا مکالمہ، ایک صاحب اور صاحبہ کے درمیان سنیئے:۔

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ
دونوں نے پاس کر لئے ہیں سخت امتحان ممکن نہیں کہ اب ہو کوئی ہم سے بدگمان
بولی یہ سچ ہے علم بڑھا اور جہل گھٹ گیا لیکن یہ کیا خبر ہے کہ شیطان ہٹ گیا

یہ سب سچ! لیکن پھر بھی یہ کہتے اور سوچتے ہیں کہ حیا و حجاب کے قیود و احکام تو مسلمان عورت کے لئے ہیں، جب دین ہی سرے سے غائب ہو گیا تو اب اس اخلاقی جکڑ بند سے آخر حاصل کیا؟ پردہ تو بقاء ناموس کیلئے ہے جب ناموس ہی نہیں تو اس کی بقا کیسی؟ کھانا پینا زندہ جسم کی ضرورت کے لئے ہے۔ لیکن جب زندگی ہی رخصت ہو چکی، تو مردہ کو کوئی نہیں کھلاتا پلاتا۔ صندوق میں قفل اس وقت تک پڑے رہتے ہیں۔ جب تک اس میں قیمتی مال محفوظ ہے، لیکن جب خالی ہو گیا تو اب اس کی حفاظت خود ایک دردِ سر ہے۔ پھولوں کی قدر جب ہی تک ہے، جب تک وہ تازہ و شاداب ہیں۔ باسی سوکھے مرجھائے پھولوں کو گلے کا ہار بنانا کوئی کیوں پسند کرنے لگا:

فرماتے ہیں:۔

---

[1] فرانس کی مشہور ادیبہ اخلاق کے قانون سے آزاد۔
[2] انگلستان کی مشہور ناول نویس، مردانہ نام رکھنے والی خاتون۔ ایک اہلِ قلم مرد، جارج ہنری لوئیس کے ساتھ مدتوں بے نکاحی بیوی کی طرح بسر کی۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید

بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے

نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ!

شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

چوتھے مصرعہ کی تشبیہہ اکبر ہی کا حصہ تھا۔

خاتونِ مشرق کو مغربی میم بنا دینے کا اب تک نتیجہ کیا نکلا ہے؟ خود مردوں ہی نے شکسپیر و ملٹن کی ورق گردانی اور مِل و اسپنسر پر دماغ سوزی کر کے اب تک دنیا بلکہ ہندوستان ہی کی محدود دنیا میں کون سے خاص امتیازات حاصل کر لئے ہیں۔

شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار

کہ خواتین کو پبلک میں ہو رفعت کی امید

خیر یہاں ذکر مردوں کی نہیں، عورتوں کی تعلیم کا ہے۔ مرد جس طرح پڑھ پڑھ کر، بڑھ بڑھ کر، صاحب کے بیرے بنتے گئے۔ صاحبیت میں ضم ہوتے گئے۔ اپنوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ اسی طرح عورتیں بھی بڑھ بڑھ کر میم صاحبیت میں گم ہوتی گئیں۔ ہاتھ سے نکلتی گئیں۔ کلیات اول میں ان کا قدیم ترین کلام ہے۔ اس حقیقت کو اس دور میں ظرافت کی کشتی میں لگا کر پیش کرتے ہیں ؎

تمتی کی نہیں ہم پہ چڑھا کیں   گھٹا کی دولت اپنی بڑھا کیں

رہیں ہر پھیر کے آیا بی نصیبن!   وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

کلیات سوم میں اس مرقع میں آب و رنگ ذرا اور زیادہ بھر دیتے ہیں ؎

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا   اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا

کچھ جوڑ تو ان میں کے ہوئے بال میں رقصاں   باقی جو تھے، گھر ان کا تھا افلاس کا مارا

بہراوہ بنا کسپ ہیں، یہ بن گئیں آیا! بی بی نزراہیں جب تو میاں پن بھی سدھارا •
دونوں جو کبھی ملتے ہیں، لگاگے ہیں یہ نعرہ آغاز سے بدتر ہے سرانجام ہمارا •

خیال نہ گذرے کہ اکبر سرے سے تعلیم نسواں ہی کے مخالف تھے، اور لڑکیوں کے بالکل ہی ناحق ﷺ دیکھنے کے حامی۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی و ہمدرد یقیناً تھے لیکن تعلیم تعلیم میں بھی تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ نا بید ہیں اس تعلیم کے تھے جو قوم میں نمونہ رابعہ بصریہ کے نہ سہی، دودمغنیہ کی جہاں آرا بیگم کے پیدا کرے۔ نہ اس تعلیم کے جو زینت ہو ہر آبیر اڈس کی، ہر پکچر پیلیس کی۔ اس تعلیم کو وہ رحمت نہیں، خدائی قہر سمجھتے تھے جس پر بنیادیں تعمیر ہوں، ہالی وڈ[1] کی۔ وہ آرزومند تھے اس نظام تعلیم کے، جو مہربان مائیں، وفا سرشت بیویاں اور اطاعت شعار لڑکیاں پیدا کرے، نہ اس کے جو تھیٹر میں اکیٹری اور برہنہ رقاصی کے کمالات کی جانب لے جائے[2]۔ وہ ملک میں حوریں پیدا کرنا چاہتے تھے کہ دنیا نمونۂ جنت بن جائے۔ پریوں کے مشتاق نہ تھے کہ ملک کا ملک راجہ اندر کا اکھاڑہ ہو کر رہ جائے۔ ان کا قول تھا۔

---

[1] Hollywood امریکہ کا مشہور شہر فلمی دنیا کا کہنا چاہیے کہ دارالسلطنت ہزارہا کی آبادی، روزانہ فلم سازی کی مختلف شاخوں، محکموں میں سرگرم رہتی ہے۔

[2] ۱۹۱۲ء کے آخر کا ذکر ہے کہ ایک برطانوی "میم صاحبہ" ماڈ ایلن (Maud Allen) نامی مشہور "آرٹسٹ" ہندوستان تشریف لائیں۔ بڑی دھوم دھام کے ساتھ انگریزی اخبارات روز ہی ان کے تذکروں اور کارناموں سے بھرے رہتے تھے۔ آپ کا آرٹ "ناچ" تھا، ایک خاص ناچ کے وقت جسم پر ہلکا باریک سا لباس، غالباً موتی کی لڑیوں کا رہتا تھا نیم برہنہ تو خیر شروع ہی سے رہتی تھیں رقص جب شباب پر پہنچتا تو گردش اس تیزی سے کرتیں کہ گویا جسم میں کوئی کمانی لگی ہوئی ہے۔
بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر

قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو — دو شوہر و اطفال کی خاطر اسے تعلیم

مزید توضیح سنیے ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں اُن کے منتظم — اُستاد ایسے ہوں مگر اُستاد جی نہ ہوں

(اُستاد جی' آپ سمجھے، محاورۂ لکھنؤ میں ارباب نشاط کے "تعلیم" دینے والوں کو کہتے ہیں - خود لفظ "تعلیم" بھی لکھنؤ کی زبان میں اس خاص معنی میں مستعمل ہے) ایک طویل نظم میں اپنا پورا مسلک وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے (صفحہ ۱۶۰ تا ۱۶۲) چند شعروں سے اندازہ کیجیے ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

معاشرت میں سراسر فتور ہے — اور اس میں والدین کا بےشک قصور ہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت — جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت — ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ — شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

لباس کی لڑیاں ایک ایک کر کے ہوا میں اڑنے لگتیں - یہاں تک کہ جسم پر ایک تار بھی باقی نہ رہ جاتا - گو یہ ضرور ہے کہ گردش رقص اس تسلسل تیزی کے ساتھ ہوتی کہ دیکھنے والے کی نظر کا جمنا ناممکن تھا - اور یہی آپ کے آرٹ کا کمال تھا - حضرت اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں مجھے تحریر فرمایا کہ "مس اڈا ملین آئی ہوئی ہیں - سنا ہے کہ برہنہ ہو کر اس طرح ناچتی ہیں کہ شائقین سائیں کو وجد آ جاتا ہے" - یہ ذکر دسمبر ۱۹۱۳ء کا ہے، اس وقت تک یہ کمالات بہرحال بعض پیشہ ور بیسواؤں ہی تک محدود تھے - اور اب؟ - حدیث نبویہ میں جو الکاسیات العاریات آیا ہے یعنی لباس پوش مگر برہنہ اس کی صحیح تفسیر اس دور سے قبل کیونکر کسی کی سمجھ میں آ سکتی تھی!

معصیاں سے محترز ہو، خلاف ڈنیا کرے   اور حسن عاقبت کی ہمیشہ دُعا کرے
آگے حساب کتاب، نوشت و خواند، اصول حفظ صحت، کھانا پکانے، کپڑے سینے، وغیرہ کو
درسیات نسوانی کا لازمی نصاب بتا کر آخر میں فرماتے ہیں:

دانا نے دمن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو
مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے
دُنیا میں لذتیں ہیں، نمائش ہے شان ہے
ان کی طلب میں، حرص میں سارا جہان ہے
اکبر سے یہ سنو کہ جو اس کا بیان ہے
دُنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے
حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب
آج اس کا خوشنما ہے، مگر ہوگا کل خراب

عجب دقیانوسی خیال کے تھے، آخر تک "آج" اور "کل" کے چکر میں پڑے ہیں ـ "آج" تو خیر آج ہی ہے ـ یہ "کل" آخر کیا بلا ہے! خواہ مخواہ ہر عیش کو منغص کر دینے والا! فرماتے جاتے، یہ سب کچھ تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانے ہوئے، سمجھے ہوئے تھے، کہ رفتار زمانہ کا رُخ پھیرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، انبیا تک کو یہ قدرت نہیں، مشیت تکوینی ہر صورت میں اپنا چکر، اپنا دَورہ پورا کر کے رہتی ہے ـ ہودؑ و صالحؑ کی نصیحت کس نے سُنی؟ یحییٰؑ و عیسیٰؑ پر کتنے ایمان لائے؟ لوطؑ کی تصدیق کتنوں نے کی؟ بے چارے آخر

دور میں طعنے ہی سنا کئے، شاعر ہونے، ساحر ہونے، مجنوں ہونے کے۔ آج کی اصطلاح میں VISIONERY ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کے بعد ہی عذاب الٰہی کے زلزلہ نے یک بیک دہر پکڑا ہو۔ اور مایہ ناز نظام تہذیب و تمدن کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیں ہوں۔ زار روس کی جبارّیت و شہنشاہیت مطلقہ کا چشم زدن میں مٹ کر رہنا، اس غیبی گرفت کی تازہ چشم دید مثال ہے۔ اور پھر اس سے بھی بڑھ چڑھ کر یورپ کی پہلی مہابھارت، اور یہ دوسری مہابھارت، ان سطروں کی تحریر کے وقت تک ناتمام۔

حضرت اکبر بھی اپنے مشن کی کامیابی سے مایوس تھے اور بارہا اس کا اظہار فرمایا ہے کلیات دوم میں ایک قطعہ میں آزادیٔ نسواں کے مستقبل کا مرقع کھینچتے ہیں، حسب معمول دلکش فرماتے ہیں کہ ضبط النفس، اور تقویٰ و ایمان رکھنے والے تو گذر گئے۔ اب دور دورہ ہے "صاحب کے قائم کیئے ہوئے کالج کے نوجوانوں کا" ؎

اُٹھ گئے وہ جنہیں مقدور تھا خودداری کا

نہ وہ تقویٰ نہ وہ تعلیم، نہ وہ دل کی اُمید

ولولہ لے کے نکلنے لگے کالج سے جواں

شرم مشرق کے عدو، شیوۂ مغرب کے شہید

کرکٹ فیلڈ ان کی مسجد، تھیٹر اُن کی عید گاہ۔ اس تمدن کے لازمی نتیجہ کے طور پر ؎

بحث میں آ ہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب

دور گردوں کی کہاں تک کوئی کرتا تردید

عورتوں کو "حقوق" سیاسی حقوق مل گئے۔ "مطالبات" منظور ہوگئے۔ کام وہ مردوں کے دوش بدوش کرنے لگیں ع زہرہ ممبر ہوئیں، وہ تشریف جناب خورشید

کچھ پرانے بڈھے ٹھڈے زندہ تھے، اور ڈرے ہوئے سہمے ہوئے، بولے کہ گل کھلانے کے لئے صاحبزادے کچھ کم تھے، جو اب صاحبزادیوں کو بھی اس میدان میں لایا جا رہا ہے؟ اسے

شیخ صاحب اس کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار

کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید

روشن خیال دنیا کی لعنتوں، متمدن دنیا کی لامتوں کی بجلیاں، ان دقیانوسیوں پر ٹوٹ ٹوٹ کر گریں ع نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند

اور تو اور، گھر گھرانوں کی کنواریاں، المومنات الغافلات نہیں، شوخ و بیباک کھیلی کھائی ہوتی ع لڑکیاں بول اٹھیں خود یہ طریق تائید

دو لہا بھائی کی ہے یہ راستے نہایت عمدہ

ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اور شعر تو یہ ہوا ہے، بیت الغزل، سارے قطعہ کی جان سے

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو

ہم پہ تاکید کہ پڑھو بیٹھ کے قرآن مجید

شیخ بیچارہ اس حملہ کی تاب کہاں سے لاتا، بھاگ کر حجرہ میں پناہ لی، کنڈی اندر سے چڑھا لی سے

اکبر افسردہ شد از گرئ ایں طرز سخن

شیخ بگریخت و در صومعہ خویش خزید

تجدید کی جے، تالیوں کی گونج میں پکار دی گئی، اور آدم کے بیٹوں اور حوا کی بیٹیوں دونوں نے مل کر حصول آزادی کی مبارکباد گائی سے

کھُل گیا در، نہ رہا شاہدِ مشرق کو حجاب
غُل مچا ہر سُو کہ بول اُٹھے یہ مغرب کے مُرید
للّٰہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

ایک پُرانی غزل میں بھی مضمون اس آزادیٔ نسواں کا آگیا ہے ؎

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک
جو مُنہ دکھائی کی رسم پر ہے مُصر ابلیس
تو مُنہ چھپائیں گی حوا کی بیٹیاں کب تک

مقطع میں انجام کی پیشین گوئی ہے ؎

سُنا ہے حضرتِ اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور اُن کی رُباعیاں کب تک

اسلامی نظامِ تہذیب کے جوہرِ لطیف یہی عصمت و عفت، شرم و حیا کے جذبات ہیں، اور فرنگیت کی زد بھی سب سے پہلے اخلاق کے انہیں ستونوں پر پڑتی ہے، اسلئے قدرتاً اکبر نے بھی طبع آزمائی اس موضوع پر بہت زائد کی ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی مغربیت و فرنگیت کے جو نمایاں مظاہر ہیں، اُنھوں نے تقریباً ان سبھی پر کم و بیش توجہ کی ہے۔ عبرت پذیری اُن کے قلب کا، اور عبرت آموزی اُن کے قلم کا جوہر ہے۔ اس ایک قوت کے سہارے، ہر تختۂ زمین میں نئے نئے شگوفے کھلاتے ہیں اور ہر ریگستان کو لالہ زار بنائے چلے جاتے ہیں۔
کمیٹی سازی اور جلسہ بازی کے مشغلوں میں پڑ کر دین کی طلب اور رُوح کے تعلق کے ضعف

کا عکس ذرا اکبر کے جام جم میں ملاحظہ ہو ؎

جو یہ ہر گام پہ اک دام بلا ہے در پیش!
نفس کو تو انہیں باتوں میں مزا آتا ہے
اس کشمکش میں بس روح کی لذت کا خیال
میرا اٹھ جاتے ہیں جب ذکر خدا آتا ہے

خالص دوستی، بے غرضانہ محبت، کے لفظ سیاسیات حال کے لغت میں بے معنی ہیں۔ ہندو اگر اتحاد کا ہاتھ مسلمانوں کی طرف بڑھا رہا ہے تو صرف اس لئے کہ دونوں مل کر انگریز سے مقابلہ کریں۔ انگلستان اگر روس سے لگاوٹ کر رہا ہے، تو محض اس غرض سے کہ جرمنی سے لڑنے کے لئے ایک زبردست حلیف ہاتھ آجائے۔ خود مطلبی کا نام مہذبوں کی اصطلاح میں ڈپلومیسی ہے دل سے نہ یہ ان کا شریک، نہ وہ ان کا۔ دلوں میں زہر کے انگارے بھرے ہوتے، لبوں پر میٹھے بول۔ اسلام کے شاعر کو عبرت کا یہ منظر دیکھ کر اپنے ماں کا بھولا اور بھلایا ہوا سبق الحب للہ والبغض للہ کا یاد آجاتا ہے، اور اس کے منہ سے یہ نالۂ موزوں نکلتا ہے ؎

اب تو یاری کا اسی پر رہ گیا ہے انحصار!
جس کا تو حاسد ہے اس کا جو ہو حاسد، تیرا یار
واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں
جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا
اب تو ہر اک ہے مجاور اک جدا درگاہ کا!
واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو مفود

چند روزہ متفق ہوں، ورنہ اے شیخ و ہنود

واسطے اللہ کے ہو دوستی اب وہ کہاں

۱۸-۱۹۱۷ء کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے اخباری میدان میں بحث طریقت و شریعت کے درمیان چھڑ گئی۔ شریعت کا جھنڈا لاہور میں دفتر زمیندار سے بلند ہوا۔ طریقت والوں نے دہلی کی ایک خانقاہ میں پناہ لے رکھی تھی سے مرچیں لگانا شروع کیں۔ اور جب دیکھا کہ حریف کی گولہ باری بے پناہ ہے، تو جھٹ حکومت سے درخواست مداخلت کر دی۔ اکبر نے عین اس وقت جبکہ اشتعال جذبات کا شباب تھا مصلحت شناسی، و مصالحت جوئی کے چھینٹے ڈالنے شروع کئے۔ آگ اپنے وقت پر بہرحال بجھتی ہی، (اور مدت ہوئی کہ اب اسکی خاکستر بھی باقی نہیں) البتہ اکبر کے چشمۂ اصلاح کے وہ قطرے یادگار رہ گئے۔ وہ کبھی ان شاء اللہ خشک نہ ہوں گے۔ پوری نظم ذرا طویل ہے، اقتباس ملاحظہ ہو ؎

اس وقت مولویت صوفیت سے بھڑ گئی ہے

اغیار کو ہو مژدہ، آپس میں چھڑ گئی ہے

ملّا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم!

صوفی کو یہ کہ دارم پائے چرا نہ پویم

ملّا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو!

صوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو

ملّا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے پڑھیئے!

صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھیئے!

کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن
دیکھا نہیں تھا، لیکن مُردوں پر آپریشن؟
اسوقت کیا تمہاری یہ خوش خیالیاں ہیں
آپس کی گالیاں ہیں، غیروں کی تالیاں ہیں!
شیعہ ہوں خواہ سُنی، مُلّا ہوں خواہ صوفی!
بے سُود جنگ باہم ہے سخت بے وقوفی
دیکھ ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے
موقوف کب یہ حالت آپس کے شور و شر ہے
وقت نزع باہم ہرگز نہیں ہے یارو
اللہ کو پکارو، اللہ کو پکارو!

سب سے گہرا دام لفظ "ترقی" میں ہے مغرب کا ہر عیب آج ہماری نظر میں ہنر ہے — اُس کی ہر بد روتی ہماری آنکھ میں حسن ہے، اگر ہم عیب کو عیب ہی سمجھ لیں، جب بھی کوئی صورت تو اس سے بچنے کی بھی نکالیں، سوچیں لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ معائب کو مناقب نقائص کو کمالات، سمجھ رہے ہیں، اور زہر کو تریاق کے درجہ میں رکھ رہے ہیں۔ "ترقی"، "تہذیب" "شائستگی"، "ارتقا"، "روشن خیالی" وغیرہ چند الفاظ کان میں پڑ گئے ہیں۔ یہ الٹ پلٹ کر یہی ہماری زبان پر آ رہے ہیں، یہی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔ شوق انہیں مقصدوں کی تحصیل کا، ارمان اُنہیں مقصدوں کی تکمیل کا۔ داد دیجئے، فرشتوں کے مشہور معلم کی ذہانت کی، شکار کو پھانسنے کے لئے کیا افسون کانوں میں پھونک گیا ہے ؎

شیطان نے ترکیب تنزل کی نکالی ال لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

شکاریوں کا بیان ہے کہ جب شیر کا شکار منظور ہوتا ہے تو درختوں میں بھینسے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ شیر اُن کی خوشبو پا، اُنہیں نوش جاں کرنے جلدی جلدی لپکتا ہوا، جھپٹتا ہوا آتا ہے، اور شکار کرنے کے عوض خود ہی شکار ہو جاتا ہے۔ شاعر اس تشبیہہ کو بھی اپنے کام میں لاتا ہے ؎

شیرانِ شرق کا اُنہیں منظور ہے شکار
بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

حقوقِ سیاسی کی توسیع پر مسرور ہیں اور خوش ہو رہے ہیں کہ اب ہمارے نمائندے اِتنوں کے بجائے اِتنے ہو گئے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس طرزِ انتخاب نے خود ہماری جماعت کے اندر کیسی پھوٹ پیدا کر دی ہے، باہمی رشک و حسد، بدگمانی و نفسانیت، خود غرضی، و نااتفاقی میں کتنی ترقی دے دی، اور طرح طرح کے ناجائز لالچوں، ترغیبوں کا دامن ہمارے نفس کے لئے کتنا وسیع کر دیا ہے۔ عذابِ عقبیٰ کو چھوڑیئے، یہ عذابِ دنیوی اپنے ہاتھوں مول لیا ہوا کچھ کم ہے! ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے
خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کیا کم ہے

یہی راگ ایک دوسری دھن میں سنیئے ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا	اچھے اچھے ہیں ووٹ پر شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ	سمجھیں اس کو فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی	سلف گورنمنٹ آگے آئی
پاؤں کا ہوش اب فکر نہ سر[1] کی	ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

---

[1] لفظ "سر" کا تلفظ لکھنؤ اور دہلی دونوں کی بول چال کی زبان میں "سِر" (بالکسر) ہے نہ کہ "سَر" (بالفتح)

اس جدید نظام اخلاق کو تعلق نہ والدین کی خدمت و تعظیم سے، نہ بزرگوں کی بزرگداشت سے، نہ اللہ و رسول کے احکام و حقوق سے۔ فضا ہی ایسی تیار ہو گئی ہے، ماحول ہی ایسا بن گیا ہے سہ

باپ ماں سے شیخ سے، اللہ سے، کیا ان کو کام
ڈاکٹر جنوا گئے، تعلیم دی سرکار نے

یہ شاعری شاعری نہیں، حقیقت کی ترجمانی ہے۔

آخرت کا خیال جانے دیجئے۔ یہ ارشاد ہو کہ تہذیب جدید نے اس دنیا کی زلیت کی سہولتیں کہاں تک پیدا کی ہیں؟ جینا آسان کر دیا ہے یا اور مشکل؟ جنگ، ہلاکت، غارت گری و سفاکی کے وہ حیرت انگیز آلات و وسائل، جو چنگیز و ہلاکو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے اس کے ایجاد کئے ہوئے ہیں؟ موٹر، موٹر سائیکل، ریل، لاری، ٹریم، کے روزانہ ناگہانی حادثوں نے ہر بڑے اور متمدن شہر میں موت و ہلاکت کا اوسط کچھ گھٹا دیا ہے یا اور بڑھا دیا ہے؟ روزمرہ کی ضروریات زندگی کی اس گیابی (اور اب تو جب نایابی تک پہنچ چکی ہے) کی کوئی مثال پچھلی تاریخ میں ملے گی؟ ملوں کی بھرمار، چمنیوں کی بھرمار، انجنوں کی ریل پیل، مل کے مزدوروں کی آبادی کی گنجانی، ہر وقت کی گھڑ گھڑاہٹ، ہر گھڑی کے شور و ہنگامہ دم بدم کے دھوئیں نے بڑے بڑے متمدن شہروں کی صحت کا کیا حال کر دیا ہے؟ بڑے بڑے شہروں کے شہریوں میں فیصدی کتنوں کے دانت درست ہیں؟ معدے ٹھیک ہیں؟ آنکھیں عینک سے بے نیاز ہیں؟ جو سکون قلب، آسائش و راحت، تمدن بیگانہ دیہاتیوں کو حاصل ہے۔ اس کا کوئی حصہ بھی تمدن جدید کے پُر آشوب، ہنگامہ پرور، ہیجان آفرین مرکزوں میں رہنے والوں کو نصیب ہوتا ہے؟ اس قسم کے سوالات کا حل اکبر کی ترجمانِ حقیقت زبان یوں پیش

کرنی ہے ۔

تہذیب تو جسے تم کہتے ہو اس سے کہہ بتا
دُنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے؟
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو
کیا ہو رہا ہے آخر، کیسی گذر رہی ہے؟
دِل میں خوشی بہت ہے یا رنج اور تردّد
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے؟

سُنتے آئے ہیں کہ ہر درد کی دوا علم ہے، خاک سے پاک کرنا علم کا کام ہے، محتاج کو غنی کرنا علم کا فیض ہے، بیمار کو تندرست کرنا علم کی مسیحائی ہے۔ کہیں اور کبھی بے شک یہی ہوتا ہوگا، لیکن اپنے نصیب کو کیا کہہ کر روئیے کہ یہی تریاق زہر بن گیا ہے۔ ہمیں سابقہ جس علم سے اس دور میں پڑا ہے وہی تو امراض کا مورث ہے، مفاسد کی اصل اور بدبختیوں کا منبع جسے شربت کا نام دیا گیا، وہی جام زہر نکلا۔ جسے رہبر کہہ کر پکارا گیا، وہ رہزن ثابت ہوا۔ جس نظام کو ہم نے نام "علم" و "تعلیم" کا دے رکھا ہے، وہی تو عین جہالت ہے۔ یہ تو عین وہی "علم" ہے جس کا مقصود دلوں میں حبِّ دنیا کو اور پختہ و راسخ کرنا ہے۔ خیالِ عقبیٰ و آخرت کے لئے اس تعلیم کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں۔ نصابی تعلیم کا فلسفہ خدا اور رسولؐ کے اعتقاد سے ناآشنا، اس کا سائنس مادیات کے اُوپر کچھ دیکھنے سے اندھا۔ اس کی حکمت میں جنت و دوزخ، حور و ملک کا وجود عنقا۔ اس پڑھائی لکھائی کے نتیجے جو نکلنے تھے، نکل کر رہے۔ ان پر برہم ہونا اور ساتھ ہی اس نظام کی تائید کئے جانا، تو گویا یہ چاہنا ہے کہ آگ پیدا ہو جائے لیکن اس میں جلانے کی قوت نہ ہو! پانی کا وجود ہو، لیکن وہ کسی شئے کو تر نہ کر سکے! آفتاب

نکل آئے، لیکن کوئی شعبہ اس سے متاثر نہ ہونے پائے۔ اکبر کی تنقید میں یہی نظام تعلیم تو ہے جس نے ابتری ہمارے اخلاق میں، معاشرت میں، مذہب میں، پیدا کر رکھی ہے ؎

اک علم تو ہے محبت نبھنے کا، اک علم ہے ہئی پر مٹنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند، اُس علم میں ماہر کون کسے
جب علم ہی عاشق دنیا ہو، پھر کون بتائے راہِ خدا
جب نوحہ قیامت پر ہوں فدا، تائید مسلسل کون کرے
سودا بھی ہے رنگِ طبع بشر، فطرت بھی ہیں اسباب جنوں
اکبر کو بھی جوش آ جائے، تو پھر اس کام کو آخر کون کرے

اسی حقیقت کی ترجمانی ایک دوسرے وزن و قافیہ میں ؎

مسٹر لُقّی کو عقبیٰ میں سزا کیسی ملی ۔۔۔ شرح اس کی نامناسب ہے، ملی جیسی ملی
اس نے بھی لیکن ادب سے کر دیا یہ التماس ۔۔۔ چارہ کیا تھا، اے خدا تعلیم ہی ایسی ملی

یہی مضمون ایک تیسری جگہ ؎

اس چیز کا کیا کہنا اکبر، تھا جس نے دلوں کو نیک کیا
لاکھوں ہی طبائع کو کھینچا، ہموار کیا اور ایک کیا

جو قوم کو ابتر کرتے ہیں، اب اُن کا اثر ہو دونا ہے
معلوم نہیں کیا مطلب ہے، معلوم نہیں کیا ہونا ہے
اس کا جو سبب ہے سُن لو، سب پردہ عیاں ہے ظاہر ہے
الفاظ صریح و واضح ہیں، یہ مطلع اکبر حاضر ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں، وہ کیا ہے فقط بازاری ہے

جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

فرماتے ہیں کہ ملت کی شیرازہ بندی اگر مقصود ہے تو علیگڈھ اس درد کی دوا نہیں ہو سکتا۔ ملازمت اور چپراسی کے پیکون کی ٹکسالوں کا کام تو یہ قومی کالج ضرور دے سکتے ہیں۔ لیکن قوم کا قوام تو انگریزی سے نہیں۔ عربی ہی سے درست ہو سکتا ہے۔ خشک حقیقت کو ظرافت کے چٹخاروں کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں ؎

یہ بات تو کھری ہے، ہرگز نہیں ہے کھوٹی

عربی میں نظم ملت، بی اے میں صرف روٹی

لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے

بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی

اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے

کس کی نظر ہے غائر، کس کی نظر ہے موٹی

لیکن نظم ملت و اصلاح امت کی اب پروا ہی کس کو ہے؟ یہ دین کا اب سوال ہی کیا؟ پیش نظر تو صرف دنیا اور اس کی ترقیاں ہیں۔ کونسل اور اسمبلی، اسکول اور کالج، جاہ و منصب، مشاہرہ و اعزاز۔ خودی کی پرستش سے اب فرصت کس کو جو خدا کی پرستش پر توجہ کرے۔ شاعر یہی منظر دیکھ کر صدا لگاتا ہے ؎

مذہب نے پکارا اے اکبر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

نظام کائنات میں اذیت و تکلیف کا وجود رکھا ہی اس غرض سے گیا ہے اس سے نفس میں شکستگی

و تفرع پیدا ہو۔ ذہن بجائے "اسباب" کے مسبب الاسباب کی پیدا ہو، مخلوق اپنے ہم جنسوں سے بے آس ہو کر خلوص و خضوع کے ساتھ اپنے خالق کی جانب رجوع کرے۔ چنانچہ دنیا میں جو عذاب نازل ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا فلسفہ یہی ہے۔ فطرت سلیم ایسے موقعوں پر راہ ہدایت پا جاتی ہے۔ لیکن ایسی مخلوق کی بھی کمی نہیں جو الٹا اثر لیتی ہے، اس کی شقاوت و قساوت کے لیے یہ تمام تازیانے بے اثر رہتے ہیں۔ ہر تازہ نشان غیبی، ہر جدید آیت الٰہی، ہر تنبیہ فطرت، غفلت و جمود، الحاد و اسرار میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ جو تریاق ہونا چاہیے تھا، وہ اس کے حق میں زہر کا کام دینے لگتا ہے۔ ہجوم مصائب میں بھی اس تکیہ آدمی اسباب پر، اور بھروسہ دنیوی وسائل پر رہتا ہے۔ دست سوال ہر بڑی کوٹھی کے مکین، ہر اونچے دفتر کے سر دفتر کے آگے، دراز ہوتا رہتا ہے۔ پیٹ کا سوال ہر عالیشان دفتر کا طواف کراتا رہتا ہے۔ ہر امیر، ہر وزیر، ہر بڑا افسر امیدوں کا مرکز، حاجتوں کا قبلہ بنا رہتا ہے۔ اللہ سے بے تعلقی، مصیبتوں کے ہجوم کے وقت بجائے گھٹنے کے کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے۔ اکبر اپنے گرد و پیش یہ منظر دیکھ، اپنی زبان حقیقت ترجمان سے اس پر نوحہ خوانی کرتے ہیں، لیکن خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ یاران مجلس کو درد و عبرت کے تذکروں سے واسطہ کیا۔ یہ تو اس کے نام ہی سے وحشت کرتے ہیں۔ بزم میں قدم اس شان سے رکھتے ہیں کہ چہرہ پر ظرافت کا نقاب پڑا ہوتا ہے، نشاط و زندہ دلی کا ساز ہمراہ ہے، لیکن منہ سے صدائیں درد و عبرت کی نکل رہی ہیں، اور زیر لب آواز سوز و فغاں ہی کے سروں میں آرہی ہے۔ بزم میں تماشائی[1] زیادہ ہیں، اہل نظر چند۔ تماشائی یہ سوانگ دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں، اور اہل نظر کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، ایک جھلک

---

[1] حالیؔ — اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہل نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

دیکھتے چلیے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ہم کو
دُعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

فضا کی حالت یہ ہے کہ سچی بات زبان سے نکالنا مشکل، بس جو کچھ سب کہہ رہے ہیں، وہی کہے جائیے جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں، وہی کیے جائیے جس حمام میں سب ہی ننگے ہیں اسی میں آپ بھی بلا تامل بے پردہ ہو جائیے، جب تو آپ اچھے، آپ کی باتیں اچھی، آپ کی سوسائٹی اچھی، ادھر کلمۂ حق زبان سے نکالا کہ مارے گئے، ہر طرف آوازے کسے گئے، نکالے گئے، اعزاز و عافیت کی تلاش ہے تو جو رنگ چھایا ہوا ہے، بس اسی میں چپکے سے خود بھی رنگ جائیے ؎

یہ عجب عمل، یہ عجب اثر، یہ عجیب نقش بھرے گئے
جو بچے بہت تو بچے رہے، جو کھری کہی تو دھرے گئے
تری بزم اکبرِ خوش بیاں ہے محلِ فرحت دوستاں
جو ملول آئے وہ خوش گئے، جو فسردہ آئے ہرے گئے

مذہب اور اخلاق، خدا و رسولؐ، حشر و ملائکہ کو چھوڑیئے، اس وقت ڈگری حاصل کرنے، اگریجویٹ ہونے، ڈاکٹریٹ کی سند ہتیانے، کونسل کی ممبری اچک لینے، ملازمت میں داخل ہو جانے کی دھن میں اتنے حواس بھی کسی کے نہیں، کہ خشک عقلی و علمی بحثوں پر قوتِ خوض صرف کی جائے، اور اتنی فرصت کسے کہ رومی و رازی نہ سہی سعدی و طوسی کے لئے ہی وقت نکالا جائے ؟ معیار تو صرف یہ ٹھہر گیا ہے کہ فلاں مطالعہ جلبِ زر میں، حصول جاہ میں، کہاں تک معین ہو گا ؟ اور

بس۔ یہ لمبی کہانی، اکبر کی زبانی دو لفظوں میں سن لیجیے

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض
سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا

بہر خدا جناب، یہ دیں ہم کو اطلاع
صاحب کا کیا جواب تھا، بابو نے کیا کہا.

لڑائیاں حکومتوں کے درمیان پہلے بھی ہوتی تھیں، اب بھی ہوتی ہیں۔ البتہ پہلے ان کی بنیاد تحفظ عقائد، پاس عزت، حفظ ناموس تھی۔ گویا کوئی نہ کوئی پہلو خودداری کا لئے ہوئے۔ اب دنیا اس درجہ غالب آگئی ہے کہ یہ سب آثار کر، جنگ کی محرک فقط یا ہر جگہ تجارتی رقابت رہ گئی ہے اور معاشی مسابقت! راتے ہیں سے

مذہب کے واسطے و شرافت کے واسطے
ہے اب تو جنگ حکم و تجارت کے واسطے
لے ہی گئے گھسیٹ کے مجھ کو یہ پیڈ پر
تیار ہو رہا تھا، میں جنت کے واسطے

کسی زمانے میں ہمیں تعلیم یہ ملی تھی کہ راہ خدا میں کچھ کرو، حتی الامکان خلق کی نظر سے پوشیدہ کر کے، اور جو کچھ بھی خیرات کرو، اس سے مقصود بس اللہ کی رضا جوئی ہو، نہ کہ بندہ پر کوئی احسان، لیکن اب حالت یہ ہے کہ چندہ لکھوایا جاتا ہے اور اعلان پہلے کیا جاتا ہے، جلسوں میں بھی، تالیوں کی گونج کے درمیان، اور پھر اخبارات کے ذریعہ سے بھی، بلکہ بہت سی صورتوں میں تو بس اعلان ہی اعلان، وعدہ ہی وعدہ رہتا ہے، اس سے آگے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ اور پھر اس "کار خیر" سے مقصود کیا ہوتا ہے؟ عموماً و بیشتر یہی نہ کہ خلاف

انجمن کی صدارت، فلاں مدرسہ کی سرپرستی ہاتھ آجائے؛ فلاں پارٹی پر اثر اور اپنا حق قائم ہو جائے؛ یا پھر یہ کہ چندہ خان بہادری کے، آنریری مجسٹریٹی کے، نائٹ ہڈ کے غرض کسی معزز منصب یا خطاب کی قیمت سمجھ لیا جائے، شاعر اپنے چاروں طرف یہ سماں دیکھ کر حسرت و یاس کی لے میں پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ دیکھنا نہیں ہیں دلِ زار کے لئے

جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

ایک دوسری جگہ عبرت و حسرت کے اس گنجینہ کو شوخی و ظرافت کے دوشالہ میں ڈھانپ کر پیش کرتا ہے ؎

چرخ نے پیشِ کمیشن کہہ دیا اظہار میں

قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں

بیبیاں اسکول میں ہیں۔ شیخ جی دربار میں

انتشارِ ملت کی اس سے صحیح تر تصویر اور کیا ہو گی؟

حمایت مذہب کے دعوے، اب بھی زبانی بہت کچھ کئے جا رہے ہیں، لیکن عموماً اس طبلِ بلند بانگ کے پیچھے حقیقت کیا ہوتی ہے؛ یہی نہ کہ ذاتی مخالفتوں، مخاصمتوں کی تسکین کا موقع ہاتھ آئے اور مخالف کی رسوائی اور بدنامی جی بھر کر ہو رہے۔ مخالف اگر "وہابی" ہے تو آپ اس کی ضد میں صوفی اپنے کو کہنے لگئے، اور اس کی وہابیت کو خوب خوب اچھالئے۔ حریف اگر "بدعتی" ہے تو آپ اس کے جوڑ پر اتباعِ سنت کے مدعی ہو جائیے، اور اس کے بدعتی ہونے کو خوب چمکائیے، خوب پھیلائیے۔ اکبر کا قلم یہ سادہ تصویر یوں پیش کرتا ہے، بلاغت کے رنگین

نقش اس پر اضافہ ہے

ہادی کے کبھی پیرو نہ ہوئے، ہاں اس کے لئے لڑ تو سکے

مذہب نے ہمیں پہچان لیا، ہم اس کو نہیں پہچان سکے

خدا فراموش نظامِ معیشت اور خود پرست آئینِ معاشرت کے اختیار کر لینے کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ اس ومافیت کا نشان نہ رہا، انبساطِ قلب و سکونِ خاطر کے الفاظ بے معنی رہ گئے، آئینِ ہمدردی کے بجائے فلسفۂ "تنازع البقا" اور "کارزارِ حیات" کا رائج ہو گیا۔ زندگی کی ضرورتیں گراں ہوتیں، بدکاریاں ارزاں ہوتیں، الائتیں بڑھیں، عمریں گھٹیں، ہیجان میں بیشی، اطمینان میں کمی آئی، محبتیں میں، خصومتیں ابھریں۔ خدا فراموشی کا نتیجہ یہ ہونا ہی تھا کہ زندگی تلخ ہو جائے "تمدن و تہذیب" کی اس زندگی سے عقبیٰ جیسی سنورتی ہے اسے تو کل پہ اٹھا رکھیے۔ آج کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ دنیا برباد ہوئی جاتی ہے۔

گلشنِ مشرق کا باغبان اپنی آنکھوں سے اپنے چمن کی بربادی دیکھتا ہے، اتنا بس نہیں کہ صیاد کا ہاتھ پکڑ سکتے، ہاں اپنے اوپر تو کسی حد تک اختیار اب بھی باقی ہے۔ زبان پر مرثیہ ہے، لب پر آہ ہے، آستین آنکھوں پر ہے، اسے ہٹا کر دیکھیے تو کچھ بوندیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، ممکن ہے مستقبل کا جوہری ان موتیوں کی کچھ قیمت لگا سکے

ہم کو تری روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں

باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں

ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل

گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں

ٹانکے وہ لگ رہے ہیں جو کر دوڑں میں ٹوٹیں

بخیے جو فطرتی تھے، وہ اب اُدھڑ رہے ہیں
سطح زمیں سے پوچھو کیا مل رہا ہے اُس کو

نظروں میں پھلجھڑی ہے گو پھول جھڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی

لیکن اُمید کیا ہو جب دل اُجڑ رہے ہیں
یہ زیور معانی کس کی کرینگی زینت

لفظوں میں یہ نگینے کیوں آپ جڑ رہے ہیں

فلسفہ کو چھوڑیئے کہ یہ تو خود ہی ظنیات و احتمالات کی بھول بھلیاں ہے۔ سائنس کو لیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قطعیات و یقینیات کا عادی ہے اور سائنٹفک ترقیاں مخصوص فیض ہیں تمدن جدید کا۔ لیکن یہ ارشاد ہو کہ یہ آلات اور نت نئی ایجادات والی ترقیوں سے دنیا میں برکتیں زیادہ پھیلی ہیں یا لعنتیں؟ مجموعی طور سے اُن سے اب تک دنیا کے خیر و مسرت و راحت میں اضافہ ہوا ہے یا جنگ و جدال میں، قتل و غارت میں، جعل سازی اور دھوکہ بازی میں؟ ان سے تحریک و تقویت انسان کے جذبات ملکوتی کو زیادہ پہنچی ہے یا جذبات بہیمی کو؟ شاعر کے ذہن میں یہ سب واقعات و مشاہدات محفوظ ہیں۔ آہ سرد کے ساتھ وہ "صاحب" اور "صاحب" کے لائے ہوئے سائنس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہم نے تو اپنا اخلاق، اپنا جوہر شرافت، سب آپ کی خوشی پر نثار کر دیا تھا، اپنوں کو بیگانہ بنا لیا تھا، لیکن اب جو نظر پھیر کر دیکھتے ہیں تو آپ کی تشریف آوری سے اُلٹی مصیبتیں ہی بڑھ کر رہیں ۔

مرے عمل سے نہ شیخ خوش ہیں، نہ بھائی خوش ہیں، نہ باپ خوش ہیں
مگر میں سمجھا ہوں اس کو اچھا، دلیل یہ ہے کہ آپ خوش ہیں
جو دیکھا سائنس کا یہ چکر، دھرم پکارا کہ اے برادر
ہمارے دورکیں پن مگن تھے۔ تمہارے دور ے ہیں باپ خوش ہیں

مشرق و مغرب کا جو فرق ہے وہ شرق و مغرب کا فرق ہے۔ بُعد المشرقین ہے۔ مجز تباین یہیں نہیں، کلیات میں ہے فروع میں نہیں اصول میں ہے، عرض میں نہیں، جبلت و سرشت میں ہے۔ وہ مادیت میں مست ہیں، ہم روحانیت میں غرق۔ وہ تجارت و ثروت کے گھوڑ دوڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ ہم صبر و قناعت کے حجرہ میں فقر کی کملی لپیٹے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کے چپہ چپہ سے واقفیت کی دھن میں ہیں، ہمیں اپنے عرفان نفس کی کوششوں سے کہاں فرصت وہ اس پر تلے ہوتے ہیں کہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کرکے رہیں گے، ہم اپنے سفر میں کائنات مادی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں وہ مادہ کے ایک ایک قانون کو دریافت کرکے اچھل پڑتے ہیں کہ "انسان کی اصل بندر ہے"۔ ہم بدمستی و بیہوشی میں بھی نعرہ لگاتے ہیں تو یہ کہ "انسان خدا میں گم ہے"۔ اکبر اس سارے دریا کو کوزہ میں بند کرکے پیش کرتے ہیں ؎

مشرقی کو ہے ذوق روحانی — مغربی میں ہے میل جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — "فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست"

اکبر زے واعظ نہ تھے، حکیم اخلاق بھی تھے، راہ راست کی جانب اشارہ کرکے خاموش ہو جانے والے نہ تھے، راستہ کی پیچیدگیوں، راہ رو کی الجھنوں سے بھی واقف تھے اسلئے مسافروں

کو راہ کے پیچ و خم، منزلوں کی مشکلات کی بابت بھی ہدایتیں دیتے جاتے ہیں۔ اخلاق کے اکثر مرحلے بڑے ہی پیچیدہ واقع ہوتے ہیں، حساب کے پہاڑے نہیں کہ چھوٹا بچہ بھی آنکھ بند کر کے رٹ ڈالے۔ جذبات کی کشش ایک سمت ہوتی ہے، عاقبت اندیشی کا فتویٰ دوسری جانب۔ اور پھر خود جذبات کے اندر بھی باہمی آویزش کشمکش۔ اکبر کہیں کہیں ان گتھیوں کو بھی سلجھاتے گئے ہیں جا بجا اُن کی حکیمانہ فکر و عارفانہ نظر نے اخلاق و معاشرت کے محض جزئیات ہی کو نہیں، بلکہ فلسفہ، اخلاق کے اُصول کو لیا ہے، اور بنیادی مسائل کو کھول کر رکھ دیا ہے۔

شباب کی بدمستیاں و بے احتیاطیاں کس نوجوان اور پختہ عمر والے کو نہیں معلوم! ساتھ ہی مذہب و اخلاق کی عدالت کا فیصلہ بھی سب پر روشن ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ کُل چار مصرعوں کے اندر (بھلا چار مصرعوں کی بھی کوئی لمبائی ہے؟) پہلے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ کھینچتے ہیں، آپ ابھی اسی کو دیکھتے ہوتے ہیں کہ وہ مرض کی ایک ایک علامت بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ اُن کی داد ابھی دینے بھی نہیں پاتے کہ جھٹ پٹ وہ ایک نسخۂ شفا بھی تجویز کر ڈالتے ہیں! مکمل تشخیص اور علاج کُل چار مصرعوں میں:

نیچر کو ہوتی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رنگ پری

شیطاں نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو یہ ہے زانی ہی سہی

نیچر کی طلب بالکل ہے بجا، اور نفس کی خواہش بھی ہے روا

شیطان کا ساتھ البتہ برا، اور خوف خدا ہے اس کی دوا

دین و مذہب کی تحصیل بہتوں نے محض ایک علم یا فن کے طور پر کرنا شروع کی ہے۔ یعنی بجائے اس کے کہ اس کو برتیں، اُسے اپنی زندگی میں نباہیں، اُسے ایک مسلکِ حیات قرار دیں۔

مومن اس کے کچھ مسائل یاد کر لیتے ہیں بمقصد ان معلومات پر عمل کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانا ہوتا ہے یا پھر دوسروں کی لت اڑانا۔ اکبر کا قول ہے کہ مذہب و اخلاق سے فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جبکہ ان کی تعلیمات پر عمل کر کے انہیں جزو زندگی بنالیا جائے، نہ یہ کہ ان کے قیل و قال سے کام محض گرمی محفل کا لیا جائے۔ لیکن عمل میں ظاہر بینوں کو لذت کہاں نفس کو لذت تو دوسروں ہی کے بتانے پڑھانے سکھانے میں آتی ہے ۔

علم دین حاصل کیا لیکن قباحت یہ ہوئی!
صرف سکھلانے میں لذت ہی عمل میں کچھ نہیں
زیست کا مصرعہ ہے خود آہِ سوزاں ہے تخلص
ورنہ اے اکبر نری نظم و غزل میں کچھ نہیں

مذہب کا لیبل چپکا لینے، مذہب کا محض نام رٹ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل شئے ایمانیات میں عقیدہ توحید ہے، اور اعمال میں درستی اخلاق۔ جب یہ حاصل ہے تو سب کچھ حاصل ہے جب یہ نہیں حاصل، تو کچھ بھی نہیں حاصل۔ باقی سب لفاظیاں اور اصطلاحی بولیاں ہیں ۔ مرنے نیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں!

جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں، جو برے ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت، لو لگی ہے جن کی خالق سے
نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

مذہب کی حیثیت انفرادی سے زیادہ جماعتی تھی تو پہلے بھی، لیکن اب تو کہنا چاہیئے کہ یہی جماعتی حیثیت اور سب حیثیتوں پر غالب آگئی ہے۔ کوئی شخص اگر عیسائی ہے تو اس کے

معنی اب یہی رہ گئے ہیں کہ اس کا میل جول، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔ اس کے طور طریقے فرنگیوں کے سے ہوں گے، سال میں "بڑا دن" منائے گا، خوشی کریگا کیک کھائے گا۔ ہفتہ میں اتوار کو کام کاج بند رکھے گا۔ بلنے جلنے میں لہجے گا۔ عجب نہیں کہ گرجا بھی ہو جائے۔ کوئی صاحب اگر شیعہ ہیں، تو معنی یہ ہیں کہ محرم میں مجلس کریں گے عزاداری ماتم میں پیش پیش ہوں گے۔ آمد و رفت شیعوں کے ہاں رکھیں گے کوئی بزرگ اگر سُنی ہیں، تو میل جول اہلِ سنت سے رکھیں گے، مدحِ صحابہؓ کے جلسہ جلوس میں شریک ہوں گے، گھر کی ریت رسم سنیوں کی سی رکھیں گے کسی شخص نے تبدیل مذہب کر دیا تو اس کے معنی اب یہ ہوتے ہیں کہ اس نے اپنی سوسائٹی بدل دی، اپنے جماعتی ماحول میں تغیر کر دیا۔ فلاں فلاں کے بجائے فلاں فلاں سے تعلقات اور رابطے بڑھ گئے۔ عقاید کا سوال بالکل دوسرا ہے۔ اس کا تعلق صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہے۔ یہاں گفتگو مذہب کے صرف ظاہری، معاشرتی، و مجلسی پہلو سے متعلق ہے۔ اس لئے اکبر کہتے ہیں کہ معتقدات کی کرید کی حاجت دنیا کو بالکل نہیں۔ دنیا کے دیکھنے کی بات تو صرف اتنی ہے کہ وضع اور طور اعمال اور اخلاق کیسے ہیں ؎

مذہب ہے امرِ قومی سمجھو نہ فعل ذاتی
مجبور سب ہیں اس میں، گنگو ہوں یا وفاتی

شیعہ ہوں خواہ سُنی، لالہ ہوں یا برہمن!
مذہب کو مورثوں سے سب پلتے ہیں عموماً

پولٹیکل ضرورت بے شک تھی اس کی اول
اب اس طرف توجہ لازم ہے صرف سوشل

چھا بُرا نہ کہہ دو تم مذہبی بسنا پر

اخلاق اس کے دیکھو ہے اصل تو یہ جوہر

تعلیم جو ہے عمدہ صحت اگر ہے اچھی

پاؤ گے اس کو اچھا، طینت اگر ہے اچھی

ناری ہے یا کہ ناجی اس کا بیاں نہیں ہے

سوشل طریق یہ ہے، اور وہ تو راز دیں ہے

دُنیا کا قانون تکوینی کچھ ایسا رکھ دیا گیا، کہ ایک کے بڑھنے کے معنی دوسرے کے گھٹنے کے ہوتے ہیں، ایک آج ملازمت سے موقوف ہوا، یا نپش پر بیٹھا اُس کے گھر میں ماتم برپا ہوتا ہے۔ لیکن جس نے اس کی جگہ پائی۔ کوئی اس کے گھر میں دیکھے، کیسے شادیانے بجتے ہوتے ہیں۔ پُرانی آبادی ویران کر کے، محکمہ آسائش بلدہ وہاں ایک خوش نما و خوش فضا پارک بناتا ہے۔ خلقت وہاں تفریح کے لیے اُمنڈ اُمنڈ کر جمع ہوتی ہے، اور ہر وقت ہنسی بولتی ہستیوں کا مجمع لگا رہتا ہے لیکن ادھر بھی کبھی خیال کیا گیا ہے، کہ کتنے بھرے پُرے گھر مسمار ہو لیے ہوں گے۔ جب جا کر یہ قطعہ زمین پارک کے لیے نکلا ہے اُن ہنستے بولتے گھر والوں پر کیا کچھ گذری ہو گی اپنے اپنے پیارے گھروں کو چھوڑتے وقت۔ اپنے گھروں سے بے گھر ہوتے وقت انہیں کھدتے دیکھ کر، اپنی کھیل کود کی جگہ پر اپنے کھانے پینے، لیٹنے سونے کی جگہ پر پھاوڑے چلتے دیکھ کر، انہیں خاک میں اَٹتے اور تپتے دیکھ کر! فاتح اپنی فتحمندیوں کا جشن مناتا ہے، بھولا ہوا، بالکل بھولا ہوا، کہ کتنی سہاگنیں بیوہ ہو گئیں کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ کتنے خاندان برباد اور کتنے گھر بے چراغ!

یہ بات ہے صداقت مجسّد سے سُن لے، کتابیں اس کو کیا پڑھے گا
فدود دُنیا کے ہیں مُعیّن، جو یہ گھٹے گا تو وہ بڑھے گا

انسان معصیت سے باز اگر کبھی رہتا ہے تو عموماً اسی وقت، جب خود گناہ ہی کی قوت سلب ہو چکی ہے، ورنہ جب تک قوت و سامان موجود ہے نفس پرستیوں اور سیہ کاریوں کا سلسلہ ذرا مشکل ہی سے موقوف ہوتا ہے ؎

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے
مگر اس بزم میں پیچ یہ ہے کہ جی ہاں ہے بہت
وعظ تقویٰ نہ کہو، رحم کرو اکبر پر
چشم بد دُور، ابھی طاقت عصیاں ہے بہت

نیکی اور بدی پہ آخرت میں ثواب و عذاب جو کچھ بھی مرتب ہو، وہ تو ہو گا ہی، ایک بیّن فرق دونوں کے درمیان تو اس دُنیا میں بھی محسوس ہوتا ہے کہ طاعت کے بعد طبیعت میں شگفتگی اطمینان، سکون پایا جاتا ہے، اور معصیت کے بعد طبیعت کو اضطراب لاحق رہتا ہے ؎

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب
دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

محض کتابی معلومات، انسان کے جوہر باطن کو صیقل نہیں کر سکتے، اس کے لئے اچھی صحبت لازمی ہے زندگی پر اثر زندہ شخصیت ہی کا پڑتا ہے۔ ایمان میں، قوت عمل میں رسوخ زندہ معلم ہی کے واسطے سے نصیب ہوتا ہے۔ عالم بے عمل وہی کہلاتے ہیں، جن کے دماغ کتابی معلومات سے لبریز ہیں۔ لیکن دل غفلت کی نیند سو رہے ہیں ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

جستجو ہم کو آدمی کی ہے   وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

ایک اور موقعہ پر ؎

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے

رہئے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

انسان کو اپنے خلاف مزاج دنیا میں ہزارہا واقعات ملتے رہتے ہیں، لیکن کارخانۂ دہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا اس کے بس کی بات نہیں، یہ نظام کائنات تو اس کی مرضی کا نہیں کسی اور ہی کی مشیت کا پابند ہے، اسلئے مآل اندیشی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان ہر نا ملائم واقعہ پر، ہر حادثہ پر، صبر و تحمل، بلکہ رضا و تسلیم سے کام لے۔ یہی اصول ایسے ہیں جو زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دیں گے ؎

اپنی مرضی کے موافق دہر کو کیوں کر کروں

بے حد آتا ہے مجھے غصّہ مگر کس پر کروں

چل بسے چھوٹے بڑے، تناجن سے لطف زندگی

مجھ کو کس کو ناز ہے، میں ناز اب کس پر کروں

وصل کی شب حسب موسم ہو ہی جاتے گی بسر!

لطف اٹھاؤں یا درازی کی دعا شب بھر کروں

سارا کائنات کا ذرہ ذرہ کسی خاص غایت و مصلحت کے ماتحت حرکت کر رہا ہے، ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل کا معاوضہ کسی نہ کسی صورت میں مل کر رہے گا۔ ہر مبتدا کی خبر ضرور نکلے گی۔ ہر ادنیٰ سی ادنیٰ حرکت کوئی نتیجہ ضرور پیدا کر کے رہے گی۔ انسان اگر اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھے، اور دل کو عیش و عشرت کی غفلتوں میں نہ پھنسنے دے تو زندگی بڑے امن و عافیت کے

ساتھ گزر سکتی ہے۔ جام حیات میں تلخی پیدا کرنے والی ہماری ہی فراموش کاریاں، غفلت شعاریاں ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کو ایک مسلسل غزل میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے ؎

اکبر اس فطرتِ خاموش کو بے حس نہ سمجھ

ہاں بصیرت سے تہی، دیدۂ نرگس نہ سمجھ

راحتِ زیست کے سامان سے دھوکے میں نہ آ

امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ

جاہ و منصب میں نظر عاقبتِ کار پہ رکھ!

خاتمہ جس کا ہو افسوس، اسے آرس نہ سمجھ

صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حُسنِ عمل

بہر انجام یہ امرت ہے، اسے بس نہ سمجھ

دِل کا دُنیا کی اُمیدوں سے بہلنا ہے بُرا

زندگی تلخ جو کر دیں، انہیں مونس نہ سمجھ

تعصب اور غصہ کے جذبات عموماً تنگ نظری کی بنا پر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کی نظر جوں جوں وسیع ہوتی جاتی ہے، دل میں ہمدردی، رواداری، دوستوں کی ہوا خواہی زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے۔ البتہ فطرت کی نیرنگیوں، مشیت تکوینی کی عجائب کاریوں، علم مطلق کے مظہروں کو دیکھ کر حیرت ضرور طاری ہوتی رہتی ہے ؎

شیخ جی کی نظر میں میں ہوں فقط میری نظروں میں ساری دُنیا ہے

بس یہی وجہ ہے کہ اے اکبر مجھ کو حیرت ہے، اُن کو غصہ ہے

علائق دنیوی کی جتنی کثرت ہوگی، اسی نسبت سے سامانِ غم و الم بھی بڑھتے رہیں گے۔ امن و عافیت

مقصود ہے تو دنیوی تعلقات کو جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے ۔

ایک جو تہ ہے ایک پچھلا ہے کام دنیا کا یونہی چلتا ہے
دل تعلق بڑھا کے پچھتایا پاؤں پھیلا کے ہاتھ ملتا ہے

انسان دوسرے کی عیب چینی ونقص جوئی میں تو بہت پیش پیش رہتا ہے، لیکن خود اپنی کمزوریوں اور خطاکاریوں کی جانب کبھی بھولے سے بھی توجہ نہیں کرتا۔ اس کو کس پرلطف انداز سے اداکرتے ہیں ۔

میری نسبت جو ہوا ارشاد، وہ میں نے سنا
یہ تو کہیئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

انسان کی نسبت سب سے زیادہ صحیح رائے خود اس کا ضمیر قائم کرسکتا ہے کہ وہی اس کی اصل کمزوریوں سے واقف ہوتا ہے۔ انسان ساری دنیا کو دھوکہ میں ڈال سکتا ہے، لیکن خود اپنے ضمیر سے کوئی شے مخفی نہیں رکھ سکتا ۔

نہ پھول اس پر کہ یار اور وہ تجھے ایسا سمجھتا ہے
تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

اخلاق کی صفائی نفس کے تزکیہ کے لئے محض گوشہ نشینی کافی نہیں، اصل شے قلب کی بے تعلقی ہے اور اس کا مدار عمل پر ہے اچھی باتوں کے داد دینے والے بہت سے مل جاتے ہیں سو دل سے ماننے والے ان پر عمل کرکے دکھا دینے والے، کم ہی نکلتے ہیں ۔

حرص دنیا سے نہیں ہر صاحب عزلت بری
خانقاہیں اور ہیں، اور دل کا کرنا اور ہے

ہ حسنِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند

خوب کہنا اور شے ہے، اور خوب ہونا اور ہے

نفسِ بشری کی ایک خاص کمزوری دنیا پر ہمیشہ سے مسلط رہی ہے، اور اب تو بہت ہی بڑھی ہوئی، پھیلی ہوئی۔ انسان دوسروں کی بدکاری پر انہیں برا بھلا کہہ لینا اپنے لئے بالکل کافی سمجھتا ہے، اور خود اپنی اصلاح کی طرف ذرا توجہ نہیں کرتا۔ گویا عبادت و حسنِ عمل کا بنیادی پتھر، اللہ کی حمد نہیں، شیطان پر لعنت بھیجنا ہے۔ یہ صورتِ حال اکبر کے فلسفۂ اصلاح سے بالکل مخالف ہے۔ اہلِ فرنگ اگر ہمیں ناتواں و بے بس پاکر، ہمیں اپنا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہیں تو اس کا یہ علاج ہرگز نہ صحیح ہے نہ کافی، کہ ہم بس انہیں کوستے کاٹتے رہیں، ان کے طور طریق پر لعنت بھیجتے رہیں۔ ہم کو اصل فکر اپنی ترقی و اصلاح کی کرنا چاہیئے۔ حضرت اکبر فرماتے ہیں کہ شیطان نے اس شیطانی دور میں شیطنت کی یہ ترکیب خوب نکالی ہے کہ اللہ کے کچھ بندوں کو بس اس پر لگا دیا ہے کہ وہ شیطان پر لاحول پڑھنے ہی میں لگے رہیں، اور حمد و مناجات توحید و حسنِ عمل کے لئے وقت ہی نہ نکال سکیں ؎

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی

خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو برا کہیئے

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں کہ حریف اگر ہمارے اوپر ستم پہ ستم توڑ رہا ہے، اور ہم ایں کہ بجائے اپنی اصلاحِ حال و تصحیحِ اعمال کے محض اس پر لعنت بھیجنے میں لگے ہوئے ہیں، تو نتیجتاً، ہم اور وہ دونوں ہوکر رہیں گے۔ قانونِ فطرت، انتقام دونوں سے لیگا۔ حریف سے اس کی زیادتیوں کا۔ ہم سے ہماری کوتاہیوں کا۔ اُس سے اقدام جور و ستم کا، ہم سے غفلت و جمود کا، عدو کی تباہی، ہماری فلاح کی خود بخود مستلزم ہرگز نہیں ؎

یہی خصائل یہی طبیعت رہی اپنی تو قسمت یہی رہے گی
زمانہ بدلے گا بھی تو پھر کیا ہماری حالت یہی رہیگی

یہی سیہ کاریاں اگر ہیں تو از صبح امید کیا
یہی ہے زلف بتاں کا سودا تو میری شامت یہی رہیگی

عمل جب اپنے نہیں ہیں اچھے تو ذکر عصیاں عنبر کیا
عدو کی قسمت بگڑ بھی جائے تو اپنی قسمت یہی رہے گی

سکون خاطر و اطمینان قلب اگر مقصود ہے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے، سارے اولیا انبیا کا بتلایا ہوا، سمجھایا ہوا راستہ ع۔ صد ہزاراں پیر بر وے متفق
یعنی دنیا سے بحیثیت دنیا کے بے تعلقی و بیزاری۔ دل میں تو او رلگن کسی او۔ ہی کی لگی رہے۔
باقی ہاتھ پیر، چلتے، پھرتے حرکت کرتے، اسی دنیا میں رہیں، بقول عارف رومؒ ؎

ہیچ کنجے بے دد و دام نیست ! جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

یہی نصیحت بیسویں صدی کے اس عارف نے بھی کی ہے ؎

جو اہل دنیا کا رُخ کروگے سکون خاطر کبھی نہ ہوگا
شریک غفلت بہت ملیں گے شریک عبرت کوئی نہ ہوگا

یہی ہے مذہب کا حسبنا و اعلم کہ دین دنیا پہ ہو مقدم
نئے طریقے ہیں لیکن ان سے درست ہوگا سب کچھ یہی نہ ہوگا

صدیوں پیشتر اس آوازۂ حق کی منادی کردی گئی تھی کہ اطمینان قلب و راحت دل صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان کامل رکھتے ہیں، اور اپنی بدعملیوں سے اپنے ایمان کو زنگ نہیں لگاتے۔ اکبر کی آواز بھی اسی آوازۂ حق کی صدائے بازگشت ہے خلقت کی اصلاح دنیوی

کا راستہ بتاتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کلام مجید کے اوراق سامنے کھلے ہوئے ہیں، انہیں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا کان لگا کر تو سنئے

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیونکر اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر[۱]

اسباب کرے جمع خدا ہی کا یہ ہے کام طالب ہو خدا ہی سے دعا ہی کا ہے یہ کام[۲]

بے طاعت و نیکی نہیں تاثیر دعا کچھ آنے کی نہیں کام فقط حرص و ہوا کچھ[۳]

منظور مفاخر کا اگر تجھ کو سبق ہے تخصیص تری کیا ہے حریفوں کو بھی حق ہے[۴]

یہ کشمکش فطرت دنیا ہے مسلسل اک آج اگر صاحب طاقت ہے، تو اک کل[۵]

---

[۱] "جو بھی مصیبت تمہارے اوپر آئی ہے خود تمہارے ہاتھوں آئی ہے" (سورہ شوریٰ رکوع ۴) "تمہیں کچھ بھی برائی پیش آتی ہے خود تمہارے نفس کی لائی ہوئی ہے" (سورہ نساء رکوع ۱۱) خدا کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے (سورہ رعد رکوع ۲)

[۲] "خدا ہر قسم کی فراہمی اسباب پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں" (سورہ کہف رکوع ۵) "ساری قوت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے" (سورہ بقرہ رکوع ۲۰) "حکومت و اختیار خدا کا ہے" (سورہ یوسف رکوع ۵)

[۳] مسلمانو، فلاح عاقبت نہ تمہاری تمناؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر بلکہ عمل پر موقوف ہے پس جو شخص برا کرے گا، اس کی سزا پائے گا" (سورہ نساء رکوع ۱۸)

[۴] وہی خدا تو ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا، تمہیں میں کافر بھی اسی نے پیدا کئے اور مومن بھی" (سورہ تغابن رکوع ۱) [۵] "ہم یہ زمانہ حکومت و کامرانی باری باری لوگوں کو دیتے رہتے ہیں" (سورہ آل عمران رکوع ۱۴)

نیکی کی طرف رُخ ہو یہی ناموری ہے   کھوٹے کو جُدا کر دے، وہی بات کھری ہے[1]

لیکن یہ سارا دفتر وعظ و پند، یہ ساری شاعری و بلاغت، یہ ساری فلسفہ سنجی و نکتہ آفرینی ایک طرف، اور فطرت کی رفتارِ تکوینی، مشیت الٰہی کا رُخ دوسری طرف، مشیت نے بڑے بڑے انبیاء و رسل کو ظاہری نتیجہ کے اعتبار سے ناکام رکھا جس حکمت تکوینی نے خدا معلوم کتنے ہی معرکوں میں صورت و ظہور کے اعتبار سے کفر کو ایمان پر، اور ظلمت کو نور پر غالب رکھا۔ اس کی عادت میں بیسویں صدی کے ایک مصلح شاعر کی خاطر فرق کیونکر پڑ سکتا تھا؛ ہدایت و گمرہی کے دور کا آخری سلسلہ انسان کے نہیں، انسان آفرین کے ہاتھ میں ہے۔ اس کارخانہ کائنات کی بنیاد جس غفلت پر رکھی گئی ہے، اسی پہ کارخانہ برابر چلتا رہے گا، پیمبروں جیسی مقبول و برگزیدہ ہستیاں جب فطرت کی رفتار کو نہ بدل سکیں تو کسی شاعر غریب کی بساط ہی کیا۔ اکبر بھی اس تماشا گاہِ عالم میں اپنا جلوۂ حسن وادا، کمال و جمال کے ساتھ ادا کر کے رخصت ہو گئے، لیکن چلتے چلتے یہ بھی کہہ گئے کہ زمانہ کا رُخ میری یا کسی کی بھی تبلیغ سے نہیں پھر سکتا، چند ہی روز میں یہ حال بھی ماضی بن جائے گا، یہ "آج" بھی "کل" میں تبدیل ہو جائے گا۔ حال کی تازگی ماضی کا افسانہ پارینہ بن جائے گی۔ اس وقت کوئی نوحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔ احساسات خود ہی تبدیل ہو چکیں گے، عیب ہنر بن جائیں گے، اور کمال کا نام بے کمالی پڑ جائے گا۔

عقل کو جُنوں کا لقب دے کر پکاریں گے اور جُنوں کی تعبیر عقل سے کریں گے ؎
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

---

[1] تم میں جو سب سے زیادہ پاکباز ہے، وہی خدا کے نزدیک سب سے معزز ہے گا۔ (سورہ حجرات رکوع ۲) "جو لوگ عزت کے خواستگار ہیں، سو عزت تو ساری کی ساری صرف خدا ہی کی ہے۔" (سورہ فاطر رکوع ۲)

کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ کونسی چیز گم ہوگئی عنفوان شباب کی لذتوں اور مستیوں میں پڑکر یاد بھی کس کو رہ جاتا ہے، کہ ہائے کیسی معصومیت کا زمانہ رخصت ہوگیا، بے فکری کا وقت کیسا خواب و خیال بن گیا! اور نئی نئی فکروں ذمہ داریوں کا کتنا سخت بوجھ سر پر آپڑا ہے! آنکھ کھلتی ہے مگر کب؟ جب وقت ہاتھ سے نکلے ہوتے بہت عرصہ ہوچکا ہوتا ہے عجب نہیں کہ کچھ ویسا ہی حشر ہماری موجودہ معاشرت کا بھی ہو۔ اکبر کے جام جم میں اس قلب ماہیت کے ایک ایک جزیہ کا عکس موجود ہے۔ بہتر ہوگا یہ مرثیہ کا آخری بند سنا کر مجلس کو کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کردیا جائے[1]

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے

نئی تہذیب ہوگی اور نئے سامان بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسین اپنی

نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

---

[1] افسوس کہ وہ "دوسرا وقت" کہیں نہ آیا مضمون کی تقسیم شروع میں پانچ حصوں میں کی گئی تھی اور پانچویں حصہ کا عنوان "تصوف، معرفت، فلسفہ" تھا لیکن مضمون جب ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں رسالہ آرزو میں نکلا، تو صرف چار ہی حصے نکلے، اور پانچواں حصہ سارے کا سارا چھپنے سے باقی رہ گیا تھا اب ۱۹۴۳ء میں نظر ثانی کے وقت اتنی ہمت نہ ہوئی کہ تکملہ کے لئے پوری محنت ایک مستقل مقالہ کی گوارا کی جائے۔ یوں ہی بہت زیادہ وقت نظر ثانی کی نذر ہوگیا تھا، مضمون اسی طرح ناتمام صورت میں شائع ہوتا ہے! دنیا میں خدا معلوم کتنی خیالی اسکیمیں اور کتنے منصوبے اسی طرح ناتمام رہ جاتے ہیں اور انسان انہیں چھوڑ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوجاتا ہے! اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! (عبدالماجد مئی ۱۹۴۴ء)

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردہ کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامان غم ہونگے

•

عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے

بدل جائے گا معیار شرافت چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے

تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

اُردو کا ایک بدنام شاعر[1]

یا

گنہگار شریف زادی

لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ "جانِ عالم" کا لکھنؤ۔ زمانہ یہی اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط کا۔ آج سے کوئی ستر پچھتر سال قبل۔ ہر لب پر گُل کا افسانہ، ہر زبان پر بُلبُل کا ترانہ۔ ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوشِ تمنا۔ ہر شام میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گانے بجانے کی دھوم۔ یہاں رہس کا جلسہ، وہاں اندر سبھا کی پریوں کا پرا۔ اِدھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں، اُدھر گلے سے تانیں اور ہاتھوں سے تالیاں۔ گلی گلی "جنت نگاہ و فردوس گوش" چپہ چپہ "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش"۔ بڑے بڑے متین اور ثقہ، گویّوں اور سازندوں کی سنگیت میں، اچھے اچھے مہذب اور مقطع بھانڈوں اور ڈھاریوں کی صحبت میں سفید پوشوں کے دامن عبیر اور گلال کی پچکاریوں سے لالوں لال، جبّے اور عمامے والے، پشوازوں کی گردش پر نثار۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کی اصطلاح میں "آرٹ" اور "فائن آرٹ" کا دور

---

[1] رسالہ سہیل (علیگڑھ) ۱۹۲۷ء ۔ نظرثانی ۱۹۴۲ء

دورۂ عشق کا چرچا حسن کا شہرہ - اس فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں، کوئی عالم دین نہیں، صوفی و درویش نہیں، واعظ و مصلح نہیں چنچلوں کے آدمی یار باش، رند مشرب، اہل بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لے کر بیٹھے تو انگلیاں انہیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے اور منہ سے بول نکلے تو وہی جن کے نقش دلوں میں جمے ہوئے تھے -

غزلیں شاید زیادہ نہیں کہیں، کہیں ہوں گی بھی، تو اس وقت کسی کی زبان پر نہیں تھوڑا بہت جو کچھ کہا اُس کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

کہنے میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے

پھرتے ہیں انہیں غیر ابھارے کئی دن سے

اک شب مرے گھر آں کے مہمان ہوئے تھے

ملتے نہیں اس شرم کے مارے کئی دن سے

آخر مری آہوں نے اثر اپنا دکھایا

گھبرائے ہوئے پھرتے ہو پیارے کئی دن سے

پھر شوق سے کیا اُس بت عیار سے بگڑی

ہوتے نہیں باہم جو اشارے کئی دن سے

حکیم صاحب کی حکمت وطبابت سے یہاں غرض نہیں، شاعری کی دنیا میں حکیم صاحب کا نام نواب مرزا ہے اور تخلص شوق اور ان کے نام کو قائم رکھنے والی، اُن کی غزلیں نہیں، مثنویاں ہیں۔ تذکروں میں ہے کہ خواجہ آتش کے شاگرد تھے، ہوں گے۔ لیکن یہ مثنویاں یقیناً یا تو اُستاد کے بعد کی ہیں، یا اُن کی زندگی میں اُن سے چرا چھپا کر کہی ہیں، ورنہ آتش کی نظر

پڑھنے کے لیے عجب نہیں کہ نذر آتش ہو جائیں۔ خواجہ آتش کی متانت و ثقاہت کب اس کی روادار ہوتی کہ سعادت مند شاگرد آوارگی اور تماش بینی کی بولی ٹھولی میں وہ نام پیدا کر جائیں کہ تہذیب کی آنکھیں ان کا نام آتے ہی نیچی ہو جائیں، اور عریاں نگاری کے وہ شرارے چھوڑ جائیں کہ آن کی یاد کی چمک دمک قائم ہے بھی تو اسی روشنی میں!

اِن مثنویوں کا نام پڑھے لکھوں کے مجمع میں لیا جاتے؟ تہذیبِ جدید کی اجازت ہے کہ ایک مشرقی شاعر کی عریاں نگاری کی لفظی یادگاروں کا نام لیا جاتے؟ نواب مرزا مرحوم لکھنؤ کا تھا۔ انگلستان کا نہ تھا، فرانس کا نہ تھا، امریکہ کا نہ تھا، کہ اُس کی ہر بے حیائی "آرٹ" کا کمال سمجھ لی جاتی، اس کی ہر عریاں نگاری پر کمالِ فن کی داد ملتی، اور اس کا ہر عیب ہنر بن جاتا! بیسویں صدی کا نہیں، اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط کا تھا "نئے ادب" کے دور سے بہت قبل کا تھا۔ آج کے "ترقی پسند" ہندوستان کا نہ تھا کہ اس کی ہر فحش نگاری "ترقی پسندی" کی سند اور دستاویز بن جاتی! بہرحال مثنویاں منسوب تو اُن کی جانب کئی ایک ہیں، لیکن لذتِ عشق کی زبان قطعاً شوق کی زبان نہیں[1] اور فریبِ عشق بھی مشکل ہی سے اِن کی تسلیم کی جا سکتی ہے ہاں یہ ممکن ہے، نو مشقی کے زمانہ کی کوئی ابتدائی کوشش ہو۔ یقین کے ساتھ جن دو مثنویوں کو اُن کی تصنیف تسلیم کیا جا سکتا ہے اُن میں سے ایک کا نام بہارِ عشق ہے اور دوسری کا زہرِ عشق۔ شہرتِ عام زہرِ عشق ہی کے نصیب میں آئی۔ دونوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے، اور

---

[1] ۱۹۲۷ء میں یہ محض قیاس سے لکھا گیا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں لذّتِ عشق کا ایک بہت قدیم مطبوعہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا۔ اس کے سرورق پر تصریح ہے کہ یہ مثنوی شوق کی نہیں، شوق کے ہمشیرزادہ ایک اور حکیم صاحب کی ہے۔

نہ کوئی طلسم کشائی، نہ شاعر منبر پر بیٹھ کر خسارتی کا وعظ کہہ رہا ہے۔ نہ اتالیق کے لکچر روم میں
تحلیل نفسیاتی کر رہا ہے۔ گئے دنوں اپنی ہوسناکی کی کہانی سنانی ہے۔ وہ بھی وہ خوب مزے
لے کر سنا رہا ہے، پھر چونکہ یہ "آپ بیتی" ہی سنانی ہے اس لئے "جگ بیتی" سنانے
والوں کی طرح کسی دوسرے کو عاشق فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی ہے۔

بہار عشق میں افسانہ کا انجام شادی پر ہوتا ہے۔ پیش نظر نسخہ لکھنؤ کے مطبع علوی
علی بخش خاں کا چھپا ہوا ہے۔ بابت ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء - یہ نسخہ نسبتاً صحیح ہے۔ حال کے
مطبوعہ نسخے، علاوہ بہت زائد اغلاط طبعی کے، آخر سے ناقص بھی ہیں۔ شادی کا ذکر ان میں غائب
ہے۔ کل نظم میں آٹھ سو سے اوپر شعر ہوں گے، اشعار کی خاصی بڑی تعداد ایسی ہے، جو
بزرگوں کے سامنے کیا، بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بھی پڑھنے کے قابل نہیں۔ خدا معلوم
ان ذات شریف سے لکھے کیونکر گئے!

کتاب کے شروع میں حسب دستور زمانہ بادشاہ کی مدح ہے اور سننے کے قابل ہے
ارشاد ہوتا ہے ؎

نوبت مدح شاہ آئی ہے — اے قلم وقت جبہ سائی ہے
کر رقم اب دعائے شاہ زماں — کہ ہے وہ ملک ہند کا سلطان
آفتاب سپہر جاہ و حشم — شاہ واجد علی شہ عالم

یہ "شاہ زماں" اور "سلطان ہند" اور "شہ عالم" اور "آفتاب سپہر جاہ و حشم" کے خطابات
اس وقت عطا ہو رہے ہیں، جب جس کو مسند بادشاہت کے سارے اختیارات چند ایکڑ اگر نہیں
تو چند میل کے رقبہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور اس محدود چہار دیواری کے اندر بھی
مجال نہ تھی کہ "صاحب عالیشان رزیڈنٹ بہادر" کے حکم کے خلاف کوئی انگلی تک ہلا سکے!

آگے اور سنیے ؎

خلق پر سایہ الٰہی ہے | مالک تاج و تخت شاہی ہے
ہے بشر، پر خدا کی قدرت ہے | نیک سیرت ہے، خوبصورت ہے
سرورِ خسروانِ عالم ہے | سچ تو یہ ہے کہ جانِ عالم ہے
دل تمنائی وصل او دارد! | چہ بلا شکل آرزو دارد!

ان آخری شعروں میں بادشاہ کی تعریف رعایا کی زبان سے ہو رہی ہے، یا جہاں پناہ اپنے کسی محل کو یاد فرما رہے ہیں:

قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک روز لبِ بام ایک ماہ لقا دکھائی دیتی ہے، اس کے حسن کا عکس اس آئینہ میں ملاحظہ ہو ؎

بام روشن ہے طور کی صورت | سر سے پا تک تھی نور کی صورت
حسنِ یوسف بھی اس کے آگے ماند | چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن | گات جس طرح قمقمے روشن
ناک میں تبسم کا فقط تنکا | شوخی چلبلا کی مقتضا سن کا
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی! | جسم میں وہ شباب کی پھرتی
قد میں آثار سب قیامت کے | گوری گردن میں طوق منت کے
عکس سرخ موتیوں کے دانتوں میں | بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں
رگ گل سی کمر لچکتی ہوئی | چوٹی ایڑی تلک لٹکتی ہوئی

یہ منظر دیکھتے ہی حکیم صاحب اپنی ساری حکمت بھول بھال سو جان سے عاشق ہو جاتے ہیں، گھر تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے اور جب کسی طرح گرتے پڑتے پہنچتے ہیں تو اٹوائی کھٹوائی

لے کر پڑ جاتے ہیں بغش پرغش آنے لگتے ہیں۔ زندگی سے یاس ہو جاتی ہے۔ ماں باپ بھائی، بہن، دوست جھباب سب گھبرا جاتے ہیں اور طرح طرح کا دوا علاج کر کے جب تھتے بے اثر پاتے ہیں تو رونے دھونے میں لگ جاتے ہیں۔ ان مرحلوں کے بعد ایک روز ایک رازدار دوست آ کے حکیم صاحب کے دل کی نبض ٹٹول ان کے مرض کی تشخیص کرتے ہیں، اور اس مقدس مشن پر روانہ ہو جاتے ہیں، کہ اُن کے تماشائی کرنے والی ستمگر پری پیکر کے گھر کا پتہ لگائیں گے اور کسی دم دلاسے سے اُسے تھیر گھاران سے لا دائیں گے۔ دیار پر پہنچ کر پہلے گھر کی مہری کو گانٹھتے ہیں۔ یہ مہری بنی ٹھنی ہوئی تو اس انتظار میں کھڑی ہیں آپ ان جیب تو دیکھتے ہی جلیں، زبان سے لاحول پڑھتے ہوئے لیکن نظر کو نظر سے دوچار کرتے ہوئے سه

. . . . سانولا رنگ چلبلی صورت

لال نیفہ ازاربند بڑا! گچھا ایک کنجیوں کا اس میں پڑا

کھیلتی ہنستی کھلکھلاتی ہوئی آنکھ اک ایک سے ملاتی ہوئی

آنکھ اک ایک پر لگاوٹ کی بات اک ایک سے گھلاوٹ کی

حسن کے دن جوانی زوروں پر رات کی باسی مہندی پوروں پر

یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری دو منہ ہنس بول لی جہاں ٹھہری

آگے اور پیچھے مار، فوج کی فوج دھینگا مشتی کسی سے گالی گلوج

یہ نہ دیکھیے کہ کیا کہا، نظر اس پر رکھیے کہ کیسا کہا۔

جیسی رُوح ویسے ہی فرشتہ۔ اگر یہ عاشق صاحب تاشیفتی میں طاق تھے تو ان کے دوست صاحب بھی کٹنا پے میں شہرۂ آفاق۔ سزائی ڈیوڑھی تک رسائی پیدا کر کرا، ان نام کی

بیگم صاحبہ پر کچھ ایسا افسوں پڑھا، اور "عاشق صادق" پر حالت نزع کے طاری ہونے کا کچھ اس طرح سماں باندھا، کہ آخر وہ اُن کے بھرّے میں آگئیں۔ یہ بیگم صاحبہ بھی خیر سے کچھ معصوم نادان نہ تھیں، خوب کھیلی کھائی ہوئی تھیں، لیکن پھر آخر ناقص العقل۔ ایک شریف بدمعاش کی قسماقسمی اور خدا رسول کے واسطوں پر یقین کر بیٹھیں، اور درگاہ حضرت عباسؑ[۱] کی حاضری کا بہانہ کر، گھر سے سوار ہو گئیں۔ کہاروں کو پہلے ہی سے پٹی پڑھا دی گئی تھی۔ سواری آکر لب مرگ "عاشق بیمار" کے دروازہ پر رکی۔ خدمتگار خبر دینے آتا ہے کہ ڈیوڑھی پہ ایک سواری آئی ہے لیکن خدمت گار صاحب بھی آخر کس ولی پھینک مخدوم کے خادم تھے، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں "ایک ماما بھی آئی ہے ہمراہ۔ کتنی چالاک ہے خدا کی پناہ" ماما پردہ نشین نہیں بے پردہ ہے اور "حسن رہ گذرے" آپ کے اخلاق کے دارالافتاء ہیں "سرود خانۂ ہمسایہ" ہی کی طرح وقف عام ہے۔ موقع ہے کہ آپ اپنی متانت اور ثقاہت کو خطرہ میں ڈالے بغیر، چپکے سے ایک نظر، اچٹتی سہی، اِدھر بھی ڈال لیں ؎

پوچھتی آئی ہے یہاں تک گھر ۔۔۔ ہاتھ رکھے کھڑی ہے کولے پر
اپنے سایہ سے بھی بھڑکتی ہے ۔۔۔ بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے
شرم ہے آنکھ میں نہ دل میں خطر ۔۔۔ پھبتیاں کہہ رہی ہے اک اک پر
ہنسی ٹھٹھا ضلع جگت میں طاق ۔۔۔ چل رہی ہے زبان تڑاق پڑاق
کھڑی اک اک کا منہ چڑھاتی ہے ۔۔۔ ہنسے دیتی ہے لوٹی جاتی ہے
چوٹی ٹیڑھی ہے باسی ہاروں سے ۔۔۔ لڑ رہی ہے جگت کہاروں سے
راستے والے جو گذرتے ہیں! ۔۔۔ ٹھٹکے کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں

بہر حال سواری اترتی ہے۔ تخلیہ میں یکجائی ہوتی ہے۔ شہدپن کو کھیل کھیلنے کا موقع ملتا ہے

---

[۱] لکھنؤ کے غربی حصّے میں ایک مشہور شیعی زیارتگاہ۔

شرم و حیا کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور بے حیائی و نفس پرستی کے پردے ہر طرف چھوڑ دیئے جاتے ہیں، ایک طرف ہوسناکی کی تمنائیں ہیں، تو دوسری طرف انکار کی ادائیں ہیں، منت و سماجت کی دھیمی آوازیں تو خلوت گاہ کی دیواروں کے اندر گونج کر رہ جاتی ہیں، البتہ ڈانٹ پھٹکار گرا گرم صدائیں پردہ کے باہر بھی صاف سنائی دے رہی ہیں ؎

بل بے لفنگے تراعاذ اللہ — میرے تو ہوش اڑ گئے واللہ

لوگ کہتے تھے سب ہے لبوں پر جان — مکر کے مست تو جھوٹ کے قربان

کون کہتا ہے زہر کھایا ہے — یہ بھی اک شعبدہ بنایا ہے

توبہ کس درجہ بے حیائی ہے — واہ کیا دیدہ کی صفائی ہے

کیا کہوں اور بے حیا تجھ کو — پیٹے منہ لعنت خدا تجھ کو

میں بڑا چکمہ کھا گئی افسوس — جو ترے جبل میں آگئی افسوس

جھوٹا بدذات قلبیا مکار — ان گنوں پر ترے خدا کی سنوار

مکر کا بانی جھوٹوں کا سرتاج — سنتے تھے فیلسوف دیکھا آج

ایسے فقروں کو کوئی کیا سمجھے — اور تو کیا کہوں خدا سمجھے

لیجئے اب تو آواز اور بلند ہو گئی، اور لہجہ میں غصہ کی تھرتھراہٹ نمایاں ہو گئی ؎

چربی آنکھوں پہ تیرے چھائی ہے — کچھ نگوڑے کی شامت آئی ہے

کبھی آفت نہ یہ اٹھائی تھی — چھائیں پھوئیں میں نوج آئی تھی

کیا دھما چوکڑی مچائی ہے — تیری بختاوری پہ کچھ آئی ہے

موذی، بدذات، بے حیا، بے شرم — جانتا ہے کہ ہم ہیں گرا گرم!

کس قدر صاف تیرا دیدہ ہے — ایک نٹ کھٹ حرامزادہ ہے

کون سمجھے تھے ترا دھورا ہے | ارے تو سب گنوں میں پورا ہے
میں اگر بولنے پہ آؤں گی ! | لاکھوں دھرے ترے اڑاؤں گی
ابھی سب کہہ کے سُنکے رکھ دونگی | سات پیڑھی کو پُن کے رکھ دونگی
اور وہ ہوتیاں ہیں البیلی | ہیں نہیں کچی گولیاں کھیلی
گالیاں کیسی، کوسنے دونگی | میں بھی اک اپنے نام کی ہوں گی
رحم کرتا ہے تجھ پہ نادانی | وہاں ماروں جہاں نہ ہو پانی
تیری پلیہ پہ بوٹیاں کاٹوں | چیل کوؤں کو بیٹھ کر باٹوں

یہ جو شعر آپ نے سُنے پھر بہت صاف اور سنجیدہ ہیں باقی اشعار کی ایک بڑی تعداد نقل کے قابل کسی طرح بھی نہیں لیس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص نے شرم وحیا کا لباس اُتار کر پھینک دیا ہے، تہذیب شائستگی کی جانب سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور آواز گو نکل رہی ہے انسان کے حلق سے، لیکن ہے تمامتر جذبات سفلی وحیوانی کی ـــ ظالم نے مصوّری کی یہ خداداد قابلیت کاش کسی شریفانہ نظم میں صرف کی ہوتی! شاعر جس ماحول میں تھا اس میں اخلاق کی پستی، جذبات کی فرومائگی ورکاکت، بے حیائی وعُریاں نگاری کی کمی کچھ نہ تھی، حمام میں سب ہی ننگے تھے۔ آخری دربار اودھ کے شعرائے باکمال اور سخن گویانِ شیریں مقال میں کون اس میدان کا مرد نہ تھا؟ بااین ہمہ اِن کاملوں کی سرداری کا تاج شوق ہی کے سر پر رکھا گیا اس بزم کی صدر نشینی نواب مرزا ہی کے حصّہ میں آئی، لیکن اس صدارت وسرداری کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ بھی سب پر عیاں ہے۔ آج اُردو شاعری کی تاریخ میں کہیں اس غریب کے لئے کوئی جگہ[1] ہے؟ اُردو کے مشاہیر شعراء کی فہرست میں کسی نمبر پر ان کا نام آتا ہے؟ اگر

[1] یہ صورت حال ۱۹۲۷ء کی بیان ہوتی۔ دور "ترقی پسندی" کے طلوع ہونے سے بہت قبل۔ اسوقت خود اس مقالہ کا لکھنا اور اسے بھری مجلس میں سُنانا، ذرا جرأت ہی کا کام تھا۔

تذکرہ نویسوں نے ان کا یا ان کی مثنویوں کا ذکر تک بھی کیا ہے؛ شاعروں کا کوئی طبقہ آج تک یا کسی دوسری حیثیت سے اپنا انتساب ان کی جانب پسند کرتا ہے؛ یا اس کے برعکس ان کا نام آتے ہی کچھ عجیب سا جاتا ہے اور بڑے احتیاط اپنی تبری کرنے لگتا ہے؛ نقادان شعر کے حلقوں میں، سخن سنجوں کی صحبتوں میں، پڑھے لکھے اور شریف گھرانوں میں نواب مرزا شوق اور ان کی مثنویوں کی کچھ بھی وقعت اور پرسش ہے؟

کلام کا کچھ نمونہ اوپر گذر چکا، اور بہت کچھ ابھی آنے کو ہے۔ محاورات پر یہ عبور بیگمات کے روزمرہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحت، بیان کی یہ سلاست، جذبات نگاری کی یہ قوت، کیا ہر شاعر کے نصیب میں آئی ہے؛ ان تمام حیثیات سے، شوق کا کلام اردو کے کسی شاعر سے فروتر ہے؛ پھر آخر اس بے التفاتی کی وجہ؟ شوق کی کس مپرسی کا کوئی سبب وجہ ظاہر اور صاف واضح ہے۔ مشرق، کم از کم اسلامی مشرق، اپنی جبلت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ قدر شرم و حیا کے جذبات کی کرے، عزت کی مسند پر جگہ شرافت کے لئے خالی کرے اور اپنا سر عصمت و عفت کی تصویروں کے آگے خم کردے۔ بے حیائی، عریاں نگاری اور تحریر شہدپن کی عزت و وقعت اس کی سرشت کے مخالف ہے جس طرح ہر فرد ایک مخصوص طبیعت اور خاص مزاج رکھتا ہے، ہر قوم کا بھی ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے، ہر تمدن کی بھی ایک مخصوص سرشت ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی جو کارروائیاں اس عام مزاج و سرشت کے مخالف ہوتی ہیں، وہ کبھی قوم کے قوام میں نہیں داخل ہونے پاتیں قومی تمدن کا مستقل نظام انہیں اپنے میں جذب کرنے، قبول کرنے اور اپنا جزو بنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور نظام تمدن کا ایک بڑا مظہر ہر قوم کا شعر و ادب ہوتا ہے۔ شوق کی کھلی ہوئی عریاں نگاری، مشرق کے ذوق سلیم کے مخالف تھی، بگڑی اور احتشری ہوئی تہذیب اسلامی کے بھی منافی تھی، اس لئے

اسلامی مشرق نے شوق کی تمام دوسری شاعرانہ خوبیوں کے باوجود اُن کے لئے اپنی فہرست مشاہیر میں کوئی جگہ نہ رکھی۔ اور نام کو بالکل "گم نام" ہونے سے بچاکر رکھا بھی تو "بدنام" کر کے زندہ رکھا، مشرق کا صوفی بگڑے گا، بہکے گا بھی، تو بندگی میں خدائی کے دعوے کرنے لگے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ مغرب کے ترقی یافتہ حکیم کی طرح اپنی انسانیت کو بھلا کر فخر اپنے بندر ہونے پر کرنے لگے! بے ہوش ہوجائے گا۔ بدحواس نہ ہوگا۔ "بگڑنے پر بھی بات اس کی بنا کی" جاناعالم کا ہندوستان، بھانڈوں اور سازندوں کا ہندوستان، لاکھ بگڑنے پر بھی اپنے سے اتنا بیگانہ نہیں ہوا، اپنے کو اتنا نہیں بھولا، کہ کوئلہ کا نام ہیرا رکھ دے، اور پیتل کو سونا سمجھنے لگ جائے۔

غرض نواب مرزا کو اپنی پست مذاقی اور مبتذل نگاری کی سزا، مشرق کی معدلت گاہ سے ملی اور بجا طور پر ملی، لیکن وہ خود بھی آخر مشرقی ہی تھا، باوجود انتہائی بے حیائی کے یہ ناممکن ہوا کہ چوری کے جرم پر سینہ زوری کا بھی اضافہ کرے۔ لارڈ بائرن اور آسکر وائلڈ[1] کی سی یہ جرأت وجسارت کہاں سے لا سکتا تھا، کہ گندہ نظم اور گندہ ترنثر کو شعر و ادب کا بہترین نمونہ لکھ کر پیش کرتا! یہ بے باکی اور ڈھٹائی نیویارک کے ایوننگ گرافک، لندن کے نیوز آف دی ورلڈ اور لندن لائف، بمبئی کے ٹائمز آف انڈیا السٹریٹیڈ ویکلی اور اسی مرتبہ کے اور اونچے اونچے فرنگی اخباروں رسالوں ہی کے حصہ میں آئی ہے، الفاظ و عبارت ہی نہیں، فوٹو اور تصویریں تک زیادہ سے زیادہ عریاں چھاپتے رہیں اور نام "آرٹ" کی ترقی

---

[1] اور اب تو وہ دونوں غریب بھی ڈی۔ایچ، لارنس اور جوائس اور ان جیسے بیسیوں اہل قلم مردوں اور خاتونوں کے آگے گرد ہو کر رہ گئے ہیں۔

کا یا مسمت کے دکھا دکھا کے ڈالے دیا کرتی[1] ! غریب مشرقی کا تخیل بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا عمل میں کیسی ہی شرمناک کمزوریاں اور کوتاہیاں ہوں لیکن ایمان میں فحش و بے حیائی کا جواز دخل نہ تھا - اپنے شہدپن کی کہانی سنانے کو تو سنا ڈالی لیکن معاً یہ خیال بھی سامنے آ گیا کہ خود تو جی بھر کے تباہ ہو چکے ، نہ ہو کہ داستان فسق دوسروں کے لئے سامانِ تباہ کاری بن جائے - آخر مشرقی تھے ، مسلمان تھے ، بات کو انجام تک پہنچاتے پہنچاتے خود اپنے انجام کا بھی خیال آ گیا - مدتوں تک شیطان پرستی کی وکالت کرنے کے بعد خود بخود خانقاہ کی جانب پھر گیا - اور ابتدا میں جس کی حمد میں زبان کھلی تھی ؎

کس زباں سے کروں صفاتِ خدا — کیا بشر سمجھے کنہ ذاتِ خدا

جب نبی یوں کہے کہ لے اے ملک — ما عرفناک حق معرفتک

انتہا میں بھی اسی کا خوف غالب آ گیا ، اور اسی کی خشیت نے قلب کو لرزا دیا - زبان اب چل رہی ہے اور مضمونِ عشق ہی پر چل رہی ہے ، لیکن اب دوسرا پا فسق نہیں - خدا کان لگا کر تو سنیے یہ ایمانِ عشق میں داستان فسق بیان ہو رہی ہے ، یا ذکر و شغل کے حلقہ میں تسبیح و تہلیل ہو رہی ہے ؛ ؎

اب سنیں صاحبانِ عقل و شعور — ہے یہ دنیا تمام مکر اور زور

شہد ظاہر میں زہر اندر ہے — جس قدر اس سے بھاگے بہتر ہے

صاحبِ عقل کو نہیں ہے زیب — کہ اٹھائے جہاں میں رہ کے فریب

سب یہ دنیا سوائے فانی ہے — عشق معبود جاودانی ہے

انیں ! یہ کیا سے کیا ہو گیا ! ابھی تو شرافت اور متانت کانوں میں انگلیاں دیتے ہوتے تھی ، اور اب ہے کہ آنکھیں بچھا دینے کو تیار ! کہاں ابھی گلفام و سبز پری کا سوانگ جما ہوا تھا ، اور کہاں رومی

[1] ملاحظہ ہوں انگلستان کے رسالہ Health & Efficiency کے چند نمبر

دُعْزا کی جگہ مواعظ کا دفتر کھل گیا ہے

کہتے ہیں صوفیان صافی دِل	کہ ہے عشق خدا بہت مشکل
عشق اللہ کا جو مائل ہو	ترک دُنیا کرے تو حاصل ہو
اب یہ لازم ہے جو کہ ہے اِنساں	ترک دُنیا کرے بہر عنواں
کوئی اُلفت نہ بے وفا سے کرے	عشق کرنا ہے تو خدا سے کرے
چار دِن کی یہ زندگانی ہے	جو ہے اُس کے سوا وہ فانی ہے
ہے وہ مستجمع جمیع صفات	لائق سجدہ ہے اُسی کی ذات
وہی اوّل میں ہے وہی آخر	وہی باطن میں ہے وہی ظاہر
کون سی جا ہے جس جگہ وہ نہیں	چاہیے ہے نگاہ وحدت بیں

تلقین زہد و موعظہ معرفت سے طبیعت اُکتا چلی ہو، تو بس تھوڑے سے صبر کی اور ضرورت ہے چند ہی شعر باقی رہ گئے ہیں ۔

لکھتے ہیں صوفیان با توقیر	عشق اللہ ہے عجب اکسیر
جس کو اس در تلک رسائی ہے	دین و دُنیا کی بادشاہی ہے
مثل سیماب دِل کی ہے تاثیر	خاک ہو جائے تب بنے اکسیر
دُنیا کہتے ہیں جس کو پردہ ہے	باقی اللہ کے سوا کیا ہے
منکشف اس کی کیا حقیقت ہو	وہی جانے جسے بصیرت ہو
پردے اُٹھ جائیں جب جدائی کے	حال اُسدم کھلیں خدائی کے

یہ کس کا کلام ہے؟ کسی صوفی خرقہ پوش کا؟ کسی زاہد خلوت گزیں کا؟ کسی فقیر تارک دنیا کا؟ یا اُسی صیاد دشمن کا جو ابھی ابھی اپنی سیہ کاری کی داستان مزے لے لے کے سُنا رہا تھا؟

اس بزمِ ماتم مشرقی کے مقابلہ میں مغرب کے نیک ناموں کے پاس کیا ہے؟ یہ رنگ مشرق تھا، جو فخر مغرب نہیں، سوال ان کی بابت نہیں ہے۔ یہ مشرقی تخیل کا اسفل سافلین تھا، لیکن جو مغربی تخیل کا اعلیٰ علیین ہے اس کے صحن چمن میں گلگشت کے بعد، پند و موعظت، سلوک و معرفت عبرت و اطاعت کے کتنے گلدستے تیار ہو سکتے ہیں؟

(۴)

نواب مرزا کا شاہکار بہارِ عشق نہیں، زہرِ عشق ہے، اس کے نام کو بڑی یا بھلی جو کچھ بھی شہرت حاصل ہے۔ اسی زہرِ عشق کے طفیل میں ہے۔ یہ مثنوی بہارِ عشق سے چھوٹی ہے کوئی پانچ سو شعر ہوں گے، بحر وہی، زبان وہی، طرزِ بیان وہی، لیکن درد و اثر کے اعتبار سے اس سے بڑھ چڑھ کر۔ بہارِ عشق کا خاتمہ وصل کی شادمانی پر ہوا تھا، زہرِ عشق کا انجام ہیروئن کی خودکشی اور عاشق کے اقدامِ خودکشی پر ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ نظم بہارِ عشق کے مقابلہ میں بہت مہذب اور سنجیدہ ہے۔ عریانی اس میں اگر ہے بھی تو بس اتنی جتنی ہر عاشقانہ افسانہ میں ہوتی ہی ہے۔ ہیروئن اس کی بھی کوئی عصمت مآب نہیں، لیکن دوسری طرف کوئی "لگا بیسوا" بھی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی شریف گھرانے کی ایک الھڑ لڑکی، نوعمری کی نادانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے تاہم غیرت و عزت سے بالکل ہاتھ نہیں دھو بیٹھی ہے۔

لکھنؤ میں شروع شروع تھیٹر کا رواج ہوا تو کسی کمپنی نے اس تماشہ کو اسٹیج پر بھی دکھایا تھا۔ پرانے لوگوں سے یہ روایت سننے میں آتی ہے کہ گنہگار کنواری کے جنازہ کا اٹھنا اور اس کے پیچھے پیچھے غم زدہ والدین کا ماتم کرتے ہوئے چلنا اور پچھاڑیں کھا کر گرنا، جب دکھایا گیا تو تماشہ گاہ ایک بزمِ عزا بن گئی۔ لکھنؤ کی نزاکت، قیامت خیز واقعیت کی نقل کا بھی تحمل نہ کر سکی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کا تار بندھ گیا۔ بعضوں کو غش آگئے اور ایک آدھ

نے شاید خودکشی کی بھی ٹھان لی - اس پر تماشہ کا دکھانا قانوناً ممنوع ہو گیا اور کتاب کی اشاعت بھی عرصہ تک بند رہی - اب چند سال ہوئے لکھنؤ کے مطبع مجتبائی نے پھر شائع کیا ہے - میرے پیش نظر اس مطبوعہ نسخہ کے علاوہ ایک بدخط قلمی نسخہ بھی ہے، اندازاً سے کوئی پچاس ساٹھ سال اُدھر کا لکھا ہوا -

کتاب کے سرنامہ پر حمد باری و نعت رسول کی مہریں ثبت ہیں ؎

لکھو قلم پہلے حمد ربِ ودود ۔۔۔ کہ ہر ایک حباب ہے وہی موجود

ذات معبود جاودانی ہے ۔۔۔ باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

ہمسر اس کا نہیں، ندیم نہیں ۔۔۔ سب ہیں حادث، کوئی قدیم نہیں

مدح احمد زباں پر کیونکر آتے ۔۔۔ بحر کوزہ میں کس طرح سے سماتے

ذات احمد کو کوئی کیا جانے ۔۔۔ یا علی جانے یا خدا جانے

آگے چل کر بجائے جہاں پناہ کی مدح کے ۱۰۱، ۱۲ اشعار عشق کی تعریف و تعارف میں ہیں، ان میں سے بعض شعر اپنی صفائی و روانی کی بنا پر عام زبانوں پر چڑھ گئے ہیں ؎

عشق سے کون ہے بشر خالی ۔۔۔ کر دیئے اس نے گھر کے گھر خالی

پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے ۔۔۔ ڈالتا ہے جگر میں یہ چھالے

اس سے اُمید رکھنا ہے بے جا ۔۔۔ بھائی مجنوں سے کیا سلوک کیا

آتش ہجر سے جلاتا ہے ۔۔۔ آگ پانی میں یہ لگاتا ہے

مار ڈالا تماشبینوں کو ۔۔۔ زہر کھلوا دیا حسینوں کو

قصّہ کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ؎

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر ۔۔۔ وہیں رہتا تھا ایک سوداگر

اُس کے ایک نوعمر حسین لڑکی تھی، ماں باپ کی آنکھ کا تارا، لکھی پڑھی، نستعلیق - ایک روز اپنے کوٹھے پر آئی، نواب مرزا سے آنکھیں چار ہو گئیں - یہ حضرت تو اپنا دل نذر کرنے کے لئے ہر وقت ہتھیلی پر لئے پھرتے ہی تھے، کھٹ سے عاشق ہو گئے اور اپنے ماں باپ کے سامنے خوب خوب فیل لائے - اب کی عشق یک طرفہ نہ تھا، اُدھر بھی اثر ہو چکا تھا، ایک روز ایک ماما، نامۂ شوق چپکے سے لا کر معشوق کے ہاتھ میں دے گئی - خوشی سے کانپتے ہوئے ہاتھوں، اور خوشی سے پُرنم آنکھوں کے ساتھ کھول کر پڑھا ؎

ہو یہ معلوم تم کو بعد سلام غم فرقت سے دل ہے بے آرام
شکل دکھلائیے کبریا کے لئے بام پر آ ؤ ذرا خدا کے لئے

دل کی چوٹ بری ہوتی ہے - لڑکی محبت کی ماری، عقل و ہوش سے اندھی ہو چکی ہے پھر بھی شریف زادی ہے، اس لئے قلم اس سے زیادہ بے حیائی پر نہیں اُٹھ سکتا، فوراً اپنی خود داری کو یوں سنبھالتی ہے ؎

سارے اُلفت نے کھو دیئے اوسان ورنہ یہ تھی میں خدا کی شان
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے جس کو چاہے خدا ذلیل کرے
اس محبت پہ ہو خدا کی مار جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار

عاشق صاحب یہ پڑھ کر بھلا جامہ میں کہاں سما سکتے تھے - ایک جواب بحر طویل میں دھر گھسیٹا - جا و بیجا، مناسب و نامناسب، سبھی کچھ زبانِ قلم نے اُگل ڈالا، اُدھر سوداگر زادی بھی بڑی برق دم نکلیں، اُنہیں کے جوڑ کی رکھو ٹے کھرے مال کی خوب پرکھ رکھتی تھیں - پیام شوق پڑھ کر خوب لطف لیا - اور ہنس کے بولی کہ "واہ وا کیا خوب! جواب لکھنے بیٹھی تو بسم اللہ یوں کی - کچھ قصنا کر نہیں ہے وا نگیر"؛ اور پھر خوب خبر لی ؎

ذِکر ان باتوں کا یہاں کیا تھا	چھیڑنے کو یہ تیز سے لکھا تھا
یہہ تو لکھے تھے سب ہنسی کے کلام	ورنہ اِن باتوں سے ہے کیا کام
مجھ کو ایسی تھی تب مری کیا پروا	بام پر تو بلا سے آ، کہ نہ آ
تم پہ مرتی، میں کیا قیامت تھی	کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
میری جانب سے یہ گماں کیا خوب	جھوٹ جم جم سے ہے بہت مرغوب
کالا دانہ ذرا اُتروا لو!	رائی لون اس سمجھ پہ کروا لو
دیکھ کر خیر فیل لائے آپ	خوب جلدی مزے میں آگئے آپ

چند روز اسی طرح مزہ مزہ کی نوک جھونک جاری رہی۔ اس کے بعد ایک جمعرات کو وہی درگاہ کی زیارت کا چلتا ہوا فقرہ کام آیا شامت کی ماری کی سواری، والدین کے گھر سے چلی اور نواب مرزا کی ڈیوڑھی پہ آکر رُکی۔ آگے جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ شرافت لُٹی، عزت ڈوبی۔ آمد و رفت کا سلسلہ اس کے بعد قائم ہو گیا۔ لیکن یہ چوری چھپے کی ملاقات کب تک راز رہ سکتی تھی گھر والوں کو ٹوہ لگ گئی۔ اور والدین نے اپنی رسوائی دفع کرنے کو یہہ تجویز، کہ لڑکی کو لکھنؤ سے دور شہر بنارس میں کسی عزیز کے پاس پہنچا دیا جائے ادھر لڑکی کو بھی سن گن مل گئی۔ دل نے کہا کہ "ہائے جانے کی بات ہے، ماں باپ کو بھی آخر اس روسیاہی کی خبر ہو گئی۔ اب ان کا سامنا کیا کیسے جائیگا؟ اس زندگی سے تو موت بھلی!" نو عمری کا زمانہ، دل دنیا کی تلخیوں سے ناآشنا، حوصلے زندہ، اور ولولے تازہ۔ سامنے دنیا اور اس کی بہاریں، ابھی لڑکی ہی ہے۔ کوئی پیر زال نہیں، کچھ بہار دیکھی بھی نہیں بس بات کیا ہے، صرف اتنی کہ رگوں میں مشرقی شرافت کا خون گردش کر رہا ہے دماغ میں خاندانی روایات کی یاد محفوظ ہے، دل میں غیرت و حمیت کی آن باقی ہے۔ جان جیسی عزیز چیز سے ہاتھ دھونا گوارا، لیکن اس کی برداشت نہیں کہ سب عزیزوں، قریبوں کی نظروں

میں ذلیل و رسوا ہو کر زندگی بسر کی جاتے بس یہ دل میں ٹھان آخری ملاقات کے لئے عاشق کے پاس آئی ہے ـــــ جان دینا تو عاشقوں کا کام سمجھا جاتا ہے یہاں جان دینے پر وہ آمادہ ہے جو خود اس قابل ہے کہ دوسرے اس کے اوپر اپنی جانیں فدا کرتے ! ـــ

تھی نہ فرصت جو اشکباری کا ـــ آئی روتی ہوئی سواری ـــ

شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں عاشق و معشوق کی جدائیں اور معوا کی ملاقاتوں کے منظر بارہا دکھائے ہیں۔ خودکشی، اقدام خودکشی، اور مصنوعی خودکشی کے منظروں سے بھی اس کے صفحات خالی نہیں۔ اور رومیو جولیٹ کے بعض سماں تو بہت ہی موثر اور درد انگیز سمجھے جاتے ہیں، لیکن ہے اس فرنگستان کے مشہور و ممتاز ڈرامہ نگار کے ہاں کوئی منظر جو اثر و عبرت انگیزی میں مشرق کے اس بدنام شاعر کے کھینچے ہوئے نقشہ کا مقابلہ کر سکے ؟

خیر وہ حسرت نصیب آتی ہے اور کہتی ہے ـــ

اشتر باہر گئے میرے آگاہ   تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ

وہ چھپے ہم سے جس کو پیار کریں   جبر کیونکر یہ اختیار کریں !

گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس   پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

لیجیے کہاں ابھی غفلت کے قہقہے بلند ہو رہے تھے، اور کہاں عبرت کا درس شروع ہو گیا ! دنیا اور اس کی ساری دلفریبیاں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہی ہیں، اب سابقہ پڑنے کو ہے بندی کا اپنے مالک سے، امکز ور کا زور والے سے، بے بس کا قدرت والے سے، غفلتیں دور ہو گئیں، مدہوشیاں کافور ہو چلیں شمع جھلملانے لگی، چہرہ پر زردی چھا گئی اب نہ جوانی میں وہ لذت و سرور، نہ حسن و رعنائی میں وہ پندار و غرور، اب ندامتیں ہیں اور اشکباریاں عبرتیں ہیں اور آہ و زاریاں ـــــ موت کی آمد بے تنک ہر غافل کو اسی طرح جھنجھوڑ کر ہوشیار

کردیتی ہے —

جائے عبرت سرائے فانی ہے — مَوردِ مرگِ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
بات کل کی ہے نوجوان تھے جو — صاحبِ نوبت و نشان تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرتِ حور مہ جبیں نہ رہے — ہے مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
کوئی لیتا نہیں اب اُس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
تاج میں جن کے ٹکتے تھے جوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے اُن کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ — نہ کسی جانل و دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کر طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ، کل ہماری باری ہے

موت کے تصور سے اچھے اچھے دلیر اور سورما لرز اٹھتے ہیں، یہ تو بے چاری ایک پردہ نشیں لڑکی ہی تھی، کمسن و نادان - یہ وصیتیں کرتے وقت اس کے جسم نازک کے اندر کے قلب نازک کی کیا حالت ہوگی؟ — آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے، دل کا ہول بڑھتا جاتا ہے - چہرہ پر ایک رنگ آتا ہے ایک جاتا ہے کلیجہ میں شیشے لگے ہوئے ہیں - زبان لڑکھڑا رہی ہے آواز تھرا رہی ہے، الفاظ پورے پورے ادا نہیں ہو پاتے، پھر بھی تقدیر کے نوشتہ پر صبر کرکے، طبیعت کو سنبھالتی جاتی ہے، آنسو پونچھتی جاتی ہے اور کہتی ہے :-

ہم اگر جان دیدیں کھا کے سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے جانا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی — ڈھونڈتی کس طرف کو جائے گی!
روکے رہنا بہت طبیعت کو — یاد رکھنا مری وصیت کو
میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہولیں سب اقربا جس دم — رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہوگئے تم اگرچہ سودائی — دور پہنچے گی میری رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے — لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب امیر — قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر

گنہگار سوداگر زادی، اپنے گناہ کا احساس رکھتی تھی، خلق میں اپنی رسوائی سے شرماتی تھی، کوئی امریکی آرٹسٹ، کوئی فرنگی "فلم اسٹار" نہ تھی، کہ فخر اپنی بے حیائی پر اور ناز اپنی سیاہ کاری

پر کرتی ۔ گناہ گار بننا قسمت میں لکھا کر آئی تھی، سو بن چکی ۔ لیکن گناہ کی اشاعت کی روادار کسی حال میں نہ تھی ۔ دامنِ عصمت داغدار ہونا تھا، ہو چکا، پھر بھی عزت کے معنی سے واقف تھی شرافت کی قدر و قیمت پہچانتی تھی ۔

پردہ پوشی کے لئے کیسی کیسی منت و سماجت کرتی ہے ؎

سامنا ہو ہزار آفت کا | پاس رکھنا ہماری عزت کا
جب جنازہ مرا عزیز اُٹھائیں | آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیے گا | بند اپنی زبان رکھیے گا!
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا | نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہائیے گا | ساتھ غیروں کی طرح جائیے گا
آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے | سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے | تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ذکر سُنکر نہ میرا رو دینا | میری عزت نہ یُوں ڈبو دینا

کہتے ہیں مرد کی خاطر عورت اپنے کو مٹا دیتی ہے ۔ فنا کر ڈالتی ہے ۔ کم از کم ہندوستان کی عورت کا تو بیشک یہی حال ہے ۔ خود تو جان دے رہی ہے مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ مرد کا رویاں میلا ہو ۔ آشفتی و تسلی کا دھیان آخری سانس تک قائم ہے ؎

رنج کرنا نہ میرا یوں فی الفور | سُن لو گر اپنی جان ہے تو جہان
دے نہ اُس کو خدا کبھی کوئی درد | ہوتا نازک کمال ہے دلِ مرد
دِل میں کُڑھنا نہ مجھ سی چھوٹ کے تو | جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو
رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں | تا نہ ہو جائے دشمنوں کا خوں

کبھی آجائے گر ہمارا دھیان ۔ جاننا ہم پہ ہو گئی قربان
دل میں کچھ آسنے دیجیو نہ ملال خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو آج دل کھول کر گلے مل لو
خوب سا آج دیکھ بھال لو تم دل کی سب حسرتیں نکال لو تم
دل میں باقی رہے نہ کچھ ارمان خوب مل کر گلے سے ہیں قربان
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں ہم کہاں، تم کہاں یہ رات کہاں
دل کو اپنے کو دلول نہیں روتے دھونے سے کچھ حصول نہیں

اپنی آنکھوں سے ندی نالے جاری کر رکھے ہیں، لیکن مرد کے چہرہ کی اُداسی دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے

رو نہ اس طرح سے تو زار و قطار دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار
کر نہ رو رو کے اپنا حال زبوں ارے ظالم ابھی تو جیتی ہوں
اشک ہوتے ہیں ناگوار ترے تو نہ رو ہو گئی نثار ترے
ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں یوں کہیں مرد بھی روتے ہیں
تو سلامت جہاں میں رہ مری جان نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان
واسطے میرے اپنا دل نہ کڑھا چاند سی بنّو گھر میں بیاہ کے لا
ہے یہی لطف زندگانی کا دیکھ سکھ اپنی نوجوانی کا

حسنِ بے شبانہ کی نیرنگیاں ختم ہو رہی ہیں، عشق فانی کی ساری لذتیں ایک ایک کر کے یاد آ رہی ہیں، اور چل چلاؤ کے وقت نفس پر ہجوم کر رہی ہیں ؎

کل گلے سے کسے لگاؤ گے یوں کسے گود میں بٹھاؤ گے

ہم تو اٹھتے ہیں اس مکان سے کل | اب تو جاتے ہیں اس جہاں سے کل
یاد اتنی تمہیں دلانے جائیں | پان کل کے لیے لگاتے جائیں
دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے | کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے
ختم ہوتی ہے زندگانی آج | خاک میں ملتی ہے جوانی آج
سمجھ اس کو شب برات کی رات | ہم ہیں مہمان تمہارے رات کی رات
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا | نہ ملا کچھ مزہ جوانی کا
باغ عالم سے نامراد چلے | دل میں لے کر تمہاری یاد چلے
پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار | کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار
لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی | بو سنگھادو تم اپنے بالوں کی
پھر ہم اٹھنے لگیں بٹھالو تم | پھر بگڑ جائیں ہم منالو تم
پھر لبوں کو چبا کے بات کرو | پھر ذرا مسکرا کے بات کرو

یہ آخری رازونیاز کتنی دیر؟ یہ زندگی کا آخری اختلاط کے گھڑی؟ جھلملاتی ہوئی چراغ کی آخری بھڑک کب تک؟ مادی لذتیں ختم اور جسم کے مزے ایک ایک کر کے تمام ہو رہے ہیں۔ ناسوتی صحبتوں کا تار تار بکھرنے کو ہے۔ نفس کی ہار ہی ہوئی، لیکن غیرت دار گنہگار مگر گناہ کی معترف، عزت لٹاتے ہوتے لیکن بہرحال پاس عزت رکھنے والی پردہ نشیں کی آنکھوں سے پردے ہٹ رہے ہیں۔ آج ختم ہو رہا ہے، "کل" شروع ہو رہا ہے۔ حسن و جوانی، نزاکت و رعنائی، چہرہ کا رنگ و روغن، سب کی نمود مٹی ہی سے تھی اور سب مٹی ہی میں ملے جا رہے ہیں رفاقت پر کوئی آمادہ نہیں۔ حاضری اس دربار میں درپیش ہے، جہاں بدکاری الگ رہی، ایک ایک بدنظری کا پورا پورا حساب درج ہے، سامنا اس مالک کا کرنا ہے، جس نے خلاف قانون آنکھ اٹھانے تک پر بازپرس رکھی ہے۔ روبکاری اس حاکم کی عدالت میں ہے

جس کی ہیبت سے بڑے بڑے متقی اور صالحین لرزتے رہتے ہیں یہ نازک جسم اور نازک ترکیب رکھنے والی، گناہوں کے بوجھ سے لدی ہوئی، حرام موت مرنے والی لڑکی، اس نازک گھڑی میں آخر کس کا سہارا پکڑے، اور کس کی نگاہ کرم کی آس لگائے؟ اے ہر مشکل کو آسان کرنے والے اس دکھیاری کی مشکل کو تو ہی آسان کر تیری ہی ستّاری کا دامن اس بے چادر کی پردہ پوشی کر سکتا ہے۔ تیرے ہی بحر مغفرت کا ایک قطرہ اس بدنصیب کے نامۂ عمل کی سیاہیاں دھو ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ تیری یاد سے غفلت بے شبہ تھی، پر تیری حکومت سے سرکشی نہ تھی۔ نفس کی لغزشیں یقیناً تھیں پر تیرے احکام سے جان کر بغاوت نہ تھی۔ ایمان کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ڈھارس بندھاتی ہے۔ فاتحہ، قرآن خوانی اور دعائے خیر کی قدر "آج" کنگھی چوٹی کے مشغلہ نے نہ کرنے دی، "کل" کے لئے سب سے زیادہ قیمتی چیزیں یہی نظر آ رہی ہیں ؎

اب تم اتنی دعا کرو مری جان — کل کی مشکل خدا کرے آساں
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
دیکھیے کس طرح پڑے گی کل — سخت ہوتی ہے منزل اول
میرے مرقد پہ روز آنا تم! — فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
گو میں دنیا سے روسیاہ چلی — لیکن اپنی سی میں نباہ چلی
جی کو تم پر فدا کیا میں نے — حق وفا کا ادا کیا میں نے

کانپتے ہوئے جسم، زار و قطار آنکھوں، لرزتی ہوئی زبان کے ساتھ، دل کی بپتی بیان ہو رہی تھی کہ رات تمام ہو جاتی ہے۔ اور اس کمسن نازنین کے ڈوبتے ہوئے دل کی طرح، آسمان کے تارے بھی ایک ایک کر کے ڈوبنے لگتے ہیں۔ صبح کا گھڑیال بجتا ہے، اور اس کے ساتھ نا...

کرشموں کے جنجال میں پھنسے ہوئے جوڑے کی آخری ملاقات بھی اس عالم آب و گل میں ختم ہو جاتی ہے۔ کلمہ کی آواز کبھی کی سُنی سُنائی کان میں پڑی ہوئی تھی، وہی اس آڑے وقت پہ کام آئی ہے۔

ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد — دست و پا تھرتھرا کے ہو گئے سرد
بید کی طرح جسم تھرایا — سر سے لے پاؤں تک عرق آیا
باتیں جو کرتی تھی سو بھول گئی — دم لگا چڑھنے سانس پھول گئی
بولی گھبرا کے رہیو اسکے گواہ — اور کہا لا الٰہ الا اللہ
اب فقط ہے یہ خون بہا — بخش دیجو کہا سنا میرا
سر سے لے کر بلائیں تا بقدم — بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کم بخت — بام پر آئی تھی میں کون سی وقت

یہہ کہا اور سوار ہو گئی، چند گھنٹوں کے بعد محلہ میں شور و شین برپا ہوا جب دیکھا تو سوداگر کے گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ گنہگار شریف زادی نے جو کہا تھا، کر دکھایا۔ جوانی کی نیند مشہور ہے لیکن یہہ زہر کھا کر وہ نیند سوئی تھی جس میں قیامت تک بیداری نہیں۔ یہ ہے "آغاز" کی بدمستیوں کا "انجام"! پھولوں کی سیج پر رات بسر کرنے والی کو آخری چادر وہی کفن کی نصیب ہوئی! اتنی جلد! اس کم سنی میں! ایسی ایسی آناً فاناً!

جوان جہان اولاد، نازوں کی پالی اکلوتی اولاد، کون انسانی سینہ تھا جو اس داغ کو آسانی سے برداشت کر سکے؛ لڑکی ماں کی آنکھ کا تارا، باپ کے کلیجہ کا ٹکڑا، اندھیرے گھر کا چراغ، سات بیٹوں سے بڑھ کر پیاری تھی، گھر بھر میں کیا معنی محلہ بھر میں ہنگامۂ محشر برپا ہو گیا۔ بوڑھے والدین کی یہ حالت کہ کھڑے کھڑے پچھاڑیں کھا کھا کر گرتے تھے،

اور بہن کچھ اس درد کے ساتھ کر رہے تھے، کہ اپنے تو خیر اپنے تھے، راہ چلتے بیگانوں کی ہچکیاں بندھ بندھ جاتی تھیں۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں، جنہوں نے گودوں میں کھلا کھلا کر پالا تھا، نہالچوں پر تھپک تھپک کر سلایا تھا، ساتھ کی کھیلی ہوئی سہیلیاں اور ہمجولیاں، کوئی پردہ کے اندر، کوئی پردہ کے باہر، دوپٹہ کا ہوش نہ چادر کی خبر، منہ پیٹنے، بال نوچنے میں مصروف غسل و کفن کے بعد جب جنازہ مرتب ہو کر چلا ہے، تو اس سج دھج کے ساتھ کہ بن بیاہی نامراد کے تابوت پر دھوم کا بیاہی ہوئی دلہن کے ڈولے کا اب بے شک دلہن ہی تھی، آج رخصتی اس دیس کو ہو رہی تھی، جہاں سے پھر کوئی میکہ واپس نہیں آتا

شامیانہ نیازری کا ہے نیچے تابوت اس پری کا ہے
سہرا اس پر بندھا ہے اک زرتار جیسے گلشن کی آخری ہو بہار
عود سوز آگے آگے روشن تھے مرگئے پر بھی لاکھ جوبن تھے
بھیڑ تابوت کے تھی ایسی ساتھ جیسے آئے کسی دلہن کی برات

خیر، اور تو جس پر جو بیت رہی تھی، بیتی ہی، آہ اس ماں کی ماری کا کیا حال تھا جس کی ہری بھری گود ابھی خالی کرائی گئی تھی عمر بھر کی کمائی دم کے دم میں واپس لے لی گئی تھی کلیجہ ابھی ابھی تیروں سے چھد چکا تھا۔ کس انسانی قلم میں قدرت ہے کہ اس کے داغ دل کا نقشہ صفحۂ کاغذ پر کھینچ سکے! آہ کہ جس کے دل میں بیٹی کی مانگ بھرنے کا ارمان ڈالا گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس لاڈلی کو کفن پہنایا جا رہا ہے! آہ کہ جو آنکھیں بیٹی کا سہاگ دیکھنے کے انتظار میں نور حاصل کر رہی تھیں، انہیں کو آج سینکڑوں من مٹی کے نیچے دفن ہوتے دکھا کر بے نور کیا جا رہا ہے!

تو اب مرنا! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، کہ تو نے کوکھ اجڑ جانے والی ماں

کے جذبات کی تصویر بھی کاغذ پر اتار کر رکھ دی ہے۔ ماں کے منہ سے یہ بول نکل رہے ہیں یا دل و جگر کے ٹکڑے کٹ کٹ کر آنکھ اور زبان کی راہ سے خارج ہو رہے ہیں؛ ؎

تیری میت پہ ہو گئیں ہیں نثار ۔۔۔ کم سخن ہائے میری غیرت دار

دل پہ جو گذری کچھ بیان نہ کی ۔۔۔ کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی

کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو ۔۔۔ کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو

دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں ۔۔۔ بیٹیا ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں

تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا ۔۔۔ گھر مرا آج بے چراغ ہوا

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے ۔۔۔ جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

زہر دیدے کوئی تو کھا جاؤں ۔۔۔ یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں

داغ تیرا جگر جلاتا ہے ۔۔۔ چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے

بیاہ تیرا رچانے پائی نہیں ۔۔۔ کوئی منت بڑھانے پائی نہیں

تیری صورت کے ہو گئی قربان ۔۔۔ چلیں دنیا سے کیسی پر ارمان

ہوئی کس بات پر خفا بولو ۔۔۔ اماں واری ذرا جواب تو دو

بولتی تم نہیں پکارے سے ۔۔۔ اب جیونگی میں کس سہارے سے

کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا ۔۔۔ آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان ۔۔۔ ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان

ایسی اماں سے ہو گئیں بیزار ۔۔۔ لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار

عمر کٹنی تھی ایسے صدمہ میں ۔۔۔ ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

مشرق کے بدنام سخن گو، اردو کے بدنام شاعر، رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا، تیرا

یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا، تیرے نام پر بھی موت نہ آنے پائے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں کی داستان کو خوب پھیلایا، شاید کسی کی رحمت بے حساب پزیرکیہ کر کے لیکن انہیں غافلوں اور سرمستوں کو موت و انجام کی یاد دلا دلا کر بھی خوب رُلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے عجب کیا کہ خدائے آمرزگار، اس عالم کا ستار اور اُس عالم کا غفار، تیری خطاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامنِ عفو و مغفرت کے سایہ میں لے لے، اور تیرے کلام کے درد و عبرت، تیرے بیان کے سوز و گداز کا حصہ بھی تجھے عطا کرے، اپنی ہی رحمت کی مناسبت سے، اپنے ہی کرم کے حساب سے!

الفاظ کا جادو[1]

اگر آپ کا تعلق اونچے طبقہ سے ہے تو کسی "سرا" میں ٹھہرنا آپ کے لئے باعث توہین، لیکن کسی "ہوٹل" میں قیام کرنا ذرا بھی باعث شرم نہیں۔ حالانکہ دونوں میں کیا فرق بجز اس کے ہے کہ "سرا" مشرقی ہے، ہندوستانی ہے، دیسی ہے، اور "ہوٹل" مغربی ہے، انگریزی ہے، ولایتی ہے۔ کوئی اگر یہ کہدے کہ سرا کے فلاں "بھٹیارے" سے آپ کا یارانہ ہے تو آپ اس کا منہ نوچ لینے کو تیار ہو جاتے ہیں، لیکن فلاں ہوٹل کے "مینجر" سے آپ سے بڑا ربط و ضبط ہے، اسے آپ فخریہ تسلیم کرتے رہتے ہیں! حالانکہ سرا کے "بھٹیارے" اور ہوٹل کے "مینجر" کے درمیان بجز ایک کے دیسی اور دوسرے کے ولایتی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ کسی مدرسہ میں اگر آپ "مدرس" ہیں تو بس کچھ معمولی ہی سے، لیکن کسی "کالج" میں اگر آپ "لکچرر" یا "پروفیسر" ہیں تو معزز ہیں، صاحب وجاہت ہیں، حالانکہ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے "مدرس" اور "پروفیسر" بالکل ایک چیز ہیں۔

ندوہ کے "دارالاقامہ" میں اگر آپ قیام پذیر ہیں تو آپ کا دل کچھ خوش نہیں ہوتا، لیکن اسی "دارالاقامہ" کا نام جب آپ "شبلی ہوسٹل" سنتے ہیں تو آپ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے! "مدرسہ" میں اگر آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں تو خود اپنی نظروں میں آپ

---

[1] سچ ۔ جلد ۷، نمبر ۳۴ مورخہ ۲۰ جون ۱۹۳۱ء نظر ثانی مارچ ۱۹۴۴ء

بے وقعت ہیں، لیکن اگر آپ کا تعلق کسی "کالج" سے ہے، تو پھر آپ سے زیادہ معزز کون ہے؟
اب ہر "مدرسۂ طبیہ، طبیہ اسکول" ہے اور "مدرسۂ تکمیل الطب" اور "مدرسۂ منبع الطب" اب "تکمیل الطب کالج" اور "منبع الطب کالج" ہیں۔ "مدرسۂ طبیہ و باجیہ" کا زمانہ گیا، اب اس کا صحیح نام "طبیہ و باجیہ کالج" ہے، طبی درسگاہوں کو چھوڑئیے، خود دینی درسگاہوں کا کیا حال ہے؟ وہ دن گئے جب زبانوں پر "مدرسۂ چشمۂ رحمت" کا تذکرہ تھا،

اب وہ "چشمۂ رحمت کالج" ہے اور وہاں کے "صدر مدرس" "پرنسپل" صاحب ہیں۔ فرنگی محل کے مدرسۂ نظامیہ کے سب سے بڑے استاد کو "صدر مدرس" ذرا کہہ کے تو دیکھئے، فوراً آپ کی غلطی کی تصحیح کی جائے گی کہ ان کا عہدہ اب "صدر مدرسی" کا نہیں "پرنسپل" کا ہے!

کوئی آپ سے کہے کہ کیا آپ گلی میں کھڑے ہو کے "گلی ڈنڈا" کا تماشہ دیکھ رہے ہیں تو آپ شرما جائیں گے، لیکن جب آپ "کرکٹ" "فٹ بال" یا "ہاکی" کا میچ کھلے میدان میں کھڑے دیکھ رہے ہوں گے، تو اس وقت نہ آپ اپنے بڑوں سے شرمائیں گے، نہ چھوٹوں سے! مینڈھے لڑاتے ہوئے یا بٹیر بازی یا مرغ بازی کرتے ہوئے اگر آپ کہیں پکڑ لئے گئے تو آپ اپنے کو کسی کے سامنے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھیں گے، لیکن جب آپ کے شہر میں Boxing کا مقابلہ ہوگا، یا کوئی Heavy Weight Champion آجائیں گے تو ان کے کمالات کا تماشہ دیکھنا روشن خیالی میں داخل! کہیں چوری چھپے "رہس" یا "نوٹنکی" دیکھنے کھڑے ہو جائیے تو خود آپ کی ثقاہت اور وضعداری آپ پر لاحول پڑھنے لگے، لیکن "تھیٹر" میں آدھی آدھی رات بے تکلف بسر کیجیے کہ "ڈرامہ" جیسے فن شریف کی شرافت و عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟ اپنے دیس کے کسی بھانڈ، کسی سازندہ، کسی ڈھاڑی سے، اگر آپ سے شناسائی ہو گئی ہے تو اس کا ذکر آپ اپنے دوستوں اور بے تکلف ہم عمروں کے سامنے بھی کچھ جھینپ جھینپ کر

کرتے ہیں، لیکن چارلی چپلن اور بیسری پکفرڈ کے کمالاتِ فن اور "آرٹ" کی جتنی داد جی چاہے دیجئے بھری محفلوں میں بزرگوں اور اُستادوں کے مجمع ہیں، اور اخبارات کے صفحات میں آپ کی نقادی ہی کی داد ملتی چلی جائے گی! "نٹوں" کا پیشہ بھی بھلا کوئی عزت کا پیشہ ہے اور خدا نخواستہ آپ سے کسی نٹ یا نٹنی سے ملاقات کیوں ہونے لگی، لیکن وہی قلابازیاں کھانے والے، جب سرکس والے اور سرکس والیاں بن کر آپ کے سامنے آتے ہیں تو نہ آپ ان سے ملنے میں شرماتے ہیں نہ ان سے تعلقات بڑھانے ہیں!

جوئے یا جواریوں سے، ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کوئی ہمیں جواری کہہ دیکھے، اپنی جان اور اس کی جان ایک کردیں، لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیول کی راتوں میں، دن دہاڑے اور بجلی کی روشنی میں، یہی ذلت ہمارے لئے عین عزت بن جاتی ہے اور بڑے سے بڑے شریف و معزز نہ جوئے کی بازی لگاتے شرماتے ہیں، اور نہ اپنے کو ریس باز" کہلاتے! "نخاس میں کسی "کباڑیئے" کی دوکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لئے باعثِ ننگ، لیکن مال روڈ پر "پیک ایلین" کی کوٹھی پر گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ شرم، اسلئے کہ پیک ایلین صاحب کوئی "کباڑیئے" تھوڑے ہی ہیں، "آکشنر" اور نیلامیئے" ہیں! چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خرید لیجئے تو جاننے والوں کی نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ویلیریلو کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر بلا تکلف روکئے اور کیک و پیسٹری کی خریداری بنفسِ نفیس بے جھجک فرمایئے، اسلئے کہ "ویلیریو" حلوائی نہیں "کنفکشنر" ہے! نظیر آباد کے چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خودداری کے منافی لیکن حضرت گنج میں "صاحب" کی جگمگاتی ہوئی دوکان پر بیٹھ کر

اس کریم زشتی فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق ہے کسی "نائی" کی دکان کا نام اگر "ہیئر کٹنگ سیلون" پڑھ جائے تو ذہنی عار فخر میں تبدیل ہو جائے۔ "نائی" بے چارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام، اس سے مشترے اور کسرت کے آگے سر جھکانا آپ کیونکر گوارا فرما سکتے ہیں، لیکن وہی نائی جب اپنے کو Hair Dresser کہلانے لگے، اور اپنی چھاپہ کی دکان پہ ہیر کٹنگ سیلون کا سائن بورڈ لگا دے، تو یہی اگوار آپ کے لئے بہ طیب خاطر گوارا و پسندیدہ بن جائے۔ عدالت کا پیادہ جب تک "چپراسی" یا "مذکور" ہے، حقیر و ذلیل ہے، لیکن وہی پیادہ اگر "بیلف" کہہ کر پکارا جاتا ہے تو معزز ہے اور آپ کی زبان پر محض بیلف نہیں بلکہ "بیلف صاحب" ہے! کوئی چمار یا موچی اس قابل کب ہوتا ہے کہ آپ اسے منہ لگائیں، لیکن وہی رذیل اگر کسی ٹینری (Tannery) کا مالک کہلانے لگے، تو سارا نسلی رذالت آپ کی نگاہ میں عزت و شرافت سے بدل جاتی ہے۔ اور ٹینیلے کے سب سے بڑے موچی باٹا (Bata) کی قوم سے تعلق رکھنا تو عین دلیل اعزاز! بستی کا ساہوکار یا مہاجن بڑے سے بڑا ہو، آپ کی نظر میں محض "بنیا" ہے لیکن وہی بنیا۔ اگر کسی بینک کا منیجر ہو جائے یا اپنے کو بینکر کہلانے لگے، تو دیکھئے اس کا مرتبہ دم بھر میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ کسی رئیس کا "مصاحب" آپ کی نظر میں، اخلاقی حیثیت بے عملی، خوشامد، چاپلوسی اور خود فروشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن صاحب کے "پرائیویٹ سیکریٹری" اور "اے ڈی سی" کا نام ادھر آیا اور ادھر معاً آپ کی نظروں میں وسعت و ستودگی رعب و دبدبہ کی تصویر پھر گئی! "پنچایت" کا نام آیا، اور آپ کے ذہن نے قصائیوں اور کنجڑوں، نائیوں اور دھوبیوں، اور دوسری "نیچ قوموں" کا تصور شروع کر دیا، لیکن ادھر پنچایت کے بجائے پارلیمنٹ اور اسمبلی، کونسل اور میونسپل بورڈ کے الفاظ بولے گئے اور آپ کا ذہن، ان فرنگی پنچایتوں کی بلندیوں پر رشک کرنے لگا۔

د

کوئی مولوی غریب اگر عالمگیری اور شامی کے جزئیات فقہی کا حافظ ہے، تو غبی ہے، کودن ہے، کندۂ ناتراش ہے، محض ملّا ہے، لیکن اگر کسی ایڈووکیٹ یا بیرسٹر صاحب کو ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے نظائر ازبر ہیں، تو ان کی قابلیت، خوش دماغی اور ذہانت کے اعتراف میں سب سے آگے آپ ہی ہیں! فسانۂ عجائب اور طلسم ہوشربا کے نام، آج مجال ہے کہ کوئی زبان پر لا سکے، لیکن لنڈن اور برلن، پیرس اور نیویارک سے کتنے ہی نئے نئے عجائب افسانے اور کتنے ہی ہوشربا طلسمات، اوروں کے نام سے سراغرسانی کے افسانوں کے نام سے سنسنی خیز خبروں کے نام سے رعشہ انگیز افتتاحوں کے نام سے صاعقہ اثر ڈراموں کے نام سے اور خدا معلوم کن کن ناموں سے ہر سال اور ہر ماہ ہر ہفتہ اور ہر روز ہر صبح اور ہر شام شائع ہوا کرتی ہیں، ان سے باخبر رہنا اور پوری دلچسپی و انہماک کے ساتھ ان کے نشر و اشاعت میں، ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہنا روشن خیالی کی دلیل اور مہذب و تعلیم یافتہ ہونے کی سند! کوئی آپ کو صلاح دے کہ "لوہاری" کا پیشہ اختیار کیجئے، تو آپ اسے گالی سمجھیں لیکن "میکینکل انجینئری" کے عہدہ کی طرف آپ خود لپک لپک کر بڑھ رہے ہیں۔ "جراح" کے لفظ سے جو تخیل آپ کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کس درجہ پست ہے، لیکن "سرجن" کے نام لینے سے اس پستی میں کتنی بلندی آجاتی ہے، محلہ اور پڑوس کے "جلاہے" آپ کے خیال میں پست دا دنٰی، لیکن کپڑا بننے والے اگر لنکاشائر کے ہیں، تو کیا ان کی بابت بھی آپ کا یہی خیال ہے؟ "بزاز" گز ہاتھ میں لئے اور مزدور کے سر پر گٹھری اٹھائے شہر میں پھیری کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی کوئی عزت و وقعت یقیناً نگاہ میں نہیں، لیکن وہی کپڑا بیچنے والے اگر مانچسٹر کے باشندے ہیں تو بس معززین بلند ہیں! "بزرگوں" کے سالانہ فاتحے منانا دلیل حمق و علامت وہم پرستی، لیکن فلاں لوارہ کے احاطہ میں "فاؤنڈرس ڈے" یا "یوم اسیس" دھوم دھام سے منانا، دلیل دانش و برہان روشن خیالی۔

لکھنؤ کے چوک یا دہلی کی چاوڑی کی کسی پیشہ ور کا نام آپ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنے کسی بزرگ کے سامنے نہ لیں گے۔ نہ کبھی ناچ مجرا دیکھنے کھلم کھلا تشریف لے جائیں گے کسی ڈرائنگ روم میں گھر کے سب مردوں اور عورتوں کے سامنے ریڈیو پر بے تکلف آپ فلاں بائی جی اور فلاں بیگم صاحبہ کے نغموں سے لطف اٹھائیں گے! اور فلم ایکٹرس جو بھی آپ کے دل میں جگہ کر لے گی، پوری بیباکی سے آپ اس کے چرچے ہر چھوٹے بڑے کے سامنے کریں گے۔

کوئی کہاں تک گنتے اور ناموں اور لفظوں کی کتنی لمبی فہرست تیار کرے۔ نمونہ کے لئے یہ بھی کافی ہی نہیں، کافی سے زائد ہیں۔ اپنی واقفیت کی دنیا میں خود نظر دوڑائیے اور دیکھ لیجئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں، معاشرت و معاملت کے ہر گوشہ میں، فرنگیت کا کتنا دماغی رعب ہم پر، اور آپ پر چھایا ہے۔ حقیقت ایک ہوتی ہے معنی و مفہوم متحد ہوتے ہیں لیکن جو لفظ اور جو نام، فرنگیت کے راستہ سے "صاحب" کے رشتہ سے، آپ کے کانوں تک پہنچے ہیں، ان میں ان کے دیسی مترادفات سے، کتنی زیادہ عظمت، کتنی زیادہ اہمیت، کتنی زیادہ بلندی ہمارے دلوں اور دماغوں نے غیر محسوس طور پر قبول کرلی ہے! اگلوں نے بہت کیا تو یہی کیا تھا کہ ملک فتح کر لئے، قلعے سر کر ڈالے، فوجوں کو میدانِ جنگ میں شکست دے دی۔ اس سے زیادہ نہ چنگیز سے کچھ بن پڑا، نہ ہلاکو سے، نہ دارا سے نہ سکندر سے، یہ شرف مخصوص صرف اسی دور یا جوجی کے لئے اٹھ رہا تھا کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی فتح کر لئے جاتے ہیں، اور اُفقوں پیسروں کے علاوہ عقلوں دماغوں اور بصیرتوں سے بھی خطِ غلامی لکھا لیا جا تا ہے کہ یہاں تک کہ غریب محکوموں کے پاس خیر و شر، حسن و قبح، ہنر و عیب کا معیار لے دے کے بس یہی ایک رہ جاتا ہے کہ "صاحب" کی چشم التفات کدھر ہے؛ عزت بھی صاحب کی دی ہوئی، اور دولت بھی سرکار کی مرحمت کی ہوئی۔ دین بھی وہیں کا عطیہ، اور

دُنیا بھی وہیں کی بخشش، اب نہ ہندو، ہندو ہے، نہ مسلمان، مسلمان ۔ سب "رعایائے سرکار"۔ اب مسلمان نہ زید ہے نہ عمر، نہ بکر، اور ہندو، نہ رام ہے نہ کرشن، نہ گوبند، بلکہ سب کے سب چھٹے چھٹائے "صاحب دین"

اسماء نکرہ اور الفاظ عمومی کو بھی چھوڑ دیئے۔ قیامت یہ ہے کہ اعلام اور اسماء معرفہ تک یورپ زدگی کی ذلت سے محفوظ نہیں ۔ میاں "کالو" کو آپ نے اپنے ہاں جب دیکھا "یکہ بانی" ہی کرتے پایا، لیکن میجر بلیک (Black) آپ کے شہر کے سول سرجن ہیں یا "کلو مہتر" آپ کے محلہ ہی میں رہتا ہے، لیکن پروفیسر بلیکی" (Blackie) یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر ہیں! "لالہ گھاسی رام" بیچارے کانجی ہاؤس" کی محرری سے عمر بھر آگے نہ بڑھ سکے، لیکن بریگیڈیر جنرل ہے" (Hay) برطانوی فوج کے ایک مشہور و معروف افسر ہیں! "میاں رمضانی" اور میاں شراتی کی ساری عمر خدمتگاری میں گذری لیکن مسٹر "مے" (May) اور ڈاکٹر شرائڈ سے (Shrimpton) پارلیمنٹ کے نامور ممبر ہیں! "پھیٹوا" کہار اور "طوطا" کلوار آپ کی بستی ہی میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں، لیکن سر جان پارٹرج" (Partridge) آپ کے صوبہ کے گورنر تھے، مسٹر "کاک" (Cook) اسوقت تک آپ کے ضلع کے کلکٹر ہیں، اور مسٹر سوان (Swan) صاحب ابھی تبدیل ہو کر کمشنری پر گئے ہیں! آپ کی ماما کا لڑکا "شیرا" بیچارہ اب تک چپراسی کی جگہ کی امیدواری کر رہا ہے لیکن "بل" صاحب (Bull) ترقی پا کر کمشنر ہو گئے اور مسٹر لیمب (Lamb) اور مسٹر کِڈ" (Kid) آپ ہی کے ضلع میں حاکم بندوبست اور جائنٹ مجسٹریٹ ہیں! "دریاؤ سنگھ" غریب کو لائن جمعداری سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا ۔ سر جان لیک (Lake) دیکھتے دیکھتے ای،

آئی آر، کے ایجنٹ ہوگئے! لالہ گوباردی مل" کے چیلا نے عرائض نویسی کا کام بھی نہ چھوڑا،
جسٹس اسمتھ (Smith) ہائی کورٹ کی ججی پر پہنچ گئے! شیخ بھجاؤ" کی
زندگی نوربانی کرتے کرتے ختم ہوگئی سرچارلس ووڈ" (Woodhead) حکومت
ہند کے مرحوم ممبر ہیں! جنگلی" گیارہ بے چارہ عمر گھاس ہی چھیلا کیا، مرجان نورٹر (Forestry)
سنا ہے کہ امریکہ میں برطانیہ کے کانسل جنرل ہوگئے!

"قصۂ گل بکاؤلی" بھی کوئی کتابوں میں کتاب ہے؟ عجب نہیں کہ ایک سنجیدہ مقالہ میں اس کا نام دیکھتے ہی بہت سے ہونٹوں پر تبسم آجائے۔ لیکن کیا حرج ہے، اگر کبھی کبھار، خلافِ وضع صحتوں کا بھی تحمل کر لیا جائے، اور پھر دُنیا میں یُوں بھی تو بارہا ہوا ہے، کہ پھٹی پُرانی گدڑیوں کے اندر سے لعل و جواہر نکل آئے ہیں۔

کوئی بادشاہ کہیں کے زین الملوک نام ہیں، اُن کے چار لڑکے پہلے سے موجود ہیں۔ پانچواں تاج الملوک پیدا ہوتا ہے۔ ایک مدت کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی بادشاہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اطبا نے کہا کہ شفا صرف اُس پھول سے ممکن ہے جو بکاؤلی پری کے چمن میں ہے۔ چاروں نوجوان شہزادے اس کی تلاش میں روانہ ہوتے ہیں، اور سفر کرتے کرتے ایک مشہور بیسوا کے دروازہ پر پہنچتے ہیں۔ مکان کے اندر داخلہ کی فیس ایک لاکھ زرِ نقد ہے۔ دولت کے نشہ میں اندھے شہزادے اس کے مکان پر پہنچ کر، اطلاع کے نقارے پر چوب لگاتے ہیں۔ کتاب کوئی اخلاق کا پندنامہ نہیں عشق و عاشقی کا افسانہ ہے، چاہیے تھا کہ مصنف بیسوا کے ذکر میں کھل کھیلتا، اور اس "پری جمال" کے حسن و شباب کی مصوری اس انداز سے کرتا کہ پڑھنے والے نوجوانوں کے دل میں شوق و اشتیاق کی آگ بھڑک اٹھتی، لیکن برعکس اس کے دیکھیے تو سہی کہ اسی موقع پر نظر الفاظِ ذیل سے دوچار

---

[1] سچ۔ جلد ۸ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۳۲ء۔ نظرِ ثانی مارچ ۱۹۴۲ء

ہوتی ہے :-

"سنتے ہی اس مکار حرّافہ نے دل میں کہا کہ الحمدللہ مدتِ مدید کے بعد
. . . ایسے موٹے تازے شکار نے میرے جال میں آنے کا ارادہ کیا
غالب ہے کہ دام میں پھنسے، پھڑک پھڑک کر مرے۔ نقل مشہور ہے کہ یہ طائفہ
اسی تردد میں رہتا ہے کہ کوئی عقل کا اندھا گانٹھ کا پورا ملے، ہو خدا نے ویسے
ہی شخص بھیجے ہیں۔"

ان الفاظ کو، خصوصاً جو عبارتیں زیرِ خط کر دی گئی ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد فرمائیے اگر شوق و تمنا کی آگ کچھ بھڑکی، یا جو تھی وہ بھی ٹھنڈی ہو کر خاکستر بن گئی ؟ کتاب ترقیوں کے دور سے بہت قبل کی تصنیف ہے، مصنف تاریکی کو روشنی، عیب کو ہنر، زہر کے پیالہ کو شربت کا پیالہ کہہ کر پیش کرنے کے آرٹ سے ناواقف ہے۔ وہ بدی کے چہرہ پر حسن و زینت کا نقاب ڈال کر اسے پیش نہیں کرتا، وہ بدی کی جب مصوری کرتا ہے، تو ساتھ پکار کر کہہ بھی دیتا ہے کہ یہ بدی ہے للہ اس کے فریب میں نہ آنا۔

بیوا ایک چالاکی کے ساتھ شطرنج کا کھیل کھیل کر اپنے ان آنے والے امیر زادوں کو ہرا دیتی تھی، اور پھر ان کی جائیداد لے لیا، انہیں قید میں ڈال دیتی تھی۔ یہی ماجرا ان چاروں شہزادوں کو بھی پیش آیا۔ بالآخر پانچویں شہزادے تاج الملوک نے اپنی چالاکیوں کی وجہ سے بیوا کو ہرایا۔ اور اس کی قید سے اپنے بھائیوں کو چھڑایا۔ یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب کے سب شہزادے اپنے نابینا والد کی آنکھ کے علاج کے لئے تلاشِ گل بکاؤلی میں گھر سے نکلے تھے۔

مشرق کی بازاری کتاب کے مصنف کا قلم ان واقعات سے نتیجہ یہ نکالتا ہے :-

"اے عزیز، تو نے معلوم کیا کہ یہ میں نے کیا کہا اس بات کا حاصل یہ

اُس کا لقمہ بناتے، مگر خضر راہنما کی دستگیری سے بچے تو بچے۔ اے بلیوادیہ
ذکر میں نے اس واسطے کیا جو تو جانے کہ طاقتِ جسمانی، طاقتِ روحانی
پر زیادتی نہیں رکھتی، اب تجھے یہ لازم ہے کہ توریت بچشم کے شہزادوں
کو، جو تو نے اپنے مکروفریب سے قید کیا ہے، چھوڑ دے اور حق تعالےٰ تجھ
کو بھی دوزخ کی قید سے نجات دے گا۔"

یہ آپ کوئی مبتذل و عامیانہ افسانہ پڑھ رہے ہیں، یا کسی عارف کے حلقۂ موعظت و معرفت میں بیٹھے
ہوئے ہیں؛ یہ مشرق کی گری ہوئی تصنیف ہے، آپ اس کے مقابلہ میں کسی بلند پایہ قصّہ کو دیکھئے۔
تاج الملوک جب آگے بڑھنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گُلِ بکاؤلی" قلعہ بکاؤلی
کے اندر ہے۔ اور اس کے پہرے پر اٹھارہ ہزار دیو متعین ہیں۔ شہزادہ اس سے ہراساں اور بے آس
نہیں ہوتا۔ رفتہ رفتہ دیووں کو رام کرتا ہے، اور دیووں کی ایک بڑھی سرداری حمالہ کا دل
اس حد تک اپنی مٹھی میں لاتا ہے کہ وہ اپنی پروردہ شہزادی محمودہ کا نکاح اس کے ساتھ کردیتی ہے
افسانہ نگار کا ذہن اس مجاز سے حقیقت کی جانب منتقل ہوتا ہے۔

- اے عزیز روشنی چشم ظاہر بین کی سات پردوں میں ہے اور تجلی باری تعالیٰ
کہ نورِ دیدۂ اولیا ہے، ستر ہزار پردے میں ہے۔ اگر یہ ارادہ ہو کہ
وہ پردے درمیان سے اُٹھیں تو پہلے اس بڑے نگہبان دیو نفس کا حجاب
بیچ سے اٹھا کر اس کو بس میں کر، کہ وہ لعین اپنی کجروی کو چھوڑ کر محمودہ[۱] کے
مقام میں پہنچا دیتے، لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اگر دیو سے اٹھا لیجئے تو سیدھا
پڑے۔"

بکاؤلی بیدار ہوتی ہے، اور اس عزیز و عزیز الوجود پھول کو اپنے باغ سے غائب پاکر، سخت

[۱] تلمیح ہے قرآن پاک کے "مقاماً محموداً" کی جانب

پریشان اور ملول ہوتی ہے، پریخانہ کی کنیزیں اور خواصیں صدہا کی تعداد میں ہیں، سب کی تلاش و سعی بیکار ثابت ہوتی ہے، بالآخر لکا ذی خود اس "چور" کی جستجو میں نکلتی ہے۔ اپنے کو نوجوان مرد کی ہیئت میں تبدیل کرتی ہے، اور تلاش و جستجو میں طرح طرح کی تکلیفیں اور ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرتی ہے۔ افسانہ نگار اس موقع کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اور آئین افسانہ نگاری کو بھول بھال یوں درس معرفت شروع کر دیتا ہے:-

"سبحان اللہ کیا الٹی بات ہے کہ معشوق طالب عاشق کا ہوا، اور عاشق اس کا مطلوب، لیکن نظر تحقیق سے جو غور کرے تو سیدھی لگے، کیونکہ جب تک معشوق کو خواہش عاشق کی نہ ہو، اس کی چاہت اکارت ہے اور کوشش بے فائدہ۔ آتش طلب کی جو عاشق کے گریبان سے مشتعل ہے، فی الحقیقت لگائی ہوئی معشوق کی ہے سے

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
گر نہ سوزد شمع، کے پروانہ شیدا می شود

بات بڑھ گئی، قلم کہتا ہے۔ اے شخص بس کر، میں نے لکھنے میں بہت سی کوشش کی، اور ہاتھ اپنی سعی کا دعوٰی کرتے ہیں کہ قلم سے کیا کیا ہم نے لکھا۔ بازو اپنے تردد کا دم مارتا ہے کہ دست و قلم سے کیا ہوا، جو کچھ کیا سو میں نے کیا۔ غرض اس طرح اسباب تحریر کے بڑھے، اور ایک پر ایک کو فوقیت ہوتی گئی، دفعتہ ایک ایسا سبب پایا گیا کہ وہ محتاج کسی کا نہ تھا، پس

ہیں تیسرا پیکرِ معانی جو مانندِ مردِ کامل ہے، بصورتِ زنانِ ناقص العقل
چھپ جانے گا، پس اس وقت شکیبائی کے سوا کچھ چارہ نہیں۔ چاہیئے کہ دم بخود
ہو کر بحرِ دریائے ذکرِ الٰہی میں غوطہ مارے، اس کے بعد جو سر اٹھائے گا
وہی عصا ہاتھ میں، اور وہی ٹوپی سر پر رکھے گا؟

یہ وہی کتاب ہے، جسے آپ اب تک سر بسر بازاری اور مبتذل سمجھے ہوئے تھے، اور جس کا
ذکر تک سنجیدہ صحبتوں میں آپ کو گوارا نہ تھا؛

تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ، اور باہم عقد کے خواہاں
ہیں، لیکن کہاں پری اور کہاں آدم زاد۔ بکاؤلی کی ماں بگڑی ہوتی ہے کہ جاکی کے ساتھ اپنی زیر نظر
کا پیوند کر کے پرستان بھر کی عزت کیسے ڈبو دی جائے۔ بکاؤلی کی ایک خالہ تاج الملوک پر
مہربان ہو جاتی ہے۔ اس کی سفارشی بنکر اپنی بہن کے پاس جاتی ہے۔ گفتگو یہی چھڑتی ہے اور
اور اس وقت یہ پری رومی و غزالی کی زبان میں حقیقت انسانی پر، یوں ایک مقالہ سنا جاتی
ہے :-

- سچ کہتی ہے، لطیفہ کو ہم صحبت کثیف کرنا البتہ دانائی سے بعید ہے
لیکن تو حضرت انسان کے کمالوں سے اگر واقف ہوتی تو ایسے ایسے
خیال فاسد دل میں ہرگز نہ لاتی۔ سن لے نادان، بشر خلیفہ یزداں ہے،
اور اس کی صفت بے پایاں، مخلوقات میں اشرف اور افضل ہے۔
اس کے مرتبوں اور درجوں کی انتہا نہیں۔ وہ ایک نہنگ ہے دریا کا بہنے
والا، اور ایک قطرہ ہے حقیقت میں دریا۔ جامع کمالات علم کونی و
الٰہی کا، یعنی مادیات اور مجردات کا اور مجمع ہے مراتب بندگی اور

بادشاہت کا ؎ انسان کی ذات برزخ جامع ہے بے گماں
ظل خدا و صورت خلق اس میں ہے عیاں

جان، کہ صوفیا ہر ایک کو عالم ارواح کے نوعوں میں سے باری تعالیٰ کے
ایک ایک اسم اور صفت کا مظہر خاص جانتے ہیں اور اس عالم صورت
کو کہ جو اس ظاہری اور باطنی سے نسبت رکھتا ہے اس عالم کا سایہ۔ پس
ہر ایک ذرہ فرد کائنات سے روشن ایک تجلی ابدی اور سیراب ایک
قطرہ سرمدی سے ہے ؎ برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اس عالم میں انسان کے سارے افراد کون و فساد اس کے لازمی ہیں۔
خدا کے سارے اسموں اور صفتوں کا مصدر ہے، اور اس کی تجلیات
خاص کا مقام۔ کلام فضیلت انسان میں دریائے بے پایاں ہے، اس قدر
پر اکتفا کیا گیا"

مغربی افسانوں، اور ناولوں، ڈراموں اور ناٹکوں، تھیٹروں اور سینما گھروں پر اس طرز تعلیم کا کوئی
سایہ بھی پڑنے پایا ہے؟

تاج الملوک ایک بار پھر آوارہ وطن ہو کر فقیرانہ لباس میں پردیس میں گھوم رہا ہے
گردش سوار ہے، اس ملک کا وزیر ایک سازش کر کے اس بیگناہ کو گرفتار کراتا ہے۔ فسانہ نگار
اس بات سے بھی ایک بات پیدا کر لیتا ہے:۔

"سچ ہے کہ جو کوئی حکمت حکیم مطلق کی نگاہ غور تامل کی نظر سے دیکھے تو کسی
چیز کو خالی شر سے نہ پاوے، اور ہر ایک شر کے بعد خیر ملاحظہ کرے

اے عزیز، حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو بدن سے رُخصت دی ہے، پس
جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو، حقیقت میں رُوح سے ہے۔ فرض کہ
جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو تو اس کی طرف سے جان، لیکن شر نہ
سمجھ کہ در پردہ وہ خیر ہے، کیونکہ واں شر کی گنجائش نہیں۔"

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے، اور وہ اور اس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوئی تھی، وہ کسی کے بھی حسن وجمال، زیب زینت سے متاثر نہ ہوا، شہزادی غش کھا کر پڑی اور تڑپنے لگی، تاج الملوک پر یہ آتشِ باطن اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا کر رکھ دینا چاہیے، کہتا ہے :۔

"سن اے عزیز، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادت کو بادشاہ حقیقی کی نذر کے لائق نہ دیکھا، عجز سے کہا کہ عبادت تیری جیسی چاہیے نہیں کی۔ پھر کس کا منہ ہے کہ اپنی عبادت پر نازاں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی کٹھریا میں یہاں تک پگھلائے کہ اکسیر کے مانند خاک ہو جائے تا شانِ اکسیر پسند کی آنکھوں میں سونے سے زیادہ نظر آئے۔"

تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہو گئی، لیکن دل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رُخ معاً یوں پھیر دیتا ہے :۔

"اے عزیز، جب تک تیرے دل کی آنکھیں، اغیار کے حسن کو دیکھنے

والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر چند بے پردہ ہو، پہلے خارِ رغبتِ اغیار کو دل کی سرزمین سے اُکھاڑ کر پھینک دے، پھر گلِ رخسارِ یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشنِ وجود کو بہ نظر تامل دیکھے تو ان میں رنگ و بُو کے سوا کچھ نہ پاوے۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۰، ۹۲ صفحے کا ہے، اتنی مختصر ضخامت کے اندر حکمت و معرفت، پند و موعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔ اب کتاب ختم ہونے کو آگئی، دو ایک نمونے اور ملاحظہ فرمائیے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیرزادہ بہرام بکاؤلی کی ایک عزیزہ روح افزا پر عاشق و شیدا ہو جاتا ہے۔ باریابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر و حکمت سے خلوت تک جا پہنچتا ہے۔ اس عشقِ فانی میں عشقِ باقی کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز، اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا جلد نہ ملتا، اور اپنے مطلب کو نہ پہنچتا۔ فی الواقع جو عاشق کہ معشوق کا رنگ پکڑتا ہے، معشوق خود عاشق اس کا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ پیغمبر خدا صلعم نے بھی اس موقع کا کلام فرمایا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ خصائل خدا کی پیروی کرو تاکہ قربت اس سے حاصل ہو۔"

بہرام اپنی محبوبہ کی خلوت گاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے مگر اس کے ظاہری غصہ اور ناگواری کو دیکھ کر سہم جاتا ہے، ڈر سے غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیکھ، جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے خود اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو جاتی ہیں، نگاہِ عبرت اس میں بھی ایک منظرِ معرفت دیکھتی ہے:۔

اے عزیز، حق تعالیٰ نے عالم ارواح کو بدن سے رخصت دی ہے، پس
جو حرکت کہ بظاہر بدن سے ہو، حقیقت میں روح سے ہے۔ غرض کہ
جو فساد اس عالم کون و فساد میں ہو تو اس کی طرف سے جان، لیکن شر نہ
سمجھ کہ در پردہ وہ خیر ہے، کیونکہ وہاں شر کی گنجائش نہیں"۔

تاج الملوک پر ایک اور شہزادی فریفتہ ہوتی ہے، اور وہ اور اس کی سہیلیاں خوب بن ٹھن کر
اپنے کو اس کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تاج الملوک کی نظر میں بکاؤلی سمائی ہوئی تھی، وہ کسی کے بھی
حسن و جمال، زیب زینت سے متاثر نہ ہوا، شہزادی غش کھا کر گر پڑی اور تڑپنے لگی، تاج الملوک
پر یہ آتشِ باطن اثر کر گئی۔ مشرق کا افسانہ نگار اس سے نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ اپنے کو بالکل مٹا کر
رکھ دینا چاہیئے، کہتا ہے:۔

"سن اے عزیز، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عبادت کو بادشاہ
حقیقی کی مسند کے لائق نہ دیکھا، عجز سے کہا کہ عبادت تیری کا میں نے جیسی
چاہیئے نہیں کی، پھر کس کا منہ ہے کہ اپنی عبادت پر نازاں ہو، بہتر یہی
ہے کہ آپ کو اس کی محبت کی کٹھالی میں یہاں تک پگھلائے کہ اکسیر کے
مانند خاک ہو جائے تا شاہانِ اکسیر پسند کی آنکھوں میں سونے سے
زیادہ نظر آئے"۔

تاج الملوک کی شادی اس شہزادی کے ساتھ ہو گئی، لیکن دل اس کی جانب مطلق ملتفت نہ
ہوا۔ دماغ میں ہر وقت وہی بکاؤلی بسی رہتی تھی۔ قلم حقیقت رقم بات کا رخ معاً یوں پھیر
دیتا ہے:۔

"اے عزیز، جب تک تیرے دل کی آنکھیں، اغیار کے حسن کو دیکھنے

والی ہیں، تجھے یار کی صورت نظر نہیں آتی، ہر چند بے پردہ ہو، پہلے خارِ رغبتِ اغیار کو دل کی سرزمین سے اکھاڑ کر پھینک دے، پھر گلِ رخسارِ یار کو آئینۂ دل میں دیکھ لے۔ اگر تو اپنے گلشنِ وجود کو بہ نظر تامل دیکھے تو ان میں رنگ و بُو کے سوا کچھ نہ پاوے۔"

کتاب کوئی ضخیم نہیں، دیباچہ اور تصویریں ملا کر بھی حجم ۹۰، ۹۲ صفحے کا ہے، اتنی مختصر ضخامت کے اندر حکمت و معرفت، پند و موعظت کے کتنے جواہر پارے آپ کی نظر سے گزر چکے۔ اب کتاب ختم ہونے کو آ گئی، دو ایک نمونے اور ملاحظہ فرما لئے جائیں۔ تاج الملوک کا وزیر زادہ بہرام بکاؤلی کی ایک عزیزہ روح افزا پر عاشق و شیدا ہو جاتا ہے۔ باریابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ عورت کا بھیس بدل کر کسی تدبیر و حکمت سے خلوت تک جا پہنچتا ہے۔ اس عشقِ فانی میں عشقِ باقی کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز، اگر بہرام زنانہ لباس نہ پہنتا تو ہرگز اپنی معشوقہ سے اتنا جلد نہ ملتا، اور اپنے مطلب کو نہ پہنچتا۔ فی الواقع جو عاشق کہ معشوق کا رنگ پکڑتا ہے، معشوق خود عاشق اس کا ہو جاتا ہے چنانچہ پیغمبر خدا صلعم نے بھی اس موقع کا کلام فرمایا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ خصائل خدا کی پیروی کرو تاکہ قربت اس سے حاصل ہو۔"

بہرام اپنی محبوبہ کی خلوت گاہ تک دوبارہ رسائی حاصل کرتا ہے مگر اس کے ظاہری غصہ اور ناگواری کو دیکھ کر سہم جاتا ہے، ڈر سے غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ یہ دیکھ، جو دل پتھر تھا، موم ہو جاتا ہے خود اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع ہو جاتی ہیں، نگاہِ عبرت اس میں بھی ایک منظرِ معرفت دیکھتی ہے:۔

"اے عزیز اگر اپنے توسنِ عقل کو حکمتوں سے زیادہ نہ چمکائے گا تو تجلی یار
سے فائدہ نہ پائے گا۔ اگر تو یہ ہستی موہوم نہ چھوڑے تو حیاتِ ابدی کب
تیرے پاس آئے۔ جو راہِ عشق میں آپ سے نہ گزرا، وہ منزلِ مقصود
میں کب پہنچا"

روح افزا نے گھر والوں کے ڈر سے بہرام کو سحر کے اثر سے پرندہ بنا کر، ایک پنجرے میں بند
کر کے لٹکا دیا ہے کہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہے۔ ماں کو کچھ سن گن لگی ہے، بچے کے
ڈھونڈنے کو آئی ہے۔ اور گھر کا کونا کونا ڈھونڈ مارتی ہے، چڑیا کے پنجرے کی طرف خیال بھی
نہیں جاتا، حالانکہ وہ بالکل نظر کے سامنے ہے۔ فسانہ نگار یہاں بھی پتہ کی بات سے نہیں
چوکتا:۔

" اے عزیز تو عرش پر کس کے ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا ہے، جو
تیرے خانۂ دل میں ہے، اس کی تو تجھے خبر نہیں، واہ واہ، دور کا دھیان
اور نزدیک آپ سے انجان"

دوسطر میں آگے بڑھ کر اسی پرندہ اور قفس کی کہانی کو ایک پورا مقالۂ حکمت بنا دیا ہے اور
اسی پر کہنا چاہیے کہ افسانہ کی معرفت آموزیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے:۔

"اس کی کُنہ سمجھ لے اے نادان، بہ سبب علاقہ، روح سبزہ زارِ دنیا کی
سیر کو آئی ہے، جب تک یہ مرغِ طلسم عناصر اس کے گلے میں پڑا ہے۔
اور قفسِ وجود میں طوقِ بندگی اس کا گلوگیر ہے، چشمِ ظاہر بیں مشتِ خاک
کے سوا کچھ نہیں دیکھتی جس دن یہ طلسم ٹوٹ گیا، کیفیت اس کی کھل جائیگی
کہ وہ کون ہے۔ اور یہ نیرنگ کیا ہے، چنانچہ رسول مقبول صلعم نے

بھی فرمایا ہے، جب لوگ آویں گے اس حال سے ہوں گے۔ وجودِ مطلق
ایک دریا ہے، اور ہر موجود مثلِ حباب ہے۔ جب حباب سے ہوا نکل گئی،
دریا کے سوا کچھ نہیں پس تامل سے دیکھ کہ اصل ہستی دریا کی ہے، لیکن
فرقِ مرتبہ کا البتہ ہے، حباب کو کوئی دریا نہ کہے گا اور دریا کو حباب
اور کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں، اور بُت خانہ کو کنشت، جہنم کو دوزخ، اور
جنت کو بہشت سے ہر مرتبہ ہیں اور ہی حکم وجود ہے
زندیق ہے جو فرقِ مراتب کرے نہ تو
واقعی مسئلہ وحدتِ وجود کا مشکل ترین مسائل ہے اور بہتیرے اس
بحرِ عمیق میں گر کے مذہبِ جبری کے بھنور میں جا پھنسے، اور اکثر مسلکِ
دہری کے گرداب میں ڈوبے، ہادی یہاں فضلِ الٰہی اور کرمِ رسالت
پناہی کے سوا کوئی نہیں۔"

جو کہانی ننگِ مشرق، تھی اس کا جائزہ آپ لے چکے۔ جو افسانے "فخرِ مغرب" ہیں، کیا وہ بھی ان
کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں گے؟ ہمارے ہاں کی جو سچی کتابیں، سچوں پر اُتری ہوئی یا سچوں کی لکھی ہوئی
ہیں انہیں چھوڑ دیجئے اُن کی سچی شرحوں کو بھی جانے دیجئے۔ جو کتابیں کھلم کھلا جھوٹی لکھی گئی ہیں،
جنہوں نے اپنے جھوٹ کو چھپایا نہیں چمکایا ہے، ان کے اندر بھی اتنی سچائیاں، اور گہری
سچائیاں آپ نے دیکھ لیں ؟ جس قوم کے جھوٹ میں اتنی سچائیاں ہوں جس
قوم کے جھوٹے بھی اتنے سچے ہوں۔ خدا کی شان ہے کہ اسے سندِ سب اخلاق و صداقت دینے وہ
قوم آئی ہے جس کا ہر سچ اندر سے جھوٹ ہی ہے۔

بہار کی بہار[1]

(ایک بہار دوست اور بہار دوست غیر بہاری کے قلم سے)

مارچ ۱۹۰۷ء کا ذکر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت و جلسۂ دستار بندی کے موقع پر[2] انگریزی ہائی اسکول کے ایک اوپری درجہ کے طالب علم کو اس کے والد ماجد کے ہمراہ کھینچ کر لکھنؤ لائی، کانوں کو اشتیاق تھا دو تقریروں کے سننے کا، اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چہروں کی زیارت کی۔ اللہ نے دونوں شوق پورے کرا دئے۔ پہلی بار تقریر سننی نصیب ہوگئی مولانا شبلی کی، اور زیارت ہوئی ان کے چہرہ کی، دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی، جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، الندوہ میں نکل رہے تھے جلسہ گاہ در رفاہ عام متصل سٹی اسٹیشن ۔) میں پہنچ کر یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک جوان عمر، خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوشنما چھوٹی سی داڑھی، عینک، سر پر مدنی وضع کی مندیل۔ بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع، ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا، دستار بندی

---

[1] رسالہ ندیم (گیا) بہار نمبر ۱۹۴۰ء مضمون صاحب ندیم "مولوی ریاست علی ندوی کی خاص پر خلوص فرمائش پر لکھا گیا۔[2] جلسہ دستار بندی کی اصطلاح ہی اب غیر مفہوم ہو چلی ہے۔ پرانی درسگاہوں میں دستور تھا کہ طلباء کو تحصیل علم سے فارغ ہونے پر ایک جلسہ عام میں سند دی جاتی تھی اور سر پر فضیلت کی پگڑی باندھی جاتی تھی۔

ہوئی رصاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہیئے کہ کانوکیشن ایڈریس پڑھا گیا اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں) اور اسی ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور برجستہ تقریر عربی میں بھی، آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں — ہائے لڑکپن کی نیم معصومانہ مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے! — جی بھر کر پوری ہوئیں ۱۹۰۷ء کا اسکولی طالب علم وہی تھا، جو آج ان سطور کا راقم ہے، اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا، جو بحمد اللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب "مولانا" اور "علامہ" کے القاب کے اضافہ کے ساتھ سید سلیمان ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت وعظمت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا بنا، برگ وبار پیدا کئے، اور آج ایک درخت ہی نہیں، پورا باغ کا باغ تیار، ۳۲ برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی! قرن کا قرن گذر گیا، خدا جانے کتنی آندھیاں کیسے کیسے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے، لیکن بہار کی خوشگوار یاد کی بہار آج بھی قائم - بلکہ اس میں اضافہ وترقی دمبدم!

میں بے حد شرمیلا اور بدتمیت، الندوہ - کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری - ملنے کی جرأت اسوقت ہوئی کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا - غالباً آخر ۱۹۱۱ء تھا، اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحدانہ تنقید کے سلسلہ میں "نام" حاصل کر چکا تھا - جب جاکر تعارف کی نوبت آئی - اور نیازمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیزداری سے جاملے، اور اب سید صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں کوئی فرق ہی نہیں معلوم ہوتا۔

مقامی خصوصیات، تمدن، معاشرت، ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں - پنجاب -

تبیئی، سی پی، سب کہیں کا رنگ اودھ سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود یو پی کے شمالی، مغربی، جنوبی علاقے طرزِ معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت بہار ہی میں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ بالکل اودھ کا جیسا کم از کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوتی۔ پٹنہ کا تمدن، لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ! جس بہاری سے ملا، معلوم ہوا اپنے ہی جوار کے کسی شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔

سید صاحب کے سلسلہ میں اُن کے متعدد عزیزوں، ہم وطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سید نجیب اشرف ندوی اب ماشاءاللہ ایم۔ اے ہیں اور بمبئی کی طرف کسی کالج کے* پروفیسر میری نظر میں اُن کی وہی لڑکپن کی بھولی صورت پھر رہی ہے، جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے۔ اور اپنے ہنستے مسکراتے ہوئے تبسم معصومانہ چہرہ کے ساتھ، خوش بچوں میں، ایک ہونہار مقرر تھے۔ مولوی ابو ظفر صاحب ندوی، مولوی سید ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے) مولوی سید محمد ندوی (شاگرد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم) اور مولوی سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی، وغیرہم۔ ان میں سے بعض کی مفصل ملاقاتیں خود مستقل داستانیں ہیں

بہار و اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سید صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سید صاحب ہی کے ایک بزرگ ہم نام (ابھی کل تک زندہ و سلامت مولانا قاری سید شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ ۴۰ - ۳۵ سال ادھر علی گڈھ کا نفرنس کا ہر اجلاس اُن کے دم سے آباد، تو ندوہ کا ہر جلسہ ان کے وجود سے شاد اور میلادی جان تو گویا اُن کا حصہ تھا۔ اُن کا ذکر خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بار بار سننے میں آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے ان سے مخلصانہ تعلقات ۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۲ھ میں نے اپنی آنکھوں سے

دیکھیے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی کا ایک زمانہ لکھنؤ فرنگی محل میں گزرا تھا، اور ہمارا خاندان بھی اپنے قرب تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل کا ایک جزو تھا، شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں، اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریاباد میں تشریف لاتے تھے، مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود مرحوم نے اپنی زبان سے فرمایا، جب بہت مدت کے بعد غالباً ۱۹۲۱ء میں مجھے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہوا۔ ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم فرمائی بھولنے کی چیز نہیں۔ ۱۹۲۸ء میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لئے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب اور ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے پردیس کو وطن بنا دیا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عزیز الدین سلمہ کی کرم فرمائیاں عین اپنی روایات خاندان کے مطابق ہیں۔

لکھنؤ میں دار العلوم ندوہ ایک بڑا مرکز نوجوان اہل بہار کا ہے۔ اپنی کالجی طالب علمی کے زمانے میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ پہنچ کر لکھنؤ آگیا ہے، اور ندوہ کا دار الاقامہ چھپرہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ میں ہوگئی۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفاء راشدین) اور مولوی مسعود عالم (اڈیٹر "الضیا" عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں مولوی ابو الحسنات بے چارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے زائد نہ ہوں، بڑے ہونہار تھے، عین شباب میں وفات پا گئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں پڑھتے تھے۔ مولوی احمد اللہ ندوی، مولوی عبد القدوس ہاشمی ندوی (اب یہ سب حیدرآباد میں ہیں)، سے بھی تعارف اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سید ریاست علی ندوی آج ماشاء اللہ دوسروں کے "ندیم و رہبر" ہیں ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً ۱۹۲۰ء میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے اور مولانا عبد الرحمن

نگرامی مرحوم کے عزیز مخصوص شاگردوں میں تھے ۔ مولوی عبدالغفور صاحب ارشد کا نام لیجئے میں بھول ہی چلا تھا ۔ دفتر ندوہ ۔ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے ، اور اب تو شاید نائب ناظم ہی ہیں ۔ ایک زمانہ میں واقعی ستر ہی تھے ۔

دارالعلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج ہوسٹل تھا جو اب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں ۱۹۱۱ء میں ایک سال قیام رہا ۔ یہاں پٹنہ کے ایک نوجوان سید ناظر حسن پہلے سے بورڈر تھے ۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سر سلطان احمد کے چھوٹے بھائی ، وجیہ و خوش رو ، ہونہار بخوش خو علی گڑھ رہ کر آئے تھے ، انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں برق ، مسلمانوں کے ہر کام میں آگے آگے ۔ مجھ سے ایک سال سینیر تھے ، میں بی اے کے پہلے سال میں تھا ، وہ آخری سال میں ، بیچارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے ، اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے ۔ سنّی طلبہ سے ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ ان کے شیعہ ہونے کا پتہ بھی نہ چلا ۔

سر علی امام کے بھائی حسن امام ، اور والدِ ماجد نواب امداد امام صاحب اثر ۔ نواب نصیر حسین خاں خیال اور اس وقت کے مشہور بیرسٹر مظہر الحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قسمہ یہ ہے دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا ، لیکن بجز نواب خیال کے اور کسی سے ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی ، پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹر ڈاکٹر محمد وارث ، اڈنبرا یونیورسٹی کے ایم ۔ ڈی ، لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے ، حکیم مہدی کے مقبرہ کے مقابل جگت نرائن روڈ پر ۔ ۱۹ ؁ء تھا کہ اپنی مریض آنکھوں کا معائنہ کرانے گیا ، بڑی توجہ و شفقت سے دیکھا ، میں طالب علم ، بھلا فیس کیا پیش کر سکتا تھا ، اور اسی بنا پر شہر کے ایک بڑے نامور غیر مسلم ڈاکٹر معائنہ سے انکار بھی کر چکے تھے ۔ ان کی توجہ بہت غنیمت معلوم ہوئی ۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا ۔ اکثر ان کے ہاں جانا آنا رہتا ۔ کام تو بیچارہ کا یوں ہی سا چلتا ۔ البتہ

پڑھے لکھے بہت تھے۔ پچھلی جنگِ یورپ کے زمانے میں کہیں سول سرجن ہوکر چلے گئے۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی، جہاں کہیں ہوں۔ اللہ خوش رکھے۔

خلافت و ترک موالات کی تحریک نے دور دور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا، بہار و اودھ کا تو پڑوس ہی تھا۔ میں تحریک میں شریک اسوقت ہوا، جب تحریک خود ختم ہو رہی تھی، محمد علی رح کی ذات اسوقت بھی بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی، میں تو خیر عاشقوں میں تھا، باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے۔ دہلی بار بار میری آمد و رفت تھی، یہ ذکر ۱۹۲۴ء اور اس کے بعد کا ہے اور دفتر ہمدرد و کامریڈ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ مولوی محمد شفیع داؤدی، مولوی عبدالغنی، پروفیسر عبدالباری (جو اب شاید "باری جی" کہلاتے ہیں) مولوی سید حسن آرزو وغیرہم سے اس سلسلہ میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں، حضرات بہار کی سادگی اور اخلاص مندی سے دل خاص طور پر متاثر رہا۔ مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبدالغنی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہوکر، نماز کے پابند ہیں، لباس سادہ رکھتے ہیں، بازار میں پیدل چلتے پھرتے اور اپنے ہاتھ سے سودا سلف لے آتے ہیں، بھلا ہمارے ہاں کے ارکانِ کونسل، مسجد کی حاضری، اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا کیا اب ناپ نہیں؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار کو پہلی بار مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا، پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی۔ دل ان کے علم و تدین دونوں کا قائل رہا۔ اور آگے چل کر جب اُن سے اور مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی سے جو شدید جنگ برپا ہوگئی تھی تو دل اس سے برابر دُکھتا ہی رہا — دُنیا میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مخاصمہ کے دونوں فریق اپنی جگہ بے قصور ہی نکلے۔

ایک مرکز اہلِ بہار کا علیگڈھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں (۱) کئی
سال سے آمد و رفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا
خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھہ کا۔ اُن کی زبردست شخصیت بعض عجیب خصوصیات
کی مالک تھی۔ اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم اے جو عرصہ سے پرو وائس چانسلر ہیں، اسم بامسمّٰی
پیکرِ حلم و خوش خلقی ہیں۔ مرزا آختہ حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی کورٹ
کے ممبر ہیں۔ ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔

سچ بھی ایک ذریعہ اہلِ بہار کی توجہات منعطف کرنے کا تھا۔ بلکہ دکن کے بعد سچ کی
سب سے زیادہ قدر افزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرا کے وکیل، محمد اسمٰعیل صاحب ترہٹ
ضلع گیا کے قاضی احمد حسین صاحب رانچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب اور پٹنہ کے مولوی
منظر علی ندوی مرحوم (المبشر والے) اسی سلسلہ سے مہربان ہوئے، مولوی منظر مرحوم تو خدا کے
گھر سدھارے باقی حضرات کی خیریت اِدھر ایک عرصہ سے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم
صاحب دریاآباد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔

سال اب خوب خیال میں تو نہیں سنہ ۲۱ء یا ۲۲ء ہوگا ایک بار حیدرآباد جانا ہوا۔
مولانا شروانی صدرالصدور امورِ مذہبی کے دولت کدہ پر کوئی علمی کیٹی تھی۔ نظر ایک نئے چہرہ
پر پڑی، اور جی چاہا کر اب پڑی ہے تو بار بار پڑتی ہی رہے۔ ہٹنے نہ پائے۔ نرم اور روکش چہرہ
پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم داڑھی والے چہرہ پر پڑی تو دل نے کہا کہ اس چہرہ کو دیکھتے ہی
چلے جائیے۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا دھوکا ہوا
نام سے عرصہ سے واقف تھا۔ ایک خیالی صورت بھی ذہن میں تھی۔ لیکن تو بہ صورت، سیرت ہر

چیز سے متعلق خیال اور اندازہ کتنا غلط نکلا، خیال تھا کہ مسن ہوں گے، یہ نوجوان نکلے، قیاس تھا کہ بڑے بٹھاٹ ہوں گے اور بڑے مناظرانہ خشکی و کرختگی کے پتلے۔ مشاہدہ نے بتایا کہ ایک لطیف جسم لطیف تر روح کو ہتھیائے ہوئے ہے! خندہ رو، نرم خو، نہ کرختگی نہ ثقالت، برعکس اس کے ایک پیکر لینیت و لطافت تالی کے موقع پر تالی اور حال کے محل پر حال صورت پر نورانیت برستی ہوتی، گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوتی۔ علم کی جگہ علم، عشق کی جگہ عشق تعارف ہوا اور ملاقات کے پینگ بڑھے۔ اس اٹھارہ انیس سال کی مدت میں کیا کچھ دیکھا، کیا کچھ سیکھا ان سوالات کو بس سوال ہی بنا رہنے دیجئے۔ حیدرآباد کی ہم رازیاں، لکھنؤ کی یکجا ئیاں دریاباد کی سرافرازیاں، اور پھر عرشہ جہاز پر ساتھ، مدینہ کے "روضہ جنت" میں ساتھ، بیت اللہ کے طواف و زیارت میں ساتھ۔ منیٰ کی نمازوں میں ساتھ۔ یہ ساری داستان کہیں پھیلنی شروع ہو گئی تو سمیٹنی مشکل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ دماغ اگر ایک بہاری کے علم و فضل کے آگے جھک گیا تھا، تو دل دوسرے بہاری کی محبوبیت کی نذر ہو گیا۔ دماغ اگر ایک کی عظمت کا قائل، تو دل دوسرے کی محبت کا گھائل "بہار کی بہار" اب بھی روح پر در نہو تو کیا ہو؟

۲۹ء میں سفر حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاز پر مولوی نصیر الدین صاحب پنشنر منصف، اور ان کے صاحبزادے ضمیر الدین صاحب کا خوب ساتھ رہا، ضمیر صاحب جو اس وقت ایک پُر جوش خلافتی تھے، ان کے لطف و کرم کی تجدید ۸۔ ۹ سال بعد خاص شہر پٹنہ میں ۳۷ء میں ہوئی۔ مولوی شاہ لطف اللہ صاحب مونگیری، اور ان کے برادران عزیز مولوی نوراللہ و مولوی منت اللہ (اب ایم ایل اے ہیں) سے خصوصیت پیدا ہو جانے کے لئے اتنا ہی بس تھا کہ یہ حضرات مولانا گیلانی کے عزیز قریب ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ان

حضرات کا لطف واخلاص بجائے خود بھی یاد رہ جانے والی چیز ہے۔ اور مدینہ منورہ میں
ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب کا وجود تو ہر مسافر و زائر کے لئے ایک آیۂ رحمت ہے، ہم لوگوں پر کرم
خاص رہا۔ مسجد نبوی میں باب جبرئیل کے دربان بھی ایک بہاری تھے، اور خوب شخص تھے، ہم
لوگ عموماً اس دروازے سے جاتے تھے۔ روز ملاقات رہتی تھی۔ نام اسوقت ذہن میں نہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے سر رشتہ تالیف و ترجمہ کے سلسلہ میں ستمبر ۱۷ء سے ستمبر ۱۸ء
تک ایک سال مسلسل حیدرآباد میں قیام رہا۔ سرکار عالی کے نائب صدر محاسب مولوی عبدالغنی مرحوم
تھے۔ ان کے کرم بے حساب رہے۔ ان کے صاحبزادے محی الدین صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا محکمہ
تعلیمات میں تھے۔ اب شاید اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہیں۔ جوانی ہی میں مذہب کے دلدادہ
لطف و کرم میں باپ کے قدم بہ قدم۔ انہیں کے ہاں شمس العلماء مولوی محب الحق کی زیارت
کئی بار ہوئی۔ اسوقت تو بہت بزرگ صورت معلوم ہوئے، بعد کو سننے میں آیا کہ عقائد میں کچھ
"اہل قرآن" کے سے ہیں۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ایسا شخص اور منکر حدیث ہو۔ بہار
ہی سے ایک صاحب مولوی ابو محمد مصلح ایڈیٹر حسن و عشق، مراسلت عرصے سے قرار ہے تھے
حیدرآباد کی آمد و رفت کے سلسلہ میں ملاقات ہوئی، تحریک قرآن کی دھن میں لگے ہوئے،
دکن ہی کے سلسلہ میں ایک اور بہاری عبدالرحمن خانصاحب بھی یاد آگئے۔ انسپکٹر پولیس تھے۔
مدتوں مہربان رہے۔

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایم اے، پی ایچ، ڈی کا نام رہا ہی جاتا تھا، اپنی نظر ثانی کے
وقت یاد پڑا۔ یہیں ٹانکے دیتا ہوں۔ اب مدت سے کلکتہ یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں،
ایک زمانہ میں لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے۔ اسوقت تو میں ہی ذرا الگ الگ رہا۔ بعد کو معلوم ہوا شریف

مسلمان سے تھے۔ مراسلت اور بعض مقالات و مضامین سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

پٹنہ کی حاضری کا اتفاق کل دو بار ہوا۔ تو تے اس شہر کی گلی گلی سے آئی ، سی کو بھیبو سے کم نہ عظیم آباد کے کھنڈروں سے بیشتر۔ پہلی بار ستمبر ۱۹۲۷ء میں جانا ہوا ، مولانا مناظر حسن صاحب شدید علیل ہو کر پٹنہ کے بڑے اسپتال میں داخل ہوئے ، تار پا کر عیادت کو دوڑا ہوا گیا۔ مہمانداری مولوی منظر علی مرحوم ایڈیٹر البشیر نے کی۔ مولانا کے والد ماجد حیات تھے ، ان کی زیارت ہوئی اور مولانا کے برادر عزیز سید مکارم احسن سے خوب ملنا ملانا رہا۔ مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی ، قاضی احمد حسین صاحب ایم ، ایل ، سی ، مولوی نور محمد صاحب ایڈیٹر اتحاد وغیرہم لطف فرماتے رہے اور مولوی سید محمد ندوی تو ہر وقت خدمت کے لئے وقف رہے۔ میزبان صاحب موٹر پر پھلواری لے گئے۔ مزارات کے علاوہ زندہ بزرگ امیر شریعت مولانا محی الدین صاحب کی زیارت نصیب ہوئی۔ مولانا قاری شاہ سلیمان مرحوم و مغفور اور ان کے اہل خاندان کی عزیزانہ مسافر نوازی و محبت کا مزہ دل اب تک لے رہا ہے ، جناب تمنا کو بھی وہیں دیکھا اور کلام سنا۔ اور جناب تمنا کی لطف فرمائیاں رہیں۔ غرض پھلواری کی سیر سے دل باغ باغ رہا اور اس کی سدا بہار سرسبزی کی دعائیں نکلتی رہیں۔

دوسرا سفر ۱۹۳۷ء میں ایک اردو کمیٹی کے سلسلہ میں ہوا۔ ضابطہ سے میزبان قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر تھے۔ لیکن قیام مولانا سید سلیمان کی رفاقت میں ، ریاض حسن خاں صاحب رئیس مظفر پور کی کوٹھی پر رہا۔ موصوف مولانا شبلی مرحوم کے ملنے والے اور اس رشتہ سے میرے بھی بزرگ ہوئے۔ بزرگانہ شفقتیں عین روایات بہار کے مطابق رہیں۔ تمنا صاحب اب کی بھی کرم فرماتے رہے ، اور ان کے علاوہ ضمیر الدین صاحب اور متعدد حضرات کی عنایتوں کا مینہ دن بھر

برستا رہا۔ افسوس ہے کہ ان کے اسمائے گرامی ذہن میں نہیں، شام کو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم کے اعزاز میں علی گڈھ اولڈ بوائز کی طرف سے ایٹ ہوم تھا۔ متعدد نوجوانوں سے ملاقات رہی۔ سب خلوص و محبت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اور دو یونیورسٹی کے طلبہ کی صورت کا نقش ذہن میں ہے۔ لیجئے ایک ہدیۂ فقیر بزرگان بہار کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے، گو ان کے مرتبہ کے قابل ہرگز نہیں، تیار ہو گیا۔ موضوع۔ احباب بہار، خود ایڈیٹر صاحب ندیم کا عنایت کیا ہوا تھا۔ محفلِ خاص میں اغیار کے ار پانے کے کوئی معنی نہیں۔ بہار نمبر میں ایک غیر بہاری کے لئے جگہ نکالنا محض اس کا دل بڑھانا ہے۔ لیکن یہ بہار نمبر ہے، ایسا نہ ہے کہ اس پر کسی خصوصی نمبر کا اطلاق مشکل ہی سے ہوگا۔ ایک تو اودھ اور بہار کے تمدن و معاشرت کی یہ یکسانی کہ ایک کو دیکھ بے اختیار دوسرے کی زبان سے نکلے۔

جو تو ہے وہی میں ہوں۔

اور پھر اس عموم میں خصوص ان سطور کے راقم کا اہل بہار کے ساتھ نیازمندانہ خلوص
——— قند و شکر کو جب تولتے ہیں تو خس و خاشاک کے ذرے بھی قند و شکر ہی کے حکم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ عجب کیا جو اس غیر بہاری کو بھی ایک اعزازی (آنریری) بہاری سمجھ لیا جائے۔

نوجوان کر آپ نے جانا ؟ وہ نامہ سیاہ تب آپ کے ارشاد کی تعمیل میں یہ تم اکبر کے لئے پیام نویس!

سنہ اب یاد نہیں، اور مقام کا اظہار کچھ ضروری نہیں، بہرحال اودھ کا ایک چھوٹا سا ضلع ہے۔ حضرت اکبر کے صاحبزادے سید عشرت حسین صاحب (عشرت منزل کا نام آپ ابھی سن چکے ہیں، یہ انہیں کے نام پر ہے) وہاں ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ اکبر صاحب بھی وہیں مقیم ہیں شہر کے کچھ لوگ، غالباً رئیس یا وکیل ڈپٹی صاحب سے ملنے آتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اتفاق سے موجود نہیں ہوتے وہ حضرات ان کے بجائے حضرت اکبر کو جلوہ افروز پاتے ہیں لیکن نام سُن کر بھی کچھ زیادہ التفات نہیں کرتے۔ اتنے میں ڈپٹی صاحب باہر سے آجاتے ہیں اور حاضرین سے کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے پہچانا؟ یہ میرے والد ماجد ہیں" اب کیا تھا۔ وہی حضرات تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو جاتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ.. معاف کیجئے گا ہمیں اس رشتہ کی خبر نہ تھی" اکبر نے فرمایا۔ "نہیں اس میں مضائقہ ہی کیا۔ ایک بار یورپ میں کیا ہوا، کہ اللہ میاں مجسم ہو کر آئے، اگرچہ میں جا کر ایک ایک سے کہا کہ میں تمہارا خدا ہوں، خالق ہوں، پروردگار ہوں، کوئی مخاطب نہ ہوا، پھر فرمایا ارے مجھے اب بھی نہ پہچانا؟ میں ہوں تمہارے عیسیٰ مسیح کا باپ! بس اس تعارف کی دیر تھی سب دوڑ پڑے سب کے سر تعظیم کے لئے جھک گئے"۔۔۔ یہ تھا اکبر کی برجستہ لطیفہ گوئی کا ایک نمونہ!

سنہ غالباً ۱۹۱۸ یا ۱۹۱۹ ہے۔ اکبر لکھنؤ میں امین آباد پارک کے ایک بالاخانہ پر مقیم ہیں۔ ایک صاحب "صاحبانہ" مسلک خیال کے ملنے تشریف لاتے ہیں۔ گفتگو کچھ عود دل

کی تعلیم و آزادی پر چسپاں ہے۔ اکبرؔ نے کہا کہ: "ہم تو اس زمانہ میں آزادخیالی کا امام سید احمد خان کو سمجھتے تھے، لیکن عورتوں کی آزادی انہیں بھی سخت ناپسند تھی"۔ وہ صاحب جیسے تیرے بیٹھے تھے۔ بات کاٹ کر بولے کہ: "سرسید کی رائے اس معاملہ میں سخت قابل ترمیم تھی" اکبرؔ نے برجستہ جواب دیا کہ "جی، کیوں نہیں۔ ایک اسی معاملہ میں کیا، خدا معلوم کتنے معاملوں میں سخت قابل ترمیم تھی" وہ خود ہی قابل ترمیم تھے۔ دیکھئے نہ، زمانہ نے انہیں کی ترمیم کر دی، اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کر دیا!۔۔۔۔۔ یہ ایک ہلکی سی جھلک تھی اکبرؔ کی اصلاحی اور تبلیغی طرز گفتگو کی۔ اصلاح و تبلیغ کے کام میں تو وہ ہمہ وقت لگے رہتے لیکن مجادلہ و مکابرہ کیا معنی، رسمی مناظرہ و مباحثہ کی بھی نوبت نہ آنے دیتے۔ اور خشونت تو ان کے لہجہ کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شعر یوں کہہ بھی تو گئے ہیں سہ

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

الکار مذہبی "بحث" سے کیا ہے، بحث و مباحثہ کا رنگ کبھی نہ آنے دیا۔ باقی دھیمے دھیمے سروں میں، میٹھے میٹھے بولوں میں مذہب کی تبلیغ تو چپکے چپکے ہر وقت کرتے رہتے مجھ سے ایک روز میرے ارتیاب و الحاد کے زمانہ میں کہنے لگے کہ "کیوں صاحب، آپ نے کالج میں عربی لی تھی نہ؟" عرض کیا "جی ہاں"۔ فرمایا "تو پھر اب قرآن آپ کبھی پڑھتے ہیں؟ مذہبی کتاب سمجھ کر نہ سہی۔ اس کی اعلیٰ لٹریری حیثیت سے تو آپ کو بھی انکار نہ ہو گا۔ کیا ہرج ہے اگر عربی ادب سے اپنا تعلق قائم رکھنے کے لئے اسے کبھی کبھی پڑھتے رہئے۔ آخر انگریزی بھی تو پڑھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لئے کوئی قید باوضو ہونے، قبلہ رخ، بیٹھنے کی نہیں، وضو بے وضو

جب جی چاہے کچھ پڑھ لیا کیجئے، اور جو آیت پسند آجائے۔ اُسے ذرا دو ایک بار دُہرا لیا کیجئے، جیسے اچھے شعر کو دو چار بار پڑھ لیا جاتا ہے" بس یہ حکیمانہ طریق تھا اُن کی تبلیغ کا

ایک روز اور میرے اُن کی تنویر الحاد میں نہ سے فرمانے لگے کہ کیوں صاحب آپ کو کبھی اپنے بندہ ہونے میں بھی شک ہوا ہے؟ اللہ میاں کے مسئلے کو الگ رکھیئے، صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ آپ کو اپنے بندہ ہونے میں تو شک نہیں؟ عرض کیا کہ "نہیں، اس میں تو نہیں" بولے، "بس پھر بیڑا پار ہے۔ اپنی بندگی کا احساس کرتے رہیئے۔ آپ کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ اللہ کی معرفت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ سب کی بات بس اپنے اپنے مقام سمجھ رہی ہے میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

دردتو موجود ہے دل میں شفا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

اپریل ۱۹۱۲ء کی وہ گھڑی، اور ستمبر ۱۹۲۱ء میں ان کی وفات۔ پورے دس برس میرے تعلقات نیازمندی برابر قائم رہے، روز بروز بڑھتے گئے۔ اس مدت میں میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ لیا۔ اکبر کے کلام سے بھی اور اکبر کی ذات سے بھی۔ خوش نصیب تھا یا کہ اتنی مدت تک موقع استفادہ کا ملا۔ بدنصیب تھا میں کہ موقع سے پورا فائدہ نہ اٹھایا۔ اپنے عقائد و خیالات کی اصلاح میں میں نے حضرت اکبر کا بھی اثر چھپکے چھپکے غیر شعوری طور اور غیر محسوس طور پر کام کرتے ہوئے پایا۔ وہ ابھی زندہ ہی تھے کہ میں بحمداللہ مسلمان از سر نو بن چکا تھا۔ جب پہلی نماز حضرت اکبر کے ساتھ ادا کی۔ ظہر کا وقت تھا۔ اس وقت ان کی خوشی کا کیا کہنا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کتنی بڑی دولت خود انہیں کو مل گئی ہے! توحید کے عاشق تھے اور غیرت، عشق کا ایک لازمہ ہے۔ توحید کی غیرت اتنی تھی، کہ کوئی دوسرا تذکرہ، یہاں

تک کہ اللہ کے پیاروں کو بھی زیادہ دیر تک سن ہی نہ سکتے تھے، موضوع بدل، توحید پر آ جاتے۔ اور آخر آخر تو فنا اور توحید، یہی دو محبوب موضوع رہ گئے تھے۔ ۲۰ء و ۲۱ء میں عارف رومی کی مشہور و معروف مثنوی کی دھن میرے اوپر سوار تھی۔ اکبر کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا۔ ایکبار کیا، دو بار کیا، جب تیسری بار کیا، تو تڑ سے بول اٹھے کہ اچھا یہ تو فرمایئے اللہ میاں بڑے ہیں یا مولانا روم؟" میں نے کھسیانے ہو کر کہا کہ "اللہ میاں"۔ بولے ہیں تو آپ کی گفتگو سے یہی سمجھا تھا کہ شاید مولوی روم بڑے ہیں۔ جب سے آپ آئے ہیں، بار بار انہیں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں کا نام میں نے ایک بار بھی نہ سنا۔ میں تو سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اللہ میاں نے آپ کی رہنمائی مثنوی تک کی، یا مولوی روم آپ کو اللہ تک لے آئے؟ انتہا یہ ہے کہ ایک بار جب ذکر رسول شروع ہو تو اسے بھی دو ہی چار منٹ بعد حضرت اکبر نے اپنے اس فقرہ پر ختم کر دیا، کہ جی ہاں، ہمارے اللہ کی قدرت کا کیا کہنا۔ کیا بے نظیر اور بے مثال انسان پیدا کر دیا! —— یہ حد تھی غلبۂ توحید کی!

اکبر بڑے پُر گو تھے اور بڑے زود گو۔ جو دیوان چھپ چکے ہیں، وہی تعداد میں ایک نہیں تین ہیں۔ اور جو کلام اب تک نہیں چھپا ہے وہ سب چھاپ دیا جائے، تو اگر پوری دو جلدیں نہیں، تو ڈیڑھ جلد تو ضرور ہی اور تیار ہو جائے۔ اکبر کا پیام تقریباً وہی تھا جو اقبال کا تھا یعنی خودی اور خودداری کا سبق۔ مشرقی کو مشرقی اور مسلمان کو مسلمان رہنے کی تلقین، راہیں الگ تھیں، لیکن منزلِ دونوں کی ایک، ایک چہروں کو ہنساتا ہوا چلا، دوسرا دِلوں کو گرماتا ہوا بڑھا —— اکبر کی زندگی درحقیقت ایک سبق ہے کہ انسان ظرافت، زندہ دِلی، دل لگی، خوش طبعی کی راہ سے بھی کیسی کیسی خدمتیں دین و ملت کی انجام دے سکتا ہے!

(۲)
چند مقدمے

کلام جوہر[1]

مقدمہ

"آپ مری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رامپور میں اس زمانہ میں پیدا ہوا تھا جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ۔ امیر۔ تسلیم۔ جلال۔ عروج۔ دہلی اور لکھنؤ کے آسمان کے ٹوٹے ہوئے ستارے سب رامپور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خانصاحب گوہر اور میرے چچازاد بھائی اور خسر عظمت علیخاں صاحب اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خانصاحب شوق شامل تھے۔ گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا۔ پھر داغ کو نواب کلب علی خانصاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی۔ از راہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا تاکہ وظیفہ محض کار بے کاراں کی نذر نہ ہو۔ یہ میرے مکان کے عقب میں تھا۔ اس لئے روز اُن کی زیارت یوں ہی ہو جاتی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اُٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا (ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو)

---

[1] تحریر ۱۹۲۳ء نظر ثانی ۱۹۳۵ء نظر ثالث ۱۹۴۲ء

؎ آیا دہلی سے ایک مشکل خبر
آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ؎ آج رخصت جہاں سے داغ ہوا
خانۂ عشق بے چراغ ہوا!

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے - جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا - مجھے بھی لے جاتے تھے - داغ نے پہلے دن پوچھا "کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں"۔ میری عمر بہت کم تھی مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرائے تھے - جنہیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا - میں نے انہیں کے چند شعر انہیں سنا دیئے - سنکر پھڑک گئے - اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا کہ اس بچے کو ضرور لایا کرو جناب والا اگر اس کے بعد میں یہ دعویٰ کروں کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا - مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے - سنئیے - میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اس کی توند پر کودا ہوں - اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو - میری پیدائش ۱۸۷۸ء کے اواخر کی ہے - میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے - اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری (Official biography) (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "امت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے، یا سیرۂ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے - ہمدرد کے سفر نے (جس کا چند ماہ کے بعد انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑمونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض امتحاناً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا - اور اعتراض کیا گیا

تو کہا کہ بھائی سب تو چڑیا چڑے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے مگر
ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھرا ہوا
ہو۔ اور جواب ہی ہمارے سر آ پڑے، آپ نفسیات کے ماہر ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ میرا پوچھنے
والا سیر نگار باوجود لفاظ و سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا کہ نہ معلوم
کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے اس سے بھی
زیادہ روشن ضمیر ہوں اور ان اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب
عجیب انکشافات سے مالامال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انہیں داخل ہی کر دو۔ اور
اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری لوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑ کے
کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا خیر اب سنیئے کہ گیارہ برس کی عمر میں علیگڈھ گیا
ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے
حافظے کی تعریف کی کہ المامون میز پر رکھا تھا۔ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے
امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا تو اس کا مجھے ترجمہ سنا دیا۔ حالانکہ
عربی سے بالکل ناواقف ہے۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے
پہلے ماموں کی اولاد کی فہرست مانگی پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک
مصرعہ طرح اسی وقت دیا اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر لوچ۔ اسی وقت تیار ہو گئی
میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکہ بیٹھا تھا وہ اسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں
تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حکم ٹھہرے۔ انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ
کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم
لکھ دی اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے

فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔
پہلے بھی جب ہم ٹرک انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب
(رئیس الدجاج و یونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، اُن میں سے ایک یہ
خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری
مسلم لیگ کے برادر صغیر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا اور وہ مشاعرہ جسے
بعدہٗ حسرت نے رونق بخشی، ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودھویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش
نہیں کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودھویں کو بارش ہو گئی تو تین
چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی
ایک غیر طرح میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرش زمرّدیں نہیں وہ چاندنی نہیں
لطفِ مشاعرہ تو گیا چودھویں کے ساتھ

علیگڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی
تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزہ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔
کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوقِ نظارۂ جمال"
لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلاف دستورِ عام زہد و ورع کی
طرف تھا سو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کبھی
اور کے خیال تے، مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا۔ اور محض حالاتِ گرد و پیش اس کے محرک
تھے۔ جب ان سب تجربوں کے بعد کورے پھاٹے گھر کو آئے تو اہل کی زندگی بال بچوں کے
خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کر دیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ

ترشح شاعری کا ہوا تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ تر رسمی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سرلتے چار پانچ غزلیں کے اس فرصت کے زمانے میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں اگر جب طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بنایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب کا رہ گیا ہے، چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں (Touch Stone) کی مشورہ سے زیادہ قابل قدر نہیں (A poor Thing but mine own) اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں . . . . (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ بقول آپ کے "میری امت" ان سے کچھ تسکین پاتے۔ بہر حال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنا دست اختانی اور پاکوبی کے لئے ہیں "

(۴)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سن لی۔ یہ ٹکڑا ان کی کسی تصنیف کا نہیں کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک خانگی مکتوب کا ہے تاریخ اس پر ۱۶ اگست ۱۹۲۶ء کی پڑی ہے۔ چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اس وقت کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۹۱۶ء کے شروع میں اسی نظر بندی کی حالت میں ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی۔ پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں کسی والا نامے میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیتے تھے۔ بس پر لس نیازمند کا اشتیاق بڑھا۔ عرض کیا کہ "اور عنایت ہو" عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب کھلے

ذرا کچھ فرمائیے تو آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا، کہاں سیکھا، کس سے سیکھا، جواب ..نصل مرحمت ہوا۔ آپ اوپر پڑھ چکے۔ بالکل قلم برداشتہ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کرکے، ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کر کرکے لکھے جاتے ہیں؟ — بیچارے کو خیال تک نہ ہوگا۔ کہ کسی دن یہ چنانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر ادبی عجیب مضمون کے جزو بنکر رہیں گی۔

(۳)

محمد علی کو دنیا نے اوّل اوّل جانا، تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں۔ بولتے خوب ہیں، علیگڈھ کے فدائی ہیں، قوم کے "شیدائی ہیں مخلص ہیں، پر جوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفرڈ گئے، نام درجہ کا ہندوستانی طلبہ کی مجلس نورتن، کے نام سے قائم کی۔ خود ہی صدر بنائے گئے، یا (کانگریسی اردو میں) چنے گئے۔ لوٹ کر آئے بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے ٹائمس آف انڈیا بمبئی میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا کلکتہ سے اپنا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ نکالا حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی والوں کے حلقے میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری، واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی — اور کلب میں بھی شیکسپیر کے فلاں ڈرامے پہ تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علی ایڈیٹر نہ تھے۔ ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر صحیح معنی میں لیڈر تھے۔ اب قوم اُن کی نہ تھی وہ قوم کے تھے۔ جنگ طرابلس کے، جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی بخیر ونم اور مجنونانہ ادھر لپکے بلقان بیں اتحادیوں کی ہر طرب، ترکوں کے جسم پر نہیں محمد علی کے

قلب پر پڑ رہی تھی۔ کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لئے پکارا تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونین پیش آگیا۔ محمد علی دیوانہ وار جھپٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ـــــ اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے! مستِ الست!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے، چیخے چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی ـــــ خلافت اسلامیہ کی جنگ! آہ، وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم آخری بار لہرایا ـــ محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی جیسے دو مہینے کی نہیں، اکٹھے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے۔ اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نذر! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے چلے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھوں نظر بند، دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ان چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں۔ مہر ہی مہر، لیکن حقیقتِ مہر کبھی کبھی صورتِ قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو معاملہ سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؎

عشقِ معشوقاں نہاں است و ستیر
عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے۔ سوانح سمجھ

کر بولے ؎ یہ نظر بندی نکلی تو رو سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے، اس کے لئے نقد جان کا مطالبہ ہونا تھا ؎

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا!
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے۔ حصّہ بقدر جثّہ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے کیا خوب مصرعہ لگایا ہے خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے اسی نظر بندی کے زمانے میں ایک بار ریل پر ملاقات ہوئی، پوچھا "رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟" فرمایا ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہنچوں اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کروں۔" نظر بندی اور اس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا۔ ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پیترے ادھر ہندوستان کے اندر حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان، شروع ۱۹۲۰ء تھا کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہنچے اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں، وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع تقریر صرف تحفظ خلافت ہی رہے۔ لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا، چپکے چپکے اور

اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی! ؎

اذان دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی تھا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علیگڈھ میں ڈال چکے تھے۔ اور ابھی چند ہی سبق پڑھانے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے اور جکڑے گئے ۱۹۲۳ء تک۔ کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں، ٹھاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ، سہ کار دالا تبار کے مہمان! اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین، رفعت میں آسمان سے ہل مل کر رہتی تھی! خدا آپ بیتی کی ایک دوحرفی روداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے۔

؎ معراج کی سی حال سجدہ میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن مذہب سے عزیز تر اور دنیا، دین پر مقدم کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر! —— وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب۔ جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا۔ خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر کیا کچھ پھڑ پھڑایا ہوگا۔ دل پر کیا کچھ کچھ بیت رہی ہوگی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

دوا ورمن کی انتہائی تدبیر میں تو غریب، بے حوصلہ والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ یہاں وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا تھا وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور تھا!

امتحان سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے، اور اپنی نور نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر اور گڑگڑا گڑگڑا کر عرض و معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا
تخرج الحی من المیت مذکور نہیں؟
تری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

پاس کے بعد جو شعر ہے اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اللہ اللہ! جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا اُسے قبر میں بھی اُتارا! ۱۹۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھیے کہ محمد علی پر کیا گذر کر رہ گئی خلافت اسلامیہ کا الغا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خیر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہا، معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر جھلس کر رہ گئے وسط ۱۹۲۴ء

سے آغاز سنہ ۳۱ء تک زندہ ضرور تھے اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت
دیتے رہے۔ سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز
دوستوں سے جھگڑے اور بکھیڑے۔ لڑے اور روٹھے۔ سنہ ۲۸ء میں بچی کی شادی کی اور سال ہی
بھر بعد سنہ ۱۹۲۹ء میں اسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ دوبارہ نکالا۔ ہمدرد کو پھر سے زندہ کیا اور
دونوں کو کچھ دن بعد بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی
زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب
کچھ ہوا۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا ——— لیکن دل کی کلی بر الغاء خلافت سے
مرجھا چکی تھی پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ شادابیٔ بہار تھی نہ ہوئی۔ محمد علی اب زندہ تھے کہ
یوں کہیئے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے! —— اب وہ
انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کی گول میز کانفرنس کے لیے تھا، اور حقیقت میں سفر
آخرت! بدخواہوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے تو
انگریز اور ہندو سب پکار اٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہ آتش
فشاں! فاش و برملا کہا، جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے، کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی
لے کر جاؤں گا، یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"! مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔
جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان سنہ ۱۳۵۰ھ کی پندرھویں شب، عین اس وقت جب روئے
زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی
نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی! ——
شاید اس لئے کہ اس کے ہم قوم اور ہم وطن اس نعمت کے اہل نہیں ثابت ہوئے تھے، آزادی،

محمد علی کے ملک کو کیا ملتی۔ محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولا کے حضور میں حاضر ہو گیا۔ عمر کل ۵۲ سال کی پائی۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلۂ اوّلیں ہیکل سلیمان کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبالؒ نے کہا ذرا دیکھنا اپنے رسول کا یہ عاشق و شیدا غلام جا کس راستے سے رہا ہے ع

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

اس موت پر اس مدفن پر رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی یا دلی میں نہیں۔ سارے ہندوستان میں ہوا، ہر ہر صوبہ کے ایک ایک شہر، ایک ایک مقصبہ، گاؤں گاؤں میں ہوا۔ سارے عالم اسلام میں ہوا۔ اس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملیگی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہ خلائق بن گیا ہے۔ زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے۔ مجاوروں کو اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ خود کہہ بھی تو گئے تھے ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

وہ مشک کیا جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی۔ نہ دیباچے کی۔ نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹیے اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض ضخیم دیوان ہو کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی ملجائے۔ ایک ننھی منی سی کتاب جب جو حصہ چاہیئے کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے

رہرو کی زبان سے سُنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔ محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں، شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو۔

ارادہ تھا یا لوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو
مگر اے ہم نفس دل کی تھکن کچھ اور لیتی ہے
یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
قضا کس کو نہیں آتی ہے یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پر اس مرحوم کی بے گور کفن کچھ اور کہتی ہے
کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش

تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا
میں تیرا گھر سمجھ کے سرِ راہ گر پڑا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں، زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں ۱۹۰۷ء ہے علیگڈھ، میں لڑکوں نے انگریز استاد کے خلاف اسٹرائک کر رکھی ہے، کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں مگر اتنے عرصہ میں دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں۔ اتفاق سے وہی دن سر سید کی برسی کا ہے اولڈ بوائز جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں۔ محمد علی اپنے نیچری پیر سے ڈرتے، لرزتے نہیں ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں، اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے اور نیاز

بھی، شوخی اور مستی بھی ہے۔ اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو

ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ نا شیر دعا میں شرکِ رہا تم کو

وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغولِ دعا تم ہو

تمہیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علیگڈھ میں

اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا

جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تمہیں ہو زندۂ جاوید، باقی جانے والے ہیں

نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیلِ بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گذرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند ہیں۔ یک بیک خبر پہنچتی ہے کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دوست و بازو۔ انگریزی کے زبردست انشاپرداز کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان تندرست سرِ شام لکھنؤ میں ایک پبلک جلسے سے چلے آرہے تھے کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آکر ٹکر دی۔ اور یہ رونقِ صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے

اے مرے رندِ بادۂ حق سے — ابھی دو چار خُم پئے ہوتے

تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے ہوتے

خوب کشت بہشت کارستے — ساتھ ہم کو بھی گر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی ہے۔ شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے، بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں نہ کسی قسم کی تیاری نہ کوئی اہتمام کیسی نظر ثانی اور کہاں کا غور و فکر۔ نہ اصلاح نہ ترمیم بس جو دل میں آگیا، جھٹ کہہ گذرے یہی حال نثر کا ہے، یہی حال نظم کا، زمانہ حکومت کی اصطلاح میں، نظر بندی کا تھا، لیکن احکم الحاکمین کے اجلاس میں یہ وقت نظر کشائی کا قرار پایا، خوب خوب پتے پتے کی کہنے لگے۔

؎ سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو

ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو

دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے آئے

اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنیئے:-

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے

یہ کیا کہ مے حلال وہاں ہو یہاں نہ ہو

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا

جو خبر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل اکیلی اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دل بے مدعا کے بعد

"حنا" کا قافیہ اس طرح میں آسانی سے آسکتا تھا لیکن ذرا دیکھئے محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہر آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہاں مِن مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہر حال ایک مسلّم استاد تھے۔ جوہر ان کے مقابلہ میں مبتدی اور نوآموز جسے شعر و شاعری سے فنی واقفیت کے لئے زندگی بھر چند لمحہ کے لئے بھی فرصت نہ ملے پھر بھی کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا ؎

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں   آتا ہے لطفِ جرم تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر گلیوں میں، گھر گھر زبانوں پر چرچا تھا ۔ "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

یہ کہنا تو محمد علی کی بی اماں کا تھا اور محمد علی خود جیل کے اندر کیا کہہ رہے تھے ، یہ کہہ رہے تھے ۔

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے

پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو

خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے ۔ یا اپنی آتو بیا گرفی در خود نوشت سوانح عمری "آپ بیتی" قلمبند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تری راہ میں سب دولت دنیا

سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف

کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت

پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے

اچھے تو سبھی کے ہیں برا میرے لئے ہے

محمد علی کا کلیجہ آخر عمر میں اپنوں ہی کے طعنوں سے جنہوں نے چھلنی ہوتے دیکھا ہے، وہی کچھ اس "شاعری" کی قدر کر سکتے ہیں۔ اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے
ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالم ماتم و شیون سے گونجنے لگا تو صاحب "معارف" مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان بھی اسی دوسرے مصرعے کو رکھا ع

ماتم یہ زمانے میں بپا تیرے لئے ہے۔

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا یا تعزیت نگار کو، عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو! ۱۹۲۲ء میں جسم قید فرنگ میں، دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ بیجاپور کا جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں، دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بےخود یہ قیدی گوشہ نشین کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی!
سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

مطلع سن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا
تفسیر آج ہو گئی کیدی متین کی![1]

---

[1] تلمیح ہے آیۂ کریمہ اِنَّ کَیدی مَتین کی طرف

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا!
اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی
اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے اس کے باب میں
کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی
تینوں حرم اُسی کے جو ہے لاشریک لہٗ
ترکیب ہے درست یہی ایک تین[1] کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑایا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا سدا میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے، بڑھے تھے کھیلے تھے چپہ چپہ دل میں لبا ہوا تھا مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جا سکتے۔ یہ کبھی کو یہ مستقل جلا وطنی بھگتنی پڑے جب قدر معلوم ہو، ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں اور آبدیدہ ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے
ایک اک کر کے سب کے سب تنکے ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال؟ ہم ہیں باشندے جیل خانے کے

قید اور وہ بھی تنہائی، بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں، سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا، کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا۔ راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان ورد خوانی پہ آئی تو کچھ اتے پتے اس عالم کے بھی دیتی

---

[1] اشارہ ہے مسیحوں کے عقیدہ توحید فی التثلیث کی طرف۔

پہلی گئی ہے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے ہیں وعدے
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں ایسی نیند پر ہزاروں آزادیاں، نثار ہوں اس ویرانے پر ہزارہا آبادیاں۔ مشتِ خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا۔ لوہا جب تپ کر، دہک کر لال انگارہ بن جائے تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے، جو اب عالم معانی و حقائق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی رہ کہاں گئی تھی؟ — ایک دیوانہ تھا جسے ایک دوسرے دیوانے نے مرنے کے بعد بھی بلاظاہری ملاقات و تعارف کے خوب پہچانا۔ اور خوب ہی کہہ ڈالا ہے

بدینِ مصطفٰی دیوانہ بودی   فدائے ملتِ جانانہ بودی
سیاست را نقاب چہرہ کردی   وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی
سیاست تہمتے بر عشقِ پاکت   ز آئین خرد بیگانہ بودی

رسیدی از راہ اغیار تا یار   عجب مستے عجب دیوانہ بودی۔

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن۔ نظم کے باقی اشعار سیرت محمد علی میں ہیں) زبان پر آئی ہوئی واہ کا غلغلہ بس سینہ خاک کے فرش تک۔ دل سے نکلی ہوئی آہ کی رسائی مالک عرش تک۔ رومی اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ کیا محض اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ نہیں بلکہ اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی زندہ روح ہوتی تھی، فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے محاورات تبدیل ہو گئے ترکیبیں نئی ہو گئیں لیکن جی اور قوم کا نام جینے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں، خود بھی زندہ اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی ہیں جو ہر نے بھی اپنے کو اسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کر دیا تھا عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی ان کے نصیب میں بھی آجائے!

دیباچہ

ماضی قریب میں اسلامی ہند کی سرزمین نے جو ممتاز ترین اکابر و مشاہیر پیدا کئے، اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جامعیت ان میں سر فہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایک ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری تاریخ عصر حاضر کی آجائے تو جواب میں صرف ایک ہی نام لیا جا سکتا ہے، اور وہ نام نبی اور ولی کے ناموں کا مجموعہ ہوگا یعنی محمد علی۔

اس دور نے یقیناً بعض بڑے اور جلیل القدر علماء دین پیدا کئے، لیکن ان کی ناموری صرف دینداروں کے طبقہ تک محدود رہی، بعض نامی وگرامی مشائخ طریقت پیدا کئے لیکن ان کا نام بس مریدوں اور معتقدوں کے حلقہ کے اندر رہا، بعض مشہور قومی "ریفارمر" پیدا کئے لیکن ان کی اور ان کے "ریفارم" دونوں کی شہرت جدید تعلیم یافتہ گروہ کے حدود سے آگے نہ بڑھی، بعض زبردست خطیب اور مقرر پیدا کئے، لیکن انہیں کانفرنسوں کے پلیٹ فارم اور کانگریسوں کے ڈائس کے باہر کسی نے نہ جانا۔ یہ حال مشاہیر خاص کا ہوا۔

دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر رہیں اور تنگ تر دائروں سے ان کی گونج آگے نہ بڑھی۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی ایسی تھی جس کی آواز شمال نے بھی سنی اور

۱؎ سیرت محمد علی از مولوی رئیس احمد جعفری ندوی، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۲ء نظر ثانی ۱۹۴۴ء

جنوب نے بھی، ہمالیہ کی بلندیوں نے بھی اور گنگا کی وادیوں نے بھی، خواص نے بھی اور عوام نے بھی، عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی، بوڑھوں نے بھی اور بچوں نے بھی، آسام نے بھی اور سندھ نے بھی اور دیہات کے گنواروں نے بھی، وائسرائگل لاج کی چمکتی اور جگمگاتی ہوئی بڑجیوں نے بھی، اور جیل خانہ کی تنگ و تاریک کال کوٹھڑیوں نے بھی، راجوں مہاراجوں کے قصر و ایوان نے بھی اور فاقہ کشوں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں نے بھی!

اس کا کلام سنکر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھلکھلا کر ہنسے، اس کا پیام سنکر مسجد کے در و دیوار بلبلا کر روئے، خانقاہیں اور درسگاہیں ہوٹل اور بازار، دفتر اور کارخانے "آزادوں" کی کانگریسیں اور "رجعت پسندوں" کی کانفرنسیں، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل، جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز!

معاصر اور حریف بہت سے تھے، قابل بھی اور فاضل بھی۔ لیکن قبول خداداد اور محبت تام کی دولت سے وہی ایک ممتاز، یہ سعادت "زور بازو" کا نتیجہ نہیں ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کا ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے یقیناً صحیح ہوگا۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کا ہو گیا تھا اللہ کے بندے اس کے ہو گئے تھے، محمد علی نے اپنے کو اللہ کی خاطر، اللہ کے دین کی خاطر، خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ خلق نے بھی اپنے تئیں محمد علی کے لئے وقف کر دیا۔ وعدہ ربانی ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمٰن ودا (مریم ع ۹)

یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال
کرتے رہتے ہیں خدائے الرحمٰن اُن کے لئے
(خلق کے دل میں) محبت پیدا کر دے گا۔

• کی تفسیر لفظ و عبارت میں بہت دیکھی تھی، گوشت و پوست کی مجسم تفسیر محمد علی کی زندگی میں نظر آئی

اس دل و دماغ کا، ان صفات و کمالات کا سردار کسی قوم کو خوش نصیبی ہی سے کہیں مدتوں میں ہاتھ آتا ہے۔ جنہیں یہ نعمت ملی اُنہوں نے قدر نہ کی ـــ وقت پر نعمت کی قدر دنیا نے کب کی ہے؟ ـــ دولت کیا ٹھہرنے والی اور نعمت کیا رُکنے والی تھی؟ ایک آنی دولت اور فانی نعمت تھی۔ آئی اور گئی۔ ـــ

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

اور پھر ہم مسلمان! ہم نے اپنی ساڑھے تیرہ سو سال کی تاریخ میں قدر کس کی پہچانی ہے؟ شیرِ خدا علی مرتضیٰ رضؓ کی؟ خلیفہ رسول عثمان غنی رضؓ کی؟ جوانانِ جنت کے سردار حسین رضؓ کی؟ جب اپنی شور بختیوں سے ایسے ایسے سرداروں کی قدر ہم نے نہ پہچانی تو اب اس کا کیا غم و ماتم کہ ان کے ایک ادنیٰ خادم محمد علی کی ناقدری رہی؟ اور یہ اسے خواہ مخواہ شور بختی ہی کیوں قرار دیجئے؟ حکیم مطلق کی حکمتوں کے بھید کون پا سکا ہے؟ خدا جانے کتنی تکوینی مصلحتیں ان میں بھی ہوں گی!

کم تھے جنہوں نے محمد علی کو پہچاننے کی کوشش کی، کم تر تھے جو اس کوشش میں کامیاب رہے ـ ادب و انشاپردازی، سیاست و قیادت، خطابت و صحافت، طرح طرح کے

گہرے گہرے نقاب کچھ اس طرح تہ بہ تہ پڑے ہوئے تھے کہ چہرہ کے اصلی خط و خال اور بشرہ کے حقیقی حسن و جمال کا مشاہدہ دشوار ہی ہو گیا تھا۔ مبارک تھے وہ جنھوں نے قریب آکر دیکھ لیا۔ مبارک تر تھے وہ جنھوں نے دور ہی سے فراست ایمانی کی روشنی میں بھانپ لیا اور جیتے جی نہ سہی، مرنے کے بعد یوں فاش و برملا کہہ دیا[1]

بدین مصطفےٰ دیوانہ بودی ۔۔۔ فدائے ملت جانانہ بودی

بہ بزم مارئیس عشق بازاں ۔۔۔ بہ رزم دشمناں فرزانہ بودی

بہ دل بودی فقیرے بے نوائے ۔۔۔ بہ قالب پیکر شاہانہ بودی

سیاست را نقابِ چہرہ کردی ۔۔۔ وگرنہ عاشق مستانہ بودی

سیاست تہمتی بر عشق پاکت ۔۔۔ ز آئینِ خرد بیگانہ بودی

چہ دانستی کجا سوزم، نہ سوزم ۔۔۔ تو شمع دین را پروانہ بودی

بایا تنہا ز تو زورے و شورے ۔۔۔ بجا تنہا ہمت مردانہ بودی

رمیدی از رہِ اغیار تا یار ۔۔۔ عجیب مستے عجب دیوانہ بودی

محمد علی کی بہت سی تصویریں کھینچی گئیں لیکن صحیح ترین مرقع یہی ہے۔ محمد علی پہلے جو کچھ بھی رہے ہوں علیگڈھ کے ایک مشہور "کھلنڈرے" آکسفورڈ کے ایک بہترین طالب علم، انگریزی

---

[1] الحاج مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی بہاری شیخ الحدیث (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) اہلِ دل اور اہلِ علم دونوں کی صفِ اوّل میں ہیں۔ زندگی میں کبھی محمد علی سے ملاقات نہیں ہوئی، وفات پر جو جلسۂ تعزیت حیدرآباد میں ہوا، بس اس میں مولانا آبدیدہ ہو گئے۔ اور وہیں تعزیتی تقریر میں رو رو کر یہ اشعار کہہ سنائے۔

کے ایک اعلیٰ انشاپرداز، انگریزی صحافت کے ایک جوہر، قابل شیکسپیئر کے ایک ماہر نقاد ایک سحر بیان مقرر، ایک بلند پایہ شاعر، ایک نامور رہنما، ایک ممتاز سیاسی لیڈر وغیرہ، لیکن آخر میں یہ آخر میں یہ ساری حیثیتیں گھل گھلا کر سمٹ سمٹا کر صرف ایک ہی حیثیت باقی رہ گئی تھی، اور وہ جو کبھی اپنی عقل و فرزانگی کے لئے مشہور تھا، اپنے "خبط" و دیوانگی کے لئے بدنام ہو کر رہ گیا! مرنے پر کانوں میں آوازیں آئیں کہ ملک و ملت کا سیاسی رہنما چل بسا، لیکن اپنے دل سے صدا اٹھی تو بس یہی، کہ آج محمدؐ کا دیوانہ دنیا سے رخصت ہو گیا!

ال، وہ ذاتِ محمدؐ کا شیدائی، دینِ مصطفیٰ کا دیوانہ اور امتِ محمدی کا بن دام کا غلام تھا۔ ہندوستان ہی میں نہیں عالم اسلام میں کہیں کسی کلمہ گو کے پھانس چبھتی اور چبھن محمد علی کے پہلو میں ہونے لگتی، مصیبت کسی مسلمان پر بھی آتے اور درد سے بیتاب محمد علی۔ اسلام پر، قانون اسلام پر، شعائر اسلام پر، کہیں کوئی حملہ ہوا تڑپ محمد علی کے دل و جگر میں پیدا! مقابلہ انگریزوں سے آ پڑے، ہندوؤں سے پڑ جائے، حکومت سے ہو، کسی سے بھی ہو، محمد علی کا سینہ ہر وار کے لئے سپر بنا ہوا! ۲۶ء میں حج اور شرکت مؤتمر اسلامیہ کے لئے جب جانے لگے، اور سلطان ابن سعود کی حکومت ابھی نئی نئی قائم ہوئی تھی، تو اپنے اردو روزنامہ ہمدرد میں اپنے قلم سے لکھا:۔

"اب نہ بنی امیہ کا دور ہو سکتا ہے، نہ بنو عباس کا، نہ خاندان عثمان کا، اب حکومت اسلام اہل اسلام کی ہو گی۔"

دن رات اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، یہی دھن تھی اور اسی کا کلمہ، آخری سفر پر، اور وہی سفر آخرت کا پیش خیمہ تھا، جب بمبئی سے روانہ ہونے لگے تو اس وقت بھی ناموسِ اسلام کے

تحفظ پر کچھ ایسے ہی الفاظ زبان سے کہے تھے۔ حق تھا کہ جب ایسے شخص کی موت آئے تو سارا عالم اسلام، شرق سے غرب تک اس کی عزاداری میں سیہ پوش ہو جائے اور شمال سے جنوب تک ایک ماتم سرا بن جائے، اور یہی ہوا، پھر غریب الوطنی کی موت کے بعد جگہ بھی ملی تو کہاں؟ وہاں جہاں کے لئے آرزو اور تمنا بڑے بڑے صدیقوں اور شہیدوں نے کی ہے۔ سلیمانؑ و داؤدؑ کا قبلہ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ کا قبلہ، جو نبی القبلتین کا پہلا قبلہ! اقبالؒ نے مرثیہ میں کیا خوب کہا ہے ؎

خاک قدس اورا بہ آغوش تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

"جسم" کو جو عروج نصیب ہوا سب نے دیکھا، "روح" کو جو مقام حاصل ہوا ہو گا اس کا اندازہ کون کرے؟ جسے آدمی کاندھوں پر اٹھا کر لائے اسے سب نے دیکھا۔ جسے نور کے فرشتے ہاتھوں ہاتھ لے گئے اس کے درجہ اور مرتبہ کو کون پہچانے الا ایک ایسا شخص جو ایک طرف وزیر ہند (مسٹر مانٹیگو) اور وزیر اعظم برطانیہ (مسٹر لائڈ جارج) کے سامنے لندن میں گھنٹوں مسئلہ خلافت پر آزادانہ اظہار خیال کر سکتا ہو، جو عین ہیجان مخالفت کے وقت ۱۹۲۰ء میں لندن اور پیرس کی بڑی بڑی مجلسوں میں ترکوں کی حمایت میں مدلل و مفصل، شستہ و برجستہ تقریر و تحریر پر قادر ہو۔ جو وائسرائے اور گورنروں کے سامنے، ساردا ایکٹ اور دوسرے قوانین کے سلسلہ میں مخالفانہ بحثیں کر کر کے انہیں قائل و معقول کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو جو اپنے انگریزی ہفتہ وار کامریڈ میں سیاست حاضرہ اور مذہب پر دس دس بیس بیس کالم کے مضامین بہترین ادب و انشا کے ساتھ سپرد قلم کر سکتا ہو، انگریزوں کی کلب لائف میں شریک ہو تو ایسا گھل مل جائے کہ انہیں میں سے ایک معلوم ہونے لگے، دوسری

طرف مسجد کے ممبر پر وعظ کہنے کھڑا ہو تو روتے روتے اپنی داڑھی بھگو لے، اور سننے والوں کی ہچکیاں بندھ بندھ جائیں، محفل سماع میں بیٹھے تو اس کا وجد و حال دیکھ کر دوسروں کو وجد آ جائے، مسئلۂ قتل مرتد پر فتویٰ جمہور کے خلاف جب قلم اٹھائے تو اپنے نفقہ کی داد اچھے اچھوں سے حاصل کرے، آزاد خیال اتنا کہ ہر کلمہ گو کو اپنا حقیقی بھائی سمجھ لے، متقشف ایسا کہ مصطفےٰ کمال اور امان اللہ خاں کو آخر تک معاف نہ کرے، نماز کا پابند اتنا کہ ایوان پارلیمنٹ کے برآمدہ میں بھی جانماز بچھا کر کھڑا ہو جائے اور اس عمارت کی ساری تاریخ میں بالکل ہی پہلی بار رکوع و سجود کی ایک نظیر قائم کر جائے، دلیر اتنا کہ دشمنوں کے بڑے سے بڑے مجمع میں گھس جائے، سلطان وقت کے منہ پر بھرے مجمع میں سب کچھ کہہ سن کر رکھ دے، ادیبوں کی محفل میں ادیب، شاعروں کی مجلس میں غزل گو، اہل سیاست کی صف میں ممتاز، عوام و خواص دونوں کے اعتماد و عقیدت سے سرفراز، ایسی "عامۃ الورود" ہستی کی سوانح حیات مرتب کرنا کوئی آسان بات ہے؟

مذہب، سیاست، علم، ادب، تعلیم صحافت کے سلسلہ میں جتنے بھی اہم جلسے اس بچیس، تیس سال کے اندر، اسلامی ہند کے اندر ہوئے، بلکہ عالم اسلامی کے طول و عرض میں جو بھی اہم تحریک کسی ادارے سے اٹھی محمد علی کی شخصیت اس کے اندر کارفرما اور محمد علی کا اثر براہ راست نہ سہی بالواسطہ اس میں موجود۔ ایسے شخص کی سیرت نگاری، ایک شخص کی سیرۃ لکھنا نہیں، وقت کی پوری تاریخ مرتب کر ڈالنا ہے، کس پہلو کو لیا جائے، کس کو چھوڑا جائے، کون کون سے رخ نمایاں کئے جائیں اور کون سے مدھم ہی رہنے دیئے جائیں، کیا کیا پھیلا جائے، اور کیا کیا سمیٹ لیا جائے، ہر موضوع ایک مفصل اور مبسوط گفتگو کا طالب، ہر عنوان ایک ضخیم دفتر کا متقاضی ۔

ضرورت تھی کہ اچھے جید اہل قلم اور پختہ کار مصنفین کی ایک پوری جماعت، ترتیب سوانح کا کام ہاتھ میں لیتی - اور وہ بھی برجستہ اور فی البدیہہ نہیں، ایک مدت تک تلاش و تفحص جاری رکھنے کے بعد، اپنی فکر و کاوش کے نتائج ایک نہیں کئی ضخیم مجلدات میں مرتب کر کے شائع کرتی لیکن حالات مساعد نہ ہونے تھے نہ ہوئے، تفصیلات کو چھوڑیئے، ان اسباب کی شرح اگر کی جائے تو خود ایک مستقل رسالہ "شرح اسباب" تیار ہو جائے، جمود اور افسردگی کے اس منظر کو دیکھ کر جامعہ ملیہ کا ایک نو عمر و نو نہال اہل قلم آگے بڑھا اور اپنی عمر و تجربہ کی کمی کو ہمت کی فراوانی سے پورا کر کے بلا تکلف اور بے دھڑک اس بار عظیم کے تلے اپنے سر و شانہ کو پیش کر دیا - جس کے سنبھالنے کے لئے کئی کئی قوی اور تنومند پہلوان، کشتیاں نکالے ہوئے، اور اکھاڑے جیتے ہوئے درکار تھے - آفرین و رحمت اس کی ہمت پر، آفرین و رحمت جامعہ کی مستعدی و کار گذاری پر، جامعہ، ان وہی محمد علی کی یادگار جامعہ ملیہ ـــــ وہ پودا جسے محمد علی نے اپنے ہاتھ سے زمین میں لگایا، بڑھایا، سینچا، پالا-

---

منازل سفر کی وادیاں، اور راہ کی دشواریاں، زادِ سفر کی بے سروسامانیاں اور یارانِ طریق کی کج ادائیاں ان سب کی شکایت کیا، اور کس سے کیجئے؛ اور کیجئے بھی تو سننے والوں سے امید کیا رکھئے؛ خود جوہر ہی کے الفاظ میں،

؎ مختصر کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے!

بہر کیف و بہر حال چند ماہ کی مختصر مدت میں، شوق و عقیدت کے جذبات، جو کچھ اپنے نقوش کاغذ کے دامن پر پھیلا سکتے تھے، وہ حاضر خدمت ہیں، یہ "تحفۂ دل" ہے، آن پہ مال تجارت" کا دھوکا نہ ہو

آگے بڑھنے سے قبل معروضات ذیل کو ذہن نشین فرما لیا جائے۔

صاحب سیرت کی زندگی، سپاہی کی زندگی تھی، ساری عمر دشمنوں سے بلکہ اکثر تو دوستوں سے بھی لڑتے اور مقابلہ کرتے ہی گذری، ممکن نہیں کہ محمد علی کی سیرت دیانت کے ساتھ لکھی جائے، اور محض بزم آرائیوں کی داستان پر ختم ہو جائے "خالد جانباز" کے وقائع اور کارناموں میں کوئی "حافظ شیراز" کا رنگ آخر کیوں کر بھر دے؟ بعض نازک دلوں کے جذبات کو بجا صدمہ یقیناً پہنچے گا اس کے لئے شروع ہی سے تیار ہو جانا ہے، مؤلف نے سنبھل سنبھل کر اور بہتوں کے جذبات کی رعایت کر کر کے قلم اٹھایا ہے، پھر بھی واقعات میں تحریف کے مجرم تو نہیں ہو سکتے تھے، علی مرتضیٰؓ کے سیرۃ نگار کے لئے جنگ صفین، اور حسینؓ ابن علیؓ کے سوانح نویس کے لئے میدان کربلا کے ذکر کو نظر انداز کر دینا، آخر ممکن کیونکر ہے۔

عروس ادب[1]

تقریب

ہوش - ذی ہوش، میرے پرانے عنایت فرما ہیں، حیدرآباد میں اُن کے عروج و زوال دونوں کا تماشہ ان آنکھوں نے دیکھا ہے[2]۔ ۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء میں ایک وقت وہ تھا، جب ہوش کی ہوشمندی کا ہر طرف چرچا تھا - ذخیرۂ سخن کی کنجی اُن کے ہاتھ میں تھی، اور ذخیرۂ زبان و ادب کا ذخیرہ کیا، یہ کہئے کہ پورا "گودام" بنا ہوا تھا - ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہوش مع اپنی "ہوش ربا"[3] کے اس جنت ارضی سے رخصت ہو گئے، اور ایک ظریف کو برجستہ یہ مصرع یاد آگیا ؎ "ہوش" رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ!

ایسے ہی واقعات عبرت سے ہم جیسے "بیہوشوں" تک کے ہوش اڑ جاتے ہیں!

مزاج عاشقانہ پایا ہے، اس لئے گردش تقدیر بھی کچھ عاشقوں ہی کی لازمی تھی ارض "فلک نما" پر خسرو دکن کے الطاف کریمانہ سے سرفراز تھے - یمین سلطنت مہاراجہ شاد

---

[1] عروس ادب، از ہوش بلگرامی، مطبوعہ ۱۹۲۵ء - نظر ثانی ۱۹۴۴ء

[2] اور اب اس مضمون کی نظر ثانی کے وقت، تیسری بار ان کے کمال عروج کا نظارہ کر رہا ہے ہوشیار ہمیشہ سے تھے - اب چشم بد دور، نواب ہوش یار جنگ بہادر ہیں۔

[3] ہوش بلگرامی اسی نام سے اخبار رسالہ حیدرآباد سے نکال رہے تھے۔

کی عنایتوں سے شادکام تھے، عماد الملک بہادر (سید حسین بلگرامی) کے سایۂ تربیت میں پروان چڑھ رہے تھے کہ دفعتہً یہی زمین ان کے حق میں آسمان بن گئی۔ "فلکِ کج رفتار" کے فرضی افسانے شاعری کی دنیا میں، خدا معلوم کتنی بار سن سنا چکے تھے، اب وہ "آپ بیتی" تھے۔ بالآخر سرزمین رامپور کی کشش نے انہیں اپنا لیا۔ سنتا ہے کہ یہاں افواجِ ریاست کے بخشی ہونے کی عزت انہیں بخشی گئی ہے۔ لیکن انہیں تو بخشی اردو کے لشکر کا ہونا تھا، ان کی فوج میں تو انشا کی تلواریں چمکتی تھیں، زبان کے پیادے بھرتی ہوتے تھے، ادب کے رسالے نکلتے تھے، فصاحت کی پلٹنیں آراستہ ہوتی تھیں، بلاغت کے قلعے تعمیر ہوتے تھے، شاعری کے معرکے سر ہوتے تھے اور مشاعروں کی توپیں ڈھلتی تھیں! ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رامپور بالقابہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ شاعر نواز بھی ہیں، ان کے لئے اس آرزو کو واقعہ میں تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے!

اردو کے ایک ادیب نے عرصہ ہوا ایک خط میں لکھا تھا کہ "ہوش تو بڑی رقم نکلے"

یہ بالکل درست تھا اور کیوں نہ درست ہوتا۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم کی صحبت و تربیت تو بے ہوشوں کو ذی ہوش بنا سکتی تھی، چہ جائیکہ اس کو جو مجسّم ہوش ہو۔ مرحوم نے ہوش کو یہی نہیں کہ مدتوں مثل اپنے عزیز کے رکھا بلکہ ان کے بعض مضامین کو بھی اپنی اصلاح سے مشرف فرمایا، اور غالباً ہوش مندی کے اندازہ کے بعد ہی یہ تخلص "ہوش" بھی عنایت فرمایا تھا۔ خدائے ہوش سے دعا ہے کہ اس "ستارۂ بلندی" کی تابش میں اضافہ کرتا رہے!

فاضل دوست مولوی عبد الحق صاحب کا ارشاد ہے کہ ہوش کے مزاج میں غضب کی جلدی ہے۔ جلدی ہو یا نہ ہو، لیکن تیزی تو یقیناً ہے — دل تیز، ہاتھ تیز، پیر تیز، سوجھ بوجھ تیز، قلم تیز، خیریت یہ گذری کہ زبان نہیں تیز، ورنہ اور ہر شئے میں تیز! اور محض تیز ہی نہیں، بلکہ تیز و طرار۔ ان کی تیزی و طراری، شوخی و رنگینی کے جلووں کی آئینہ داری اگر

مدنظر ہو تو بسم اللہ - عروس ادب کے چہرے سے نقاب الٹ کر خود ملاحظہ فرمایئے۔
خوش سلیقگی اور لطافت پسندی ہر شخص کے خاص جوہر ہیں - آن کو کونے آگے صفحات
کی سطر سطر میں ملیں گے - ان جواہر پاروں کی قدر و قیمت کا پرکھنا مرحوم مہدی حسن (صاحب
افادات مہدی) جیسے جوہری کا کام تھا ہم تماشائی تو محض اس بزم رنگیں کی سجاوٹ کو دور
سے دیکھ کر خوش ہو جانے والے ہیں! - عروس ادب کی کائنات میں انہوں نے اخلاق و
ادب، معاشرت، سیاسیات، ہر شعبۂ موجودات کا جائزہ لے ڈالا ہے، اور ہر میدان
میں گام زنی فرمادی ہے، لیکن آن کے کرپائے نازک کی شبک خرامیوں کے لئے ادبیات ہی کا
فرش مخملیں کچھ زیادہ موزوں ہے! خدا کرے پاک آنہیں زیادہ فرصت و فراغت نصیب کرے
کہ زبان و ادب کی زیادہ گراں مایہ خدمات انجام دے سکیں اور جیسے "عروس" کا ڈولا اپنے
گھر لائے ہیں، اس کا اور ان کا دونوں کا نصیبہ بلند ہو!

تقریب

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر — ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

اکبرؔ و اقبالؔ کے دور سے قبل، اپنے شعر و تغزل کے وصف آپ نے شاعر ہی کی زبان سے سن لیے؟ اپنی دو قرن قبل والی شاعری کا عکس، آپ نے خود شاعری کے آئینہ میں دیکھ لیا؟ — کیا اب اس کی بھی حاجت ہے کہ اس "ناپاک دفتر" کے کچھ اوراق بہ طور نمونہ، آپ کی خدمت میں پیش کئے جائیں؟ گویا دن دوپہر کی کڑی دھوپ کے وقت اس کی بھی حاجت ہوتی ہے کہ پہلے صغریٰ و کبریٰ قائم ہولیں اور انتاج مقدمات کی باضابطہ شکل مرتب ہولے جب جاکر آفتاب کے روشن ہونے کا یقین آئے۔

بات اتنی صاف اور کھلی ہوئی، حقیقت اتنی روشن و واضح، لیکن آج سے پچاس ساٹھ سال اُدھر جب پہلی بار حالیؔ کی زبان سے نکلی، تو بس اک آگ سی لگ گئی، اور آگ بھی کہاں؟ راون کی لنکا میں! عفریتوں اور راکششوں سے بھری اور پٹی پڑی ہوئی

---

¹ مسدس حالی (صدی ایڈیشن) ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
تحریر: ۱۹۳۵ء نظر ثانی ۱۹۴۴ء

لگتا ہیں! بڑے سے بڑے چیلنج ، لیڈر کرکے ٹرسٹ پڑھے، جواب کے لئے ، ترمیم کے لئے ،
تنقید کے لئے ۔ کوئی صاحب حال اس کے مقابلہ میں قوال سے کر قوالی پر آئے گا ، صاحب نے
خیالی گھوڑے پر چلا ، اور پنج اخبارات کی تہ تک پہنچے نہ ۔ اس بے چاروں کا تو آوازہ تک گیا ۔
"حال کا حال"؟ اور "میاں اپنی بیت کی طرح پامال" یہ تھا ان کی تمام بھرپور دھمال ،
اور اس کی سعتوں کا کمال ——————— دوسروں کو بنانے سے پیشتر
خود ہی مسخرے بن کر رہے !

آج یہ سارے جوابات کہاں ہیں ؟ ان اخبارات کی پرانی فائلیں بھی کہیں ملتی ہیں ؟ اس
ساری دھوم دھام ، کڑک گرج کا کہیں نام و نشان بھی باقی ہے ؟ "حل کشف منہم من احد
او تسمع لہم رکزا" ؟ سیٹروں ، ہزاروں کتب والوں کی کاپیاں ، اور بازاری پھبتیاں کبھی کی
ہوئیں ختم ہو چکیں ——— اور ان کے مقابلہ میں "مسدس" ؟ کیا یہ کہنے کی ، یہ بتلانے کی ،
حاجت ہے ، کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے ، کتنی محفلوں میں بند
اس کے پڑھے جا چکے ، واعظ کی کتنی خطبوں کو یہ گرما چکا ، کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں
داخل یہ ہو چکا ، کتنے بڈھوں کی ، جوانوں کی ، لڑکوں کی ، زندگی میں انقلاب اثر
پیدا یہ کر چکا ، کتنوں کو رلا کر یہ رہا ، کتنوں کے دل اس نے بڑھا لیئے غرض مقبولیت کے
مرجعیت کے ، جتنے بھی معیار ہو سکتے ہیں ، سب کے لحاظ سے آج اسے دیکھ لیجئے ، جانچ لیجئے
پرکھ لیجئے ! ——— بھلا ایک صاحب حال عارف ، کہیں آہ و زاری کے ساتھ ، گرم
گرم آنسوؤں کے ساتھ ، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ مناجات میں معروف ہو اور
شہر کے کچھ لفنگے آ کر لگیں تالیاں بجانے ، ڈھول پیٹنے ، تو اس سارے سوانگ سے
اس اللہ والے کی مقبولیت میں کچھ فرق آ سکے گا ؟

تقریب کا عنوان، آپ کہیں گے کہ مسدس حالی، کیوں نہ رکھا گیا ادھورا یعنی صرف مسدس کیوں رکھا؟ ادھر سے عرض ہوگی کہ مطلق مسدس بھی مراد ہوسکتا ہے؟ محض مسدس بولنے سے کیا ذہن کسی دوسرے مسدس کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے؟ کسی اور مسدس کا التباس ہوتا ہے؟ ـــــ مثنوی مطلق بولنے سے، اگر ذہن صرف مثنوی مولانائے روم ہی کی جانب جاتا ہے تو مطلق مسدس کے لفظ سے بجز مسدس حالی کے اور کچھ کوئی کیوں سمجھنے لگا؟ کسی اور کا دھوکا کسی کو کیوں ہونے لگا؟ کوئی دوسرا مسدس فرط شہرت سے فرط مقبولیت سے ذہنوں کے سامنے ہے کیا؟

خیر یہ تو ایک لفظی سی گفتگو چھڑ گئی، اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا، اور اس شان کا، اس جمال کا، اور اس کمال کا، اردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی؟ جب اپنے "آج" کی پستیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھئے، کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے ؎

کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے　　کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے

چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی　　مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی

نہ گالی سے، دشنام سے جی چرائیں　　نہ جوتی سے بیزار ہیں نہ پیچھے ہٹیں

جو میلوں میں جائیں تو چھپن دکھائیں　　جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اٹھائیں

لرزتے ہیں اوباش ان کی ہنسی سے　　گریزاں ہیں رند ان کی ہمسائگی سے

اور جب اپنے گذرے ہوئے "کل" کی بلندیوں کی تاریخ سنانے لگتا ہے تو اک دم ناصحِ ملامت گر شاعر رجز خواں بن جاتا ہے ؎

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی

پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی

کڑک اور دمک اور صدا کی پہنچی جو ٹیکس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

. . . .

کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں مہیا کئے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں انہیں کر دیا رشک صحن گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

خامیوں سے کون بشری تالیف آج تک بچ سکی ہے؛ کون آئندہ بچ سکے گی؛ نکتہ چینی پر کوئی آجائے، تو عیب کہاں نہیں نکل سکتا؛ تو اس معیار کو خیر جانے ہی دیجئے، حق وانصاف کے کوچے سے اگر آئیے، تو صدا لگتی یہ ہے کہ مسدس اپنا کام مدت ہوئی کر چکا، احساس کی بیداری جو اس کا مقصد تھا، ابھی مدتیں گذریں کامیاب ہو چکا، اکبر اور اقبال جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا، اگر اس کے بعد مٹ گیا ہوتا۔ دنیا اسے بھول گئی ہوتی، جب بھی یہ اس کی منقصت نہ تھی، عین فطرت کا تقاضا تھا۔ ضرورت دعوت پوری ہو چکنے کے بعد داعی کو باقی رکھنا سنت الٰہیہ میں داخل ہی نہیں لیکن جب کوئی اپنی بخششوں کو بغیر حساب اور بغیر شمار لٹانے والا محض فضل اور محض انعام پر آجائے، تو کیا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؛ جس کو جتنی چاہے دولت حیات سے سرفراز کرے!

اور پھر وہ جو رسولؐ کی زبان سے توحید کی منادی کرنے پر آجائے تو تکبیر و تحمید کا غلغلہ ڈال دے سے

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

اسی کے ہیں فرمان طاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق

. . . . . . — نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی!

جہاں دار مغلوب و مقہور ہیں واں — نبی اور صدیق مجبور ہیں واں!

نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں — نہ پروا ہے ابرار و احبار کی واں

. . . . . . — مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا

سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ — اسی طرح ہیں بھی ہوں اک اس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم — نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم

نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم — کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بڑائی — کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

اور لعنت گوئی کی لے جب چھیڑے تو منہ کے بول یوں زمزمے بن بن کر نکلنے لگیں ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا! — دعائے خلیل اور نوید مسیحا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ — یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

. . . .

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا! — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور جب وہ بارِ رسالت میں فریاد و استغاثہ کرے، تو سننے والوں کے دل ہلا کر رکھ دے ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی !
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے

جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے

بتا تو ترے جب کہ یہ اعدا پہ ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے

کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے

امت میں تری نیک بھی ہیں، بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا ایک سے اک ان میں سوا ہے

جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری امت کا رہا ہے

جس ملک نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبے سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

گر بد ہیں تو حق اپنا ہے کچھ تجھ پہ زیادہ
اخبار میں الطالح لی ہم نے سنا ہے

تدبیر سنبھلنے کی نہیں کوئی ہمارے
ہاں ایک دعا تیری کہ مقبول خدا ہے
خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سوا ہے
گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہے

زندگی اس کلام کو بھی نصیب نہ ہوگی تو اور کس کو ہوگی ؟ حق یہی ہے کہ اس کی عمر بڑھے اور خوب بڑھے، اور ہم جیسے حشرات الارض قسم کے فانیوں کے تخیل سے اندازے سے، کہیں بڑھ کر رہے۔

سفرِ سعادت [1]

(تعارف)

ایک نام کے "امیر"، اور دل کے فقیر کا، میرا ساتھ عرفات کے میدان میں رہا، منیٰ کی قربانگاہ میں رہا، مزدلفہ کی گھاٹیوں میں رہا، صفا کی بلندیوں پر رہا، مکہ کی سڑکوں پر رہا، مدینہ کی گلیوں میں رہا، بندرگاہ جدہ کے دفتروں میں رہا، جہاز رحمانی کے تختوں پر رہا، خشکی میں رہا، تری میں رہا۔ غرض سفرِ سعادت کی اکثر منزلوں اور بیشتر حصوں میں رہا، پھر اگر اس روزنامچہ سعادت کی پیش خوانی مجھ گمنام مشتِ خاک کے نصیب میں آرہی ہو، تو اس سعادت پر کسی کو رشک اور کسی کو حیرت کیوں ہو؟ ——— مجھ کے فخر و مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ "گل" سے اس کا قافیہ ملجاتا ہے۔

روزنامچہ کے مصنف ایک پرانے مشاق اہلِ قلم ہیں، لیکن جب سفرِ حج کو نکلے تو اپنا قلم یہیں چھوڑتے گئے۔ زادِ سفر میں بس پہلو میں ایک دل تھا جو درد سے چھلک رہا تھا۔ وہاں جو کچھ دیکھا، جو سنا اُسے سادہ زبان میں اپنی یادداشت کے لئے نوٹ کرتے گئے۔ ذوق شکستگی نے اجازت نہ دی کہ پبلک کے لئے کوئی تصنیف تیار کریں شاعری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ بہترین شعر وہ نہیں جو دنیا کو سنانے کے لئے کہے جاتے ہیں، بلکہ وہ ہوتے ہیں جو خود اپنے لئے کہے جاتے ہیں۔ بعض اوقات نثر کی کتابیں بھی شاعری کے اس معیار سے جانچنے کے قابل ہوتی ہیں۔ سفرنامے آپ نے بہت سے دیکھے ہوں گے اس مجموعۂ اوراق کا انداز سب سے نرالا پائیں گے۔ یہاں مصنف دوسروں کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو مخاطب کئے ہوئے ہے

---

[1] از مولوی حاجی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔

زیادہ سے زیادہ اس لطف میں اپنے مخصوص احباب و اعزہ کو شریک کرنا چاہتا ہے، یا ان لوگوں کو جو مصنف ہی کی طرح اس سفرِ سعادت سے بہرہ اندوز ہو چکے ہیں، اور بس۔ مصنف صاحب اپنی روئدادِ سفر کو زیادہ رنگین اور مرصع ادیبانہ و انشا پردازانہ بنا سکتے تھے اگر چاہتے، لیکن اس سادہ اور بے تصنع پیرائہ تحریر کی دلکشی ہی کچھ اور ہے — شام کو ہوا خوری کے لئے ہزار بن سنور کر باہر نکلئے، وہ بات کہاں جو گھر کے اندر بے تکلف، گلی، یا بلا صبح بیٹھے اٹھنے میں ہے۔ لیکن یہ خیال نہ گزرے کہ مصنف آنکھیں بند کرکے گئے تھے اور صرف چند گھریلو باتیں اپنی نوٹ بک میں ٹانک کر اسی طرح آنکھیں بند کئے واپس چلے آئے۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، کم لوگ دیکھتے ہیں، اور اُن سے بھی کمتر زبان پر لاتے ہیں۔ آنہیں عید مکہ میں ہوتی ہے۔ اس جشن کی خوشیاں آنہوں نے "سفرِ سعادت" کے صفحات پر خوب سنائی ہیں، لیکن اس کے بعد ذرا دل تھام کر اُن کے الفاظِ ذیل بھی پڑھ لیجئے:۔

"میں ہندوستان کا رہنے والا، عقیدہ کا بودا، ایمان کا کمزور، اسباب و علل پر نظر کرنے والا اور علتِ علل سے غافل، آج دارالسلام کی عید اور یہاں کی شان و شوکت دیکھ کر جتنا خوش ہوا اتنا ہی چند باتوں سے ملول بھی ہوا۔ خوشی کا بیان ہو چکا، اب غم کی داستان سنئے:۔

حجاز کا بیشتر حصہ یورپ کی حکومت سے بحمد اللہ ابھی نیم آزاد ہے لیکن عربستان کی اقتصادی فتح لندن کو حاصل ہو چکی ہے۔ یہاں کے بازار انگلستان کے مصنوعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ آج شہر میں ہزاروں روپے کے کھلونے فروخت ہو رہے ہیں، اور وہ سب یورپ کے بنے ہوئے ہیں۔ ربڑ کے گیند، ربڑ کے پھکنے، ربڑ کے غبارے

ٹین کے انجن، ٹین کی ریل گاڑیاں، اور ارگن باجے وغیرہ لاکھوں کی تعداد میں یہاں بک رہے ہیں۔ کوئی لڑکا مجھ کو نظر نہ آیا جس کے ہاتھ میں دو چار کھلونے اس قسم کے نہوں۔ افسوس ہے کہ غریب حجاج کی کمائی، اہل مکہ کے کام نہ آئی، بلکہ یہاں سے بھی اسی طرح ولایت کو پہنچتی ہے، جیسے ہمارے بدنصیب ملک سے جاتی ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ صرف موٹر کے لوازمات جو اس سال انگلستان سے آئے، ان کی قیمت ۸۰ لاکھ اسی ہزار پاؤنڈ تھی! یہ لوازمات یورپ کے دوسرے مقامات سے بھی آئے تھے، مگر ان کی قیمت مندرجہ بالا حساب میں شامل نہیں۔ ایک موٹر پر کیا موقوف ہے، یہاں کی قریب ہر ایک جنس انگلستان ہی سے آتی ہے، اور تمام دنیائے اسلام کی کمائی مکہ کے راستہ سے یورپ پہنچتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں کی عورتوں کو انگریزی فیشن کی طرف بدرجہ غایت رغبت ہو گئی ہے۔ برقعہ کبھی وقت زینت چھپانے کے لئے تھا مگر افسوس اب اس کا مقصود زینت کو دوبالا کرنا ہے۔ زرق برق ریشمی کپڑوں اور اطلسی نقاٖوں کے برقعے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی چمک دمک خواہ مخواہ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ نابالغ لڑکیاں جو بے نقاب پھرتی ہیں، وہ سر تا پا انگریزی لباس میں ہیں وہی ریشمی ساٹے، اور وہی اونچی ایڑی کے بوٹ۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

اور آگے بڑھیے، اور خون کے آنسو بہائیے:۔

"انگریزی مٹھائیاں، انگریزی بسکٹ بازار میں بھرے پڑے ہیں۔ سگرٹ وچائے شرطِ زندگی ہے۔ گولہ بارود ولایت سے آتا ہے، ڈاک کے ٹکٹ ولایت سے چھپ کر آتے ہیں ریال وقسرش لندن سے بن کر آتے ہیں۔ کپڑا انگلستان سے آتا ہے۔ اناج کے لئے ہمیشہ ہی سے یہ وادی غیر مزروعہ ہے، یہاں کی خالص پیداوار صرف تربوز ہیں یا زمزم کا مقدس پانی۔ اونٹ معاش کا ذریعہ تھے اور شریف حسین سابق ملک الحجاز کے قول کے مطابق جو وقت اونٹ کا بچہ پہلی بار مکہ میں آتا تھا، اس وقت سے اس ساعت تک جبکہ وہ صرف پوست واستخوان کا ڈھانچہ رہ جاتا تھا، ہر ایک اونٹ ۱۴۰ خاندانوں کی پرورش کرتا تھا، کیونکہ اس آلۂ بار برداری کے تمام لوازمات مکہ یا اس کے ملحقات ہی میں تیار ہوتے تھے، مگر اب موٹروں کی بدولت وہ رزق کا دروازہ بھی قریب قریب بند ہے۔ ایک شرمناک بات ہے جس کو لکھتے قلق ہوتا ہے کہ جوان عورتیں بازار میں حاجیوں سے خیرات طلب کرتی ہیں، اور ان کو روپیہ وصول کرنے کے لئے اغیار سے بغل گیر ہوجانے میں بھی غیرت نہیں آتی، زیادہ لکھنا خلاف تہذیب ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا"۔

ذرا کرکے ایک قدم آخری بار اور اٹھا لیجئے:۔

"معاشرت کا یہ حال تھا۔ اب سیاسیات پر غور کیجئے، جدہ میں خطبہ وسکہ سلطان ابن سعود کا ہے، لیکن حکومت درحقیقت برٹش کانسل کرتا

ہے۔ ابن سعود کے لونڈی غلام بھاگ کر انگریزی سفارت خانے میں پناہ لیتے ہیں اور کانسل جنرل ان کو جہازات پر سوار کرا کے بے تکلف ممالک سے باہر نکال دیتا ہے لیکن ملک الحجاز دم نہیں مار سکتا۔ کانسل کی اجازت کے بغیر کوئی قافلہ جدہ سے مکہ یا مدینہ نہیں جا سکتا۔ مگر بادشاہ کو دخل دینے کا اختیار نہیں، سفارت خانے نے افغانیوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے واپسی کے ٹکٹ واپس کانسل کے پاس جمع نہ کئے تو وہ مکہ نہ جانے پائیں گے۔ مگر عرب کا (بزعم خود) خود مختار بادشاہ زبان ہلانے کی مجال نہیں رکھتا۔

مکہ معظمہ اللہ کی حفاظت میں ہے، مگر انگریزی کانسل جس دن چاہے چند گھنٹوں میں یہاں قبضہ کر سکتا ہے۔ نجد کا فوج جو یہاں مقیم ہے وہ قواعد دان کیا ہوتی، آلات حرب سے بھی صحیح طور پر مسلح نہیں ہے۔ جس نے جمعۃ الوداع کے دن اور آج بھی ان کا جلوس دیکھا کسی کے پاؤں میں جوتا ہے، کوئی چپل پہنے ہے اور کوئی ننگے پاؤں کاندھے پر بندوق رکھے چل رہا ہے۔ کارتوس کی پیٹیاں کمر میں بندھی ہیں، معلوم نہیں خالی ہیں یا بھری ہوئی، مگر بندوقیں ٹوٹی ہوئی اور زنگ خوردہ ہیں۔ یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے، ہندوستان میں حیدرآباد گوالیار اور اندور کی فوجیں اس سلطانی لشکر سے زیادہ آراستہ و پیراستہ ہیں۔"

نجدیوں نے مزارات و مشاہد کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور قبور صالحین کی جس طرح توہین کی ہے

خوش عقیدہ و صوفی مشرب مصنّف کا دل اس سے قدرۃً دُکھا اور یہ دل کی دُکھن آپ کو ان اوراق میں جا بجا نظر آئے گی ساتھ ہی حکومت سعودیہ نے جو بے نظیر امن و امان قائم کر رکھا ہے، مصنّف کی انصاف پسندی اس سے بھی اغماض روا نہیں رکھتی۔ اس کا اعتراف آپ کو ہر مناسب موقع پر ملے گا۔

مصنّف صاحب کو "معلّم" کے جن مظالم سے بالا پڑا تھا، اُن کا تذکرہ اس بسط و تفصیل کے ساتھ ممکن ہے بعض نازک طبائع کو گراں گزرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۔

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل

کا اندازہ "سبک ساران ساحل" کسی طرح کر ہی نہیں سکتے۔ جس غریب کو قدم قدم پر اگر "فسوق" نہیں تو "جدال" پر مجبور ہو جانا پڑتا ہو، مستحبات و سنن سب ایک ایک کر کے ہاتھ سے جا رہے ہوں، سکون قلب و انبساط کے بجائے ہر لمحہ انقباض و تشویش کا شکار بننا پڑ رہا ہو، بلکہ دھڑکا یہ لگا ہو کہ سارا حج ہی غارت ہوا جا رہا ہے، اس کا رونا رویاں "معلّم" کی جان کو رو بیٹھنا یہی غنیمت ہے کہ وہ سفرنامہ کی جگہ "معلّم سکندر" کے کارناموں کے بیان میں پورا سکندر نامہ نہیں لکھ ڈالتا! دوسروں کو ایسے خطرات سے آگاہ کر دینا، جائز ہی نہیں واجب ہے۔

کوئی بشری کوشش، بشری لغزشوں سے پاک نہیں رہ سکتی، مصنّف نے اپنے اس نیاز مند کا ذکر ان اوراق میں متعدد مقامات پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں تو افراطِ حسن ظن کا کمال ہی دکھا دیا ہے، اور اپنی ساری شہرتِ ثقاہت خاک میں ملا کر رکھ دی ہے۔ محدثین کرام نے صوفیہ و مشائخ سے روایات قبول کرنے میں جو احتیاط برتی ہے، اس کی حکمت کا یقین تو پہلے سے تھا ہی، اب عین الیقین ہو گیا۔

مشک کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر آپ کا شامہ درست ہے تو آپ مشک کے سامنے

آپ نے ہی خود اسے پہچان لیں گے، اگر مشرک کی بدلسانی اور خیر بزبانی سے قطعاً مستغنی رہیں گے
بیمار بھی دیار حبیب سے آیا ہوا شک آپ کے ساتھ ساز نہ ہے، اگر شام جان کہیں نوشہ ہو۔
محسوس کرے تو مصنف اوراق کے ساتھ اس نامہ سیاہ تعارف نگار کے حق میں بھی دعائے خیر فرما
دیجیے گا۔ اللہ آپ کو احسنائے خیر سے محروم نہ رکھے گا۔

(تعارف)

حضرت سید احمد رح رائے بریلوی پچھلی صدی ہجری کے اُن اکابر و مشاہیر میں گذرے ہیں جن کی یاد، مسجدوں اور خانقاہوں کی دنیا الگ رہی، لندن اور آکسفرڈ اور کیمبرج کی دنیا سے بھی حافظہ سے محو نہیں ہوئی ہے "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" ان کے تذکرہ سے مُزین، "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" میں ذکر ان کا موجود، "انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں کارنامے ان کے مذکور۔ یہ الگ بات ہے کہ دوست انہیں عقیدت کی آنکھوں کے اندر جگہ دیتے ہیں اور دشمن کی نگاہ میں وہ کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں لیکن نظریں اس شہید پر بہرحال پڑتی ہی ہیں ؎

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

— جس کا نام ملائکہ ربانی کے نورانی رجسٹروں میں درج ہو، اس کے تذکروں اور چرچوں سے اگر خاکیوں کے سینے، اور آدم زادوں کے سفینے معمور ہوں، تو اس پر حیرت کیوں کیجئے!

سید صاحب رح کے سوانح و حالات، کرامات و کمالات میں ضمناً و مستقلاً اس وقت تک متعدد کتابیں موجود تھیں، لیکن اکثر نے سید صاحب کو ایک مخصوص و محدود سی نقطۂ نظر سے

---

[1] از:- مولانا ابوالحسن علی ندوی، طبع ۱۹۳۹ء

دیکھاسے ہر کسے از ظن خود شد یار من
وز درون من نہ جست اسرار من

ضرورت اس کی تھی کہ کوئی سیرت ملک کی عام زبان میں، سلجھے ہوئے انداز سے، ایسی لکھی جائے، جو ایک طرف آپ کی ساری حیثیات کی جامع ہو، اور جس میں عام پسند خوارق و عجائب سے زیادہ لحاظ واقعات کی صحت و استناد کا، اور آپ کی تعلیمات، اور آپ کی تحریک کے اصل مقاصد کا رکھا جائے،

شکر ہے کہ یہ سعادت، سو برس سے زائد عرصہ گذر چکنے کے بعد اسی خانوادہ کے ایک ہونہار صاحب رشد، جوان ہمت، اہل قلم کے نصیب میں آئی۔ کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک مجاہد کی سوانحمری میں ہونا چاہیے، لیکن نذر یہاں صرف شوق غزا ہی پر نہیں ختم ہو گیا ہے، علوم شریعت، مسائل طریقت، مباحث سیاست، سب اپنی اپنی جگہ پر حسن ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس محمل میں سجتے ہوئے نظر آئیں گے، زبان صاف سلیس، شیریں بیان میں نہ اتنا اختصار کہ پڑھنے والے کا شوق جھنجلا اٹھے، نہ اتنی طوالت کہ مطالعہ کرنے والے کی ہمت جواب دے نکلے۔ پھر سید صاحبؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ کے ساتھ ساتھ ان کے اور سارے رفقا نامدار کے بھی انفاس بابرکات۔ گویا سپہر جہاد و خدمت دین کے آفتاب و ماہتاب کے جلو میں ستارے اور سیارے بھی ہر طرف سے جھرمٹ کئے ہوئے۔

کم از کم ایک سبق تو کتاب کے مطالعہ سے عالم و عامی، بوڑھے اور جوان، خاص و عام سب کے لئے کا ہے، اور وہ سبق نظم و اطاعت کا ہے۔ اگر اندرونی نظم درست نہیں، اگر فاروقی شان انتظام و تدبر کی روح جسم میں دوڑی ہوئی نہیں ہے، تو زیادہ سے زیادہ ایثار و اخلاص اور بڑے سے بڑا جوش و ولولہ بھی، اس عالم اسباب میں بیکار و ضائع ہو کر رہتا

سہے ۔ اگر یہی ایک سبق پڑھنے والے حاصل کر لیں گے تو بہت کچھ حاصل کر لیں گے۔

ب ۔۔۔ مشک کی مدح و توصیف عطار کی زبان سے، مشک کی قدر و قیمت بڑھاتی نہیں اور گھٹا دیتی ہے۔ عطار ہٹا جاتا ہے، مشک حاضر ہے، بے تکلف مشام جاں معطر فرمائیں ۔

رخِ نظمِ اُردو[1]

پیش لفظ

"یاد بالخیر، واقعہ یہ ہے کہ کوئی تین سال ہوئے صوبہ کی ہندوستانی اکیڈیمی
میں جب ناطق صاحب اپنی نظم سنانے کھڑے ہوتے تو ان سطور کے راقم
... نے شروع کیا نکتہ چینی اور عیب جوئی کے کانوں سے لیکن پہلے بند کا پہلا شعر
ان کی زبان سے ادا ہوا تھا کہ شکاری خود شکار بن چلا، اور جو اعتراض کی کمینگاہ میں
"اعتراف کے میدان میں آنے لگا۔ ابھی وہی بند پورے ہوئے تھے کہ زبان پر
"واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے آنے لگے اور جو منتقد تھا اُسے معتقد بنتے بن پڑی
جگ بیتی تو خیر نہیں، آپ بیتی یہ تھی۔ اب چاہے اسے کہہ لیجئے شاعری کی ساحری، یا زبان و ادب
کی افسوں گری، بہر صورت یہ بھی نطقِ ناطق ہی کی کرامت، کلامِ ناطق کا اعجاز!

وہی نظم اب مکمل صورت میں آپ کے سامنے ہے، تعارف، حیران ہوں کیونکر کرایا
جائے۔ مشک کے تعارف کے لئے خود عطار کا زبان کھولنا، خوشبوئے مشک کی توہین کرنا ہے،
چہ جائیکہ اس کی جسارت وہ کرے جو عطار بھی نہیں! —— حسین و جمیل چہرہ کے حسن و جمال کے

---

[1] از حکیم سعید احمد صاحب ناطق، طبع شدہ ۱۹۴۰ء نظر ثانی مارچ ۱۹۴۴ء

ادراک کے لئے ضرورت تو صرف آنکھ کی ہے، زبان ایسے موقع کے لئے بالکل بے زبان! "دیدار" کا کام "گفتار" آخر کیونکر دے سکے؟ دن کے پھیلے ہوئے اجالے میں یہ کہنا کہ دیکھو آفتاب کیسا روشن ہے، یہ تعارف آفتاب کا نہ ہوا، یہ درپردہ اپنی تعریف ہوئی کہ ہم بھی چشمِ روشن اور آفتاب شناس رکھتے ہیں ؎ مادحِ خورشید مدّاحِ خود است

کیں دو چشمم روشن و نامرمد است

ایک گوشہ نشین دیہاتی کے لئے پیش لفظ کا ایما، درحقیقت خود اس کی عزت افزائی ہے کہ تو بھی اس قابل ہے کہ بزم ادب میں در آئے، اور سخن سنجوں کی محفل میں بار پائے۔

اچھا شعر تو وہ ہے جو آفتاب کی روشنی کی طرح خود اپنے کو منوالے۔ مسدس ناطق کی بسم اللہ سنیے ؎ گفتگو ناطق یہ ہے آغازِ اردو کب ہوا

جستجو یہ ہے کہ ظاہر رازِ اردو کب ہوا

"زبان" کا مسئلہ، اور اس کا آغاز "گفتگو" سے سبحان اللہ! اور کہیے معاً "ناطق" مومن خاں مرحوم کے مقطعوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ "گفتگو" کے معنی محاورہ میں محض "بات چیت" کے نہیں "سوال" یا "مسئلہ" کے بھی ہیں، اور دوسرے مصرع میں ٹھیک اسی کے وزن و مفہوم کا لفظ "جستجو" صنعت مناسبت لفظی کو تو لکھنؤ کے چند قافیہ بندوں نے سوء استعمال اور افراط بیجا سے غارت اور بدنام کردیا، ورنہ اگر اپنے حدود کے اندر اور قرینہ سے ہے، اور کلام میں ٹھونس کر نہ لائی جائے، بلکہ بے تکلف آجائے، تو یہ حسنِ انشاء کی جان ہے۔

؎ انجمن میں نغمہ آرا سازِ اردو کب ہوا

سازِ بزمِ ہند ہم آوازِ اردو کب ہوا

وہی توازن جو پہلے شعر میں تھا، اس دوسرے شعر میں بھی موجود۔

~ ایک ہی دھن سنتے سنتے ہو گئے ہیں کان سن
دعویِ ایجادِ اردو کی لگی ہے سب کو دھن

دھن، پہلے مصرع میں، بہ اصطلاحِ موسیقی ہے، دوسرے میں اپنے عام معنی میں، اور بات کتنی سچی ہے، تاریخ کی تاریخ، اور شاعری کی شاعری،

اب آگے کہا ہے کہ جسے دیکھیے، ایجادِ اردو کا سہرا اپنے ہی سر باندھنا چاہتا ہے دہلی والے کہتے ہیں کہ اردو کی زچہ گیریاں ہم نے گائی ہیں۔ دکن والے بولے کہ پودے کا تخم تو ہماری سرزمین پر پڑا ہے، پنجاب سے آواز آئی کہ یہ دریا ہمارے ہاں سے رواں ہوا ہے۔ بہار نے دعویٰ کیا کہ اس بہار نے تو سب سے پہلے ہمارے چمن کو کھلایا ہے۔ اب دیکھیے جناب ناطق اس پر بحث چراغ کو کس حسنِ ادا سے روشن کرتے ہیں۔ اور شاعری کے دھاگے میں کس لطافت سے تاریخ کے موتی پروتے جاتے ہیں ~

دہلوی، بازارِ اردو میں خریدارِ زباں
دکنی، دربارِ اردو میں گہربارِ زباں !
عہدِ محمودی سے ہے پنجاب سرکارِ زباں
بودھ تک پہنچے بہاری لے کے زنارِ زباں

یہ الفاظ لائے ہیں یا ایک ایک مصرع کی انگوٹھی میں نگینہ پر نگینہ جڑتے چلے گئے ہیں آگے فیصلۂ ناطق ملاحظہ ہو ~

ایک مورخ کیا کہے کب اور کہاں پیدا ہوئی
ملک میں تاریخ سے پہلے زباں پیدا ہوئی
پوچھنا تاریخ سے پیدائشِ اردو کا حال
کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال

خوب، اور بہت خوب! تمدنوں کی جنگ و جدل کا فیصلہ کس طرح آناً فاناً ہو جاتا ہے۔ یک بیک آنکھیں کھل جاتی ہیں، کہ یہ کیسی نادانیاں تھیں! یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان کے بچے آپس میں الجھتے جھگڑتے، بزرگ خاندان کے پاس آتے ہیں (بزرگ سن و سال ہی کی لحاظ سے نہیں، فہم و دانش کے اعتبار سے بھی) اور وہ چٹکی بجاتے سارے جھگڑے چکا دیتا ہے لیکن ایسا جواب نہ محض شاعر کو سوجھ سکتا ہے، نہ اکیلے مؤرخ کے بس کی بات ہے۔ یہ وہی دے سکتا ہے، جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی ہو، اور مؤرخ بھی، اور ساتھ ہی نظر فلسفہ تاریخ اور لسانیات پر بھی رکھتا ہو۔

فرماتے ہیں، کہ بات یہ نہیں، کہ جہاں ادھر کوئی دو قومیں، بخت و اتفاق سے اکٹھی ہو گئیں، اور ادھر دونوں کی زبانوں سے مل جل کر ایک تیسری زبان وجود میں آ گئی، بلکہ تجربہ تاریخی کا نچوڑ اور حکمت لسانیات کا عطر یہ ہے کہ دو قوموں کے جغرافی اتصال کے ساتھ ساتھ ان کا ہم تمدن ہونا اور باہم مناسبت رکھنا بھی شرط ہے۔ جب کہیں جا کر تیسری اور نئی زبان پیدا ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس نظریہ اور کلیہ تک پہنچنے میں حکیم ناطق صاحب نے کام اپنے مدت العمر کے طبی تجربہ سے بھی لیا ہو۔ نر اور مادہ اگر مختلف النوع ہیں، تو ایسے جوڑے کو بار ور ہوتے آج تک کس نے دیکھا ہے؟ بہر حال آگے شعر سنیئے، اور لفظی مناسبتیں جو آ رہی ہیں، ان کا مزہ دل ہی دل میں لیتے جائیے۔

ہند تیرہ سو برس سے مسلموں کا ہے مقام
واعظوں، سوداگروں اور صوفیوں کا ہے قیام

اہل ہند، اہل عرب ہیں سب کے سب ابنائے سام
ہم نسب، ہم جنس، ہند و کیا کبھی ہوتے نہ رام

شاعری کا لطف اپنے ذوقِ سلیم پر چھوڑیے، تاریخی اعتبار سے وہ نثر کے حواشی پڑھتے جائیے، جو ہر بند کے مقابل گنجان لکھے ہوئے پورے پورے صفحہ پر شروع سے آخر تک درج ملیں گے۔ پہلے مصرعہ کے حاشیہ میں مسلمانوں کی آمدورفت ہندوستان میں پہلی صدی ہجری کے ۳۲ھ سے دکھائی گئی ہے اور ۲۴ھ سے لے کر ۸۶ھ تک ۱۲ مسلم فوجوں کے حملہ ہند کی فہرست دے دی گئی ہے اور تیسرے مصرع پر مصنف کا حاشیہ ہے کہ:-

- حام کی نسل سے اہلِ حبش اور ہندوستان کے قدیمی باشندے ہیں،
یافث کی اولاد سے ترکی اور منگولین (مغل) اور سام کی نسل سے عرب،
آرین، یوروپین اور ایرانی منشعب ہیں، لہٰذا ہندوستان کے شرفا
اور عربی و ایرانی ہم نسب ہیں۔ (ص ۸)

یہ حاشیہ محض مصنف کی تحقیق اور نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے نقل کر دیا گیا۔ یہ غرض نہیں کہ تعارف نگار مصنف کے ایک ایک فقرہ اور لفظ کو آیت و حدیث سمجھ رہا ہے، اچھا تو مصنف پہلے یہ کلیہ قائم کرتے ہیں کہ

ہوگا جن قوموں کی فطرت میں ازل سے اتحاد
جب کبھی وہ اک جگہ ہو جائیں گی آباد و شاد

دونوں قومیں ہم سخن ہم داستاں ہو جائیں گی
مل کے دونوں کی زبانیں یک زباں ہو جائیں گی

اور پھر ہند و عرب کے قدیم ترین تعلقات کو یوں بیان فرماتے ہیں

میل میں صبحِ عرب سے کب تھی شامِ ہند کم
مختلف ہونے پہ بھی ملتے ہیں زلف و رخ بہم

دلربائی کو زبانِ ہند پہنچے تا حرم

ہو گئے تھے ایک مِل کر کعبہ و بیت الصنم

تیسرے مصرعہ پر حاشیہ ہے کہ عرب کے بعض بُت ہندوستان سے گئے تھے، اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

صورت و معنی کی آپس میں ملاقاتیں ہوئیں

پہلے مستعمل ہوئے الفاظ پھر باتیں ہوئیں

فارسی عربی کے اسماء ہند میں داخل ہوئے

اور افعال و مصادر ہند کے شامل ہوئے

اور معاً اردو کی بنیاد پڑ گئی۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس ملاپ کی سب سے پہلی سرزمین، زمین پنجاب تھی ؎

بس کہ قصرِ ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا

اس لئے اردو کا اوّل مستقر پنجاب تھا

لیکن

جیسے خطِ رُخ کا بڑھے ابرو کی حد وصل چھوڑ کر

بڑھ چلا یوں نقشِ ثانی نقشِ اوّل چھوڑ کر

تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں

لائے قطب الدین اس کو دہلی شاداب میں

اب دہلی مرکز بنا۔ اور اس مرکز سے، ہر سر صوبہ میں۔

"ہر سپاہی اپنے ساتھ اردو کا لشکر لے گیا"

"سپاہی" اور "اردو" اور "لشکر" لفظی لطافت کی داد بار بار کہاں تک دی جائے خلاصہ یہ کہ ؎

. . . . نقش یوں بیٹھا اودھ میں نام اردو چل گیا

تھے بہادری نرم دل، خیرآں پہ قابو چل گیا حد یہ ہے بنگال پر بھی اس کا جادو چل گیا

آج اگر آئی ادھر تو کل اُدھر چلتی ہوئی
اُف یہ اتنی سی زبان اور اس قدر چلتی ہوئی

مسدس کی لفظی و معنوی خوبیوں کے اندازہ کے لئے اتنے اقتباسات بہت ہیں، ورنہ اب کیا
پیش لفظ میں ساری کتاب ہی نقل کر دی جائے، گو جی یہی چاہتا ہو۔

شاعری کی ساحری کا آپ دیکھ چکے۔ اب نثر کی فسوں کاری کا ایک نمونہ دیکھتے چلئے
مصنف کو لسانی نکتہ یہ بیان کرنا ہے، کہ ہندو مسلم اختلاط کے بعد جب اسما عربی و فارسی
زبانوں سے ہندوستان میں آنے لگے تو افعال و مصادر کہیں باہر سے نہیں آئے بلکہ اسی
سرزمین سے پیدا ہوئے۔ اس مسئلہ کو یوں تشبیہ و تمثیل کی زبان میں بیان کرتے ہیں کہ گویا
کسی علمی مسئلہ کی تحقیق نہیں ہو رہی ہے، بلکہ کوئی شفیق، مہربان ماں اپنے بچوں کو لوریاں سناتی
جاتی ہے:۔

"ان الفاظ و اسما نے صرف اپنی ہی ذات کے لئے ہندوستان کو
مستقل وطن نہیں بنایا، بلکہ یہاں انھوں نے اپنے بال بچے پیدا کئے،
اور ان کے ہزاروں خاندان ہمیشہ کے لئے اس ملک میں آباد ہو گئے۔
مثلاً تپ (فارسی اور سنسکرت میں بھی گرمی و بخار) ہند میں آئی۔ اس
سے "تپنا" مصدر پیدا ہوا، پھر اس کا متعدی تپانا بھی بن گیا، ان
دونوں مصدروں کا خاندان یعنی پوری گردان الگ رکھیے۔۔ "تپ"
سے ایک لڑکی پیدا ہوئی "تپک" اس سے "تپاک" عالم وجود میں آیا۔ یا
مثلاً "چارہ" ہند میں آکر متوطن ہوا، یہ پہلے تو عالی خاندان تھا "چارہ سازہ"
و "چارہ گر" اس کی نسل میں تھے۔ مگر چھوٹی قوموں کی صحبت میں چارہ

جانوروں کی غذاؤں میں شامل ہوا، یہاں تک کہ بیجر وا ہے اور چیپر کئے
پیدا ہونے لگے۔ بہت سے ایرانی النسل اور عربی النسب الفاظ و
اسماء نے ہندی بیچاروں سے بھائی چارہ پیدا کر لیا، اور ایسا میل جول
بڑھا لیا کہ دونوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا محال ہو گیا جیسے "بیلدار"
"پچکار" "سمجھدار" "سرچڑھ" "منہ زور" وغیرہ۔ ایک قسم ایسے الفاظ
کی ہے، جن کی صورت ویسی ہی رہی، مگر سیرت بدل گئی، جیسے۔ "مشکور"
"جذبات" "شائق" "محرم" وغیرہ (صفحہ ۱۷۔ ۱۸)

اندازہ کے لئے ایک نمونہ بالکل کافی ہے۔ مزید اقتباسات سے معاف ہی رکھا جائے، اس لئے
کہ تمہید کے حجم کو تصنیف کے مساوی بنانا ہرگز مقصود نہیں۔

البتہ بڑی ناانصافی ہوگی، اگر اصل تصنیف کے متن و حواشی (نظم و نثر) کے ساتھ فاضل
مصنف کے مبسوط مقدمہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ اکثر اہل قلم اپنا سارا زور اصل تصنیف پر صرف
کر دیتے ہیں، اور چند سطریں جیسی بھی ہوتی، مقدمہ کے نام سے لکھ، اس پر کسی طرح چیپک دیتے
ہیں۔ یہاں یہ صورت نہیں، مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف کی حیثیت و اہمیت رکھتا ہے۔ اور
جو مسائل زبان، ادب اور شاعری کے اس کے اندر آگئے ہیں، ان کے لحاظ سے اوّل سے
آخر تک پڑھنے کے قابل ہے۔

اردو غزل پر یہ اعتراض آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ "آخر اسمیں حزن و غم کے
مضامین لانے کی کیا ضرورت ہے اسے تو شگفتہ ہونا چاہیئے۔ جواب حضرت ناطق کی زبان سے
سنیئے، اور جواب کے بانکپن کی داد، دل اور زبان دونوں سے دیتے جائیے:۔
"یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ نوحہ و مرثیہ میں غم و ماتم کی

کیا شرط ہے۔ غزل کے معنی ہی یہی ہیں کہ "با معشوق سخن گفتن و درد دل را نظم کردن" اس کے خلاف وہی شخص ہو سکتا ہے جو لفظ کے معنی بدل دینے کی قدرت رکھتا ہو، اور اپنی عقلمندی سے یہ امید رکھتا ہو کہ اور لوگ اس کی تقلید کریں گے۔ اب اپا یہ امر کہ غزل کے ہر شعر میں اظہار غم و تمنائے مرگ بے شک مذموم ہے مگر غم سے کنارہ کشی اسی کا کام ہے، جو اپنی اصل حقیقت سے بے خبر ہے، عشق مجازی میں اظہار عشق عیب ہے، سوا اس کے کہ معشوق طوائف ہو یا لیڈر، ان دونوں مقامات پر نہ اظہار عشق عیب ہے، نہ دیر ہوتی ہے اور جب اظہار محبت فوراً ہو جائے تو جذبات کی دنیا میں آبادی بڑھنے نہیں پاتی، نہ غم کی حرارت دل کو پگھلا کر مرکز غم بناتی ہے۔ عشق میں ایک مدت گزرتی ہے، تو پیمانۂ صبر چھلکتا ہے اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں کا نظم کرنا اور ایک ہی بحر و قافیہ میں محدود رکھنا غزل ہے۔

اردو ادب کی ہر تاریخ میں ایک لازمی بحث اس کی آئے گی کہ اردو شعر و ادب کی ترقی میں دکن کا کیا مقام ہے، مصنف نے اس مبحث کو جس عنوان سے چھیڑا ہے، اس کے آغاز ہی سے اس کے انجام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

- کسی علم و فن کی وسعت اور چیز ہے، ترقی دوسری شے ہے۔ دکن میں اردو کی توسیع تو اظہر من الشمس ہے، مگر ترقی کے مدارج اس طرح معلوم ہوں گے کہ ہر ربع صدی کے شعرا کا تقابل کیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ تبدیلیاں کتنے "غیر ملکی قدیم" اور نامانوس وغیر فصیح الفاظ نکال کے اُن کی جگہ پر اردو الفاظ لائے گئے، کتنے الفاظ صرفی تبدیلی کر کے

فصیح بنائے گئے اور جس قدر زمانہ گذرتا گیا، اسی قدر زبان صاف ہوتی گئی؟ ان اصلاحات کی رفتار بالکل سست رہی سب ایک ہی لکیر کے فقیر رہے؟ ان لسانی اور صرفی و نحوی اصلاحوں کے علاوہ معانی و بیان میں ارتقا کے منازل برابر طے ہوتے رہے یا نہیں؟ مثلاً حقیقت کا نقش ثانی مجاز ہے تشبیہ کا دوسرا زینہ استعارہ ہے، صراحت کا لطیف جوہر کنایہ ہے، سادگی کے اسباب زینت، صنائع و بدائع ہیں انہیں مدارج کے طے کرنے کا نام تکمیل ادبی ہے، میں ہر زمانہ کے اشعار پیش کرتا ہوں اور مختصر شرح و تبصرہ بھی کئے دیتا ہوں، ناظرین خود ہی ترقی و تنزل کا اندازہ کرلیں گے۔"

اس کے آگے یہ مختصر شرح بیسیوں صفحات تک پھیلتی چلی گئی ہے، اور دکھنی شعرا کے کلام پر تبصرہ کے ساتھ ہی ساتھ زبان، ادب، عروض کے خدا معلوم کتنے نکتوں کو اپنے دامن میں سمیٹتی گئی ہے!

کوئی بشری تحقیق، لغزش و خطا سے محفوظ نہیں ہوسکتی لیکن بحیثیت مجموعی یہ عرض کردینا مبالغہ شاعرانہ سے پاک ہے کہ مسائل فن اور حسن بیان کی جامعیت کے لحاظ سے اردو میں کوئی دوسری کتاب اس موضوع پر اس تمہید نگار کے علم میں نہیں۔ اور اگر کالجوں کے اعلے اردو نصاب میں اسے جگہ ملجائے تو محض طلبہ کی نہیں اکثر اساتذہ کی بھی خوش نصیبی ہوگی!

مسلمان اور آزادی کی جنگ[1]

تقریب

مضامین اور مقالات، چھوٹے بڑے رسالوں کو چھوڑ دیجئے، ایک مستقل ضخیم کتاب "ہسٹری آف دی کانگریس" کے نام سے کانگریس کی طرف سے انگریزی میں شائع ہوچکی ہے ——— نام اس "ہسٹری آف دی کانگریس" کا اگر "ہسٹری آف ہندو نیشنلزم" ہوتا، تو یقیناً صحت سے قریب ہوتا ——— ہند قدیم کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کی تاریخ پر افسانوں کا گمان ہو، ہند جدید کی خصوصیت شاید یہ ٹھہرے، کہ اس کے افسانوں کے لئے تاریخ کا عنوان ہو!

ذہن میں کسی پرانے زمانہ کی فوج کے کوچ کا نقشہ جما لیجئے۔ آگے آگے سپہ سالار ہیں، پھر ترتیب وار رسالہ دار ہیں، جمعدار ہیں، کپتان ہیں، عام سپاہی ہیں، اور ساری فوج کے گزر جانے کے بعد، اس کے عقب میں شاگرد پیشہ، کچھ مزدور، حمال، کچھ بہشتی سقے کچھ باورچی رکابدار، کچھ نائی دھوبی وغیرہ، یہاں بھی آزادی وطن کی فوج ظفر موج کے اس مرقع میں آگے آگے فیلڈ مارشل گاندھی ہیں اور جنرل تک، کرنل نہرو اور میجر پٹیل، کپتان داس اور لفٹننٹ بوس، ان کی برق وار ریل کے ساتھ، پرچم لہرائے، تلواریں چمکاتے اور آخر میں، بہت آخر میں، دبے دبائے، کچھ شرمائے لجائے سے، محمد علی اور انصاری، اجمل خا

---

[1] از عبد الوحید خاں صاحب بی اے ایل ایل بی لاٹوش روڈ لکھنؤ تحریر۔ دسمبر ۱۹۳۸ء نظر ثانی اپریل ۱۹۴۳ء

اور ابوالکلام، گویا میدان میں اپنے پیروں آ نہیں رہے ہیں، یہ کہیئے کہ لائے جارہے ہیں! اور حسرت غریب کی تو سرے سے پرسش ہی نہیں! حالانکہ وہ بیچارہ جیل اسوقت گیا تھا، جب جیل تفریح گاہ نہیں، واقعی - قید فرنگ" تھی، اور اس نے قید باشقت کی کڑیاں اسوقت جھیلی تھیں، جب جیل کے اندر قیدیوں پر برقندازوں کے ڈنڈے برستے تھے، اور جیل کے باہر پھولوں کے ہار گلے میں نہیں ڈالے جاتے تھے، بلکہ اپنی ہی قوم طنز اور طعن سے کلیجہ چھلنی کر دیتی تھی!

ہندوستان سے ہزار ہا میل دور، انگلستان میں مستند اور ضخیم انسائکلوپیڈیا برٹانیکا تیار ہوتی ہے، جامعیت اور تحقیق کے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ - آخری (چودھویں) ایڈیشن کا جائزہ لے ڈالیئے، ہندو لیڈروں میں، صف اوّل ہی کے نہیں، صف دوم کے ایک ایک لیڈر کا ذکر پڑھ لیجیے - ضمناً نہیں، اکثر صورتوں میں مستقل آرٹیکل کے تحت - لیکن آپ کے محمد علیؒ کا تمغۂ افتخار، گمنامی، اور آپ کے محمود حسنؒ کا نشان امتیاز، بے نشانی! --- یہ ہے اس دور میں پروپیگنڈا کی سحر کاری!

اللہ اللہ! یہ کمالِ اخلاص! قبول خلق سے یہ استغنا! "طمع فاتحہ" سے یہ بے نیازی!

عشق من در پسِ من فاتحہ خوانم باقی ست

وقت کی پکار، مسلمانوں سے، مدت سے تھی، کہ

کچھ تو کہیئے کہ لوگ کہتے ہیں!

آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اور حالات کا تقاضا تھا، کہ مسلمان، انگریزی میں نہ سہی، کم از کم، اردو ہی میں،

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں!

کا ثبوت دیں۔

آواز آخر کار ایک نوجوان گر تجربہ شخص کے کان میں پڑی۔ قلم کی مشاقی اسے بلحینں حاصل نہ سہی فرض کا احساس، انتظار کی مہلت کہاں دیتا ہے۔ جیسی کچھ بھی بن پڑی "جنگ آزادی وطن میں مسلمانوں کی شرکت کی روداد لکھ ڈالی"۔ فرض کفایہ؟ اصطلاح فقہ میں اسے کہتے ہیں کہ اگر ایک ادا کر دے، تو سب کی طرف سے ادا ہو جاتے، اور کوئی نہ ادا کرے تو سب کے سب مجرم — سیاسیات و قومیات میں جو فرض سب کی طرف سے اتار دے اس کا کیا کہنا۔ اس کی سعی قابل مبارکباد، اس کی ہمت مستحق داد۔

مصنف کا قلم "آزادی کی جنگ" کا سرسری نقشہ اس سے قبل کھینچ چکا ہے۔ نقش ثانی یوں بھی نقش اول سے بہتر ہوتا ہے۔ پھر جب اس کا پشت پناہ مزید علم ہو، مزید تجربہ ہو، مزید مطالعہ ہو!

کتاب کا مسودہ پریس میں پہنچ چکا تھا، جب جا کر اس پر نظر کرنے کا موقع ملا، اور وہ بھی سرسری بجا ہے۔ ضرور نہیں کہ تائید ہر بیان کی، اور تحسین ہر عنوان کی کی جائے۔ صفحہ ۱۶۵ و ۱۶۶ جہاں ترکوں کی طرف سے حق وکالت ادا کیا گیا ہے، اس پر ساڑھے تیرہ سو برس والا اسلام حیران ہے کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے، لیکن بہرحال ایسے نشیب و فراز سے تو بڑے بڑے پختہ کار اہل قلم بھی نہیں بچ پاتے، ضرورت اس کی ہے کہ ہونہار مصنف کی حوصلہ افزائی دل کھول کر کی جائے، اور ان کی کوششوں کا یہ ثمر گھر گھر پھیلایا جائے!

نواب جمیل الشان[1]

دیباچہ

دُنیا نے نصیحت کو نصیحت کی راہ سے شاید کبھی سُنا ہی نہیں۔ یہ کڑمن جب جب حلق سے اُتاری گئی ہے تو شکر کی تہ یا مصری کے غلاف میں لپیٹ لپیٹ کر۔ اچھے اچھے اطباء حاذقین اور بڑے بڑے جید معالجین سب کو یہی کرنا پڑتا ہے۔ مثنوی معنوی کی حکائتیں منطق الطیر کی روایتیں، گلستان کی کہانیاں، اور بوستان کے قِصّے سب اسی کے نمونے گذرے ہیں، سنائیؒ اور عطارؒ، رومیؒ اور سعدیؒ سب کو عمل اسی پر کرنا پڑا ہے کہ "سر دلبران" کے لئے "حدیث دیگران" اختیار کی جائے اور

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

خود عارفانہ شاعری کیا ہے؟ اول سے لے کر آخر تک مجاز بیان کا طلسم! حافظؒ اور خسروؒ اور مغربیؒ اور عراقیؒ جس کسی کے بھی آستانہ پر جائیے، بادۂ عرفان و معرفت چھلکتا ہوا ملے گا تو اسی مجاز و استعارہ کے جام و ساغر میں اور حقیقت کی جھلک نظر آئے گی، تو انہیں شیشوں اور آئینوں کی وساطت سے!

---

[1] از عبدالرؤف عباسی صاحب ایڈیٹر روزنامہ حق (لکھنؤ)
تحریر مئی ۱۹۴۲ء نظر ثانی اپریل ۱۹۴۴ء

یہ بیسویں صدی کا زمانہ، عشق و فسق کا زمانہ، کھیل تماشہ کا زمانہ، ناول اور ڈرامہ کا زمانہ، تھیٹر اور سینما کا زمانہ ہے، رندوں کی محفل میں شیخ غریب کا کہیں گذر ہو جائے تو دستار بھی سلامت نہ رہنے پائے، یہاں تو حکمت یہی ہے کہ خود بھی مستوں کے سے نعرے لگائیے خود بھی جام اور گلاس ہاتھ میں لیجئے پیجئے اور پلائیے۔ ظرف وہی رہے، شیشہ و پیمانہ میں کوئی فرق نہ آنے پائے، البتہ حلق کے نیچے جس چیز کے گھونٹ اتریں وہ شراب طہور ہو نہ کہ افشردۂ انگور۔ جمیل الشان کے خوش نصیب مصنف نے اس نکتہ کو پالیا۔ جمیل الشان کہنے کو ایک ناول ہے، اور کہنے کو کیا معنے، واقع میں ناول ہی ہے جس و عشق کا قصہ، ایک بیسوا سے عاشقی، باہمی رقابتیں، پولیس والوں کی گھاتیں، شاطروں کی چالیں، ہجر کی بے تابیاں، مطلوبوں کی کارستانیاں، بگڑے ہوئے نوابی کارخانے، شاہی خاندان کی آن بان، غرض ناول کی دلچسپی کے جتنے سامان ہوتے ہیں، سبھی اکٹھے ہیں۔ پھر زبان و حسن بیان، سبحان اللہ، جہاں لکھنؤ کی زبان دکھائی ہے، وہاں خالص لکھنوی، جہاں بدایوں کی بولی بول چلے ہیں، وہاں پورے بدایونی۔ حیرت اس پر ہونے لگتی کہ کاکوروی کو لکھنؤ کی زبان پر اتنی قدرت حاصل کیونکر ہو گئی، کہ معاً یاد پڑ گیا کہ سجاد حسین (اودھ پنچ والے) اور مولوی حاجی نور الحسن (نور اللغات والے) اور ڈپٹی امیر احمد علوی آخر کس خطہ کے رہنے والے ہیں۔

پلاٹ اتنا دلچسپ کہ ایک واقعہ شروع کر دینے کے بعد بغیر ختم کئے رکنا دشوار۔ قصہ کے افراد مردہ اور مفروضہ نہیں، جیتے جاگتے حقیقی، واقعی زندوں سے بڑھ کر زندہ۔ بار بار دھوکا یہ ہوتا ہے کہ لکھی ہوئی کتاب کے اوراق سامنے نہیں، بلکہ اصل قصہ ان آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا گذر رہا ہے! فن (آرٹ) کے لحاظ سے بجنسہٖ، دو ایک مقام پر ذرا سی جھول، لیکن قصہ کی دلآویزی اتنی بڑھی ہوئی کہ پڑھنے والے کو رک کر اور غور و تامل کرنے کی مہلت ہی

کب ملتی ہے ؟

آخر تک پہنچتے پہنچتے بدکاری و ہوسناکی کی بدانجامی، اور نیکی و پارسائی کی فتح، از خود بغیر تبلائے اور سمجھائے آئینہ ہوجاتی ہے، اور مصنف کے حق میں دل سے دعائیں نکلنے لگتی ہیں۔ مصاحبوں اور خصوصاً امیر صاحب عینک فروش کا چربہ خوب اُتارا گیا ہے، اور نواب جمیل الشان، خان بہادر میراں بخش بدایونی، اور نواب بنیاد حسین، تینوں کی تصویریں اپنی اپنی جگہ پر مکمل ہیں۔ صرف ہیروئن کی تصویر کشی میں کہیں کہیں مبالغہ کا قلم چل گیا ہے۔ آخر کتاب میں جو دو خطوط اس کی طرف سے لکھے ہیں، وہ ساری کتاب کا نچوڑ ہیں، حد درجہ مؤثر اور بلندئ خیالات کے لحاظ سے لاجواب۔ کتاب بھر میں یہی دو خط ہوتے اور کچھ نہ ہوتا، جب بھی بہت کچھ تھا۔ اب دعا صرف اتنی ہے کہ حسنِ قبول تصنیف اور مصنف دونوں کو نصیب ہو — کتاب کو خلق میں اور کتاب نویس کو خالق کے ہاں!

مداوا[۱]

پیش لفظ

ترقی تو ادب میں ہوتی ہی تھی، اور حرکت جب ہر چیز میں ہے، تو ظاہر ہے کہ شاعری کیسے ساکن وجامد رہ سکتی تھی، لیکن بے راہ روی کا نام ترقی رکھ دینا، اور بے قیدی کو آزادی سے تعبیر کرنے لگنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کے جسم پر آماس ہو آئے، اور ہم اسے دیکھ کر کہیں کہ دیکھو یہ کیسا موٹا تازہ، تیار و تنومند ہے —— اور نثر جیسا حلیم و شائستہ جانور، بھی جب شتر بے مہار بن جاتا ہے، تو اس کے شتر غمزوں سے خدا کی پناہ !

پرانی شاعری اور پرانا ادب کوئی وحی آسمانی نہیں، کہ اس کا کوئی نقطہ نہ بدل سکے، کوئی شوشہ نہ ٹل سکے۔ خیالات بدلیں گے، اسلوب بیان بدلیں گے، اور بدلتے رہتے ہیں۔ ولی کی شاعری غالب کی شاعری نہیں، اور فسانۂ عجائب کی زبان امراؤ جان کی زبان نہیں، چراغ سے چراغ جلتا ہی آتا ہے، اور شاخ سے شاخ پھوٹتی ہی رہتی ہے، بچہ جوان ہوتا ہے، اور جوان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے، قدرت کا دستور ہی یہ ہے، لیکن کوئی زبردستی کھینچ تان کر اگر بچہ کو جوان اور جوان کو بوڑھا بنانے لگے، تو یہ ارتقاء طبعی تھوڑا ہی، یہ فطرت سے کشتی اور زور آزمائی ہوئی، جدت اگر محض جدت کی خاطر ہے، تو اس کا نام ندرت نہیں بدعت ہے، شگفتگی

---

[۱] کتاب مداوا مؤلفہ غلام احمد صاحب فرقت بی اے کاکوروی، طبع اول

نہیں غرابت ہے۔

"ترقی پسند" ادیبوں کی فہرست میں نام منشی پریم چند آنجہانی اور قاضی عبدالغفار صاحب (مدیر "پیام" دکن) اور یہاں تک کہ "باباے اردو" ڈاکٹر عبدالحق کے بھی لیے گئے ہیں۔ اگر ترقی پسندی کا یہی معیار ہے تو پھر ہم سب ترقی پسند ہی ہیں اور اس ترقی پسندی سے انکار کس کافر کو ہو سکتا ہے؟ لیکن کاش اس دعوی میں خلوص ہوتا! دریا کے مقابلہ میں چند قطرے خرمن کے سامنے چند دانے ہستی ہی کیا رکھتے ہیں۔ "ترقی پسند" ادب کے نام سے جو سیلاب عظیم نثر و نظم دونوں میں بد مذاقیوں، عریانیوں اور گندہ بیانیوں کا چل پڑا ہے، اس نے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پرانے ادب کے بڑے سے بڑے فحش نویس اور بڑے سے بڑے ہزل گو کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، اور نام از سر نو جان صاحب کا، بلکہ بعض حیثیتوں سے میاں چرکین کا چمکا دیا ہے! انا للہ ———— بدعقیدگی اور اخلاقی بے ہودگی کو چھوڑیئے آخر مذاق سلیم اور تمیز داری بھی تو دنیائے ادب میں ایک چیز ہے۔ ان ظالم لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کے صفحات میں تو آنکھیں اس کو بھی ترستی رہ جاتی ہیں ؎

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت اگر ملے

جی خوش ہوا کہ ملک میں اس طوفان بے تمیزی (طوفان کو آپ مجاز کہہ لیجیے لیکن بے تمیزی کو حقیقت کے بجائے مجاز سمجھنا ظلم ہوگا) کے خلاف تحریک پیدا ہوئی ہے، اور جا بجا مزاحی اور سنجیدہ دونوں رنگ میں کوششیں رد و اصلاح کی شروع ہو گئی ہیں۔ انہیں کوششوں کی ایک عملی تشکل یہ پیش نظر کتاب بھی ہے۔ کاکوری کے جواں عمر و جواں ہمت فرقت بی۔ اے، کے قلم سے اس کے مسودہ کے دو چار صفحے مجھے بھی دکھلائے گئے

یقین ہے کہ ساری کتاب اسی طرز و انداز کی ہوگی! الکمنو، زبان و ادب کی خدمت
و اصلاح کے سلسلہ میں ممتاز شروع سے چلا آرہا ہے، حق تھا کہ ایسی اصلاحی کتاب
کی اشاعت بھی یہیں کی کسی اشاعت گاہ سے ہو۔

(۳)
چند تبصرے

مغرب کی عقل و ذہانت کا منتہائے کمال یہ ہے، کہ ہر جھوٹ کو سچ کے لباس میں پیش کیا جائے، مشرق کی نازک خیالیوں کی بلند پروازی یہ تھی کہ سچائیوں کو جھوٹ کے پردہ میں بیان کیا جائے۔ لندن کی وقائع نگاری کا ظاہر سچ ہے، اور باطن فریب، دہلی کی داستان گوئی کا باطن سچ تھا، اور ظاہر تصنع۔ ٹائمس اور مارننگ پوسٹ ہر بیت کو ہست کر دکھانے ہر ہستی کو سانپ بنا دینے میں طاق ہیں۔ الف لیلہ اور انوار سہیلی والے حقیقتوں میں افسانہ کا رنگ بھر دینے میں یکتا تھے۔ ولہاؤسن اور مارگولیتھ، تاریخ اور سیرت نگاری کا نام لے لے کر وہ سارے "واقعات" لکھ ڈالتے ہیں، جن کا "وقوع" نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا، اور نہ کبھی کان نے سنا تھا۔ خواجہ حافظؒ اور امیر خسروؒ شاعری کی دنیا میں، گل و بلبل کی زبان سے شراب و کباب کی اصطلاحوں میں حکمت و موعظت، سچائیوں اور حقیقتوں کا دریا بہا چلے ہیں! اپنا اپنا مذاق ہے، اور اپنا اپنا کمال فن۔ اب اس کا فیصلہ کون کرے، اور کیوں کرنے لگے، کہ دونوں کی افسانہ گوئی میں بلند تر کمال اور پاکیزہ تر مذاق کس کا ہے!

افسانہ گوئی کی تعریف، مشرق میں یہی سمجھی گئی، کہ ظاہر جھوٹ ہو اور باطن سچ۔ اسم فرضی ہو، لیکن مسمّٰی واقعی۔ گلاس شراب کے ہوں، لیکن گلاس کے اندر بجائے شیرۂ انگور

---

[۱] رسالہ الناظر (لکھنؤ) ۱۹۳۰ء

کے آب انار بازبان "دشنہ و خنجر" کے آلۂ نظر پر کھلے، لیکن دل تازو غمزہ کے معنی میں لگا رہے! گلستان کی حکایتوں کی "تاریخی" تحقیقات کرنے بیٹھیے اور اس کھوج میں پڑ جائیے، کہ فلاں حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے، وہ کس ملک کا تھا، کس سنہ میں تخت نشین ہوا، کس تاریخ کو وفات پائی، کے شادیاں کیں، کتنی اولاد چھوڑی، تو شاید ایک حکایت بھی سچی نہ نکلے، لیکن اگر پوست کو چھوڑ کر مغز کو دیکھیے، نقاب کے رنگ میں اُلجھنے کے بجائے چہرہ کے خط و خال پر نظر جمائیے، تو ایک ایک لفظ، سچ اور سچائی میں ڈوبا ہوا ملے گا۔ صاحب مثنوی معنوی نے نہ صرف اس علم پر عمل کر کے دکھا دیا، بلکہ اس کا فلسفہ بھی بیان فرما دیا کہ "سِرِّ دلبراں" کچھ "حدیث دیگراں" ہی میں خوش تر و خوشگوار تر ہوتا ہے! اور اُستاد غالب اپنی زبان میں فرماتے ہیں۔ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

سُنتے ہیں، قدیم صوفیہ میں ایک فرقہ "ملامتیہ" تھا۔ ظاہر خراب اور باطن آراستہ، وضع رندانہ اور صورت مستانہ، لیکن اعمال زاہدانہ اور سیرت فقیرانہ۔ آج کل کے بعض مسخروں پر اُن قدیم ملامتیوں کو قیاس نہ کیجیے۔ یہ نیا سوانگ، طریق ملامت کے ساتھ تمسخر ہے۔

اُن ملامتیوں

میں سے ایک ایک

تھا دل پریشیدہ اور کا سر کھلا

"علیگڑھ" بھی ایک چھوٹے پیمانہ پر "عالم صغیر" ہے، یعنی "عالم کبیر" میں جو کچھ بھی ہے، سب کا نمونہ سید کی بسائی ہوئی اس نگری کے اندر موجود۔ کم از کم عالم اسلام کا تو اسے ایک زندہ عجائب خانہ

(میوزیم) سمجھ لیجیے - ہر نوع، ہر قماش، ہر نمونہ انسانیت کو اس ننھی سی دُنیا کے اندر آ کر دیکھ لیجیے کیسے ممکن تھا، کہ طریق ملاقیہ کے نمائندوں سے سرزمین محروم رہتی!

آئیے، آج آپ سے بیسویں صدی کے ایک "اپ ٹوڈیٹ" (Up To date) علیگڑھی ملاشی کا تعارف کرایا جائے۔ ظفر عمر کا نام آپ نے سنا ہے؟ اسی نیچر گزشتہ کا اولڈ بوائے، اور "نیکنام" سرکار کے "نیک نام ترین" محکمہ پولیس کا ایک اعلیٰ افسر، کی وضع قوم کی وضع سے الگ، اس کی کوٹھی مسجد کے حجروں سے دُور، اس کی کچہری، خانقاہ کے حوض اور مدرسے کے قال اقوال سے کہیں پرے - لیکن خود قوم و ملت، خانقاہ و مسجد، اس کے دل سے دُور نہیں دل کے باہر بھی نہیں، دل کے اندر! خاکی وردی اور کارتوس کی پیٹی، سفید ہلمٹ اور کمر سے لٹکتی ہوئی تلوار، سب نے دیکھی - لیکن "رنگ جامہ" سے نگاہ ہٹا کر "اندازِ قد" بھی کسی نے نہ پہچانا؟ نقاب الٹ کر، چہرہ کے رنگ رُوپ کو بھی کسی نے دیکھا؟ اور اگر کسی نے دیکھا ہو بھی تو زبان پر لانے کی اجازت کسے؟ ـــــ اس ناتمام داستان کو یہیں تمام ہو جانے دیجیے ـــــ مستقبل اسلام اور چوروں کا کلب، نیلی چھتری اور بہرام کی گرفتاری سے تو یقین ہے کہ آپ بھی بے خبر نہ ہوں گے! "نیلی چھتری" کا وجود، افسانہ ہوگا - لیکن جس افسانہ کا نام نیلی چھتری ہے، وہ تو افسانہ نہ رہا، ایک مستقل حقیقت بن گیا! جس مٹی اور پتھر کے کھنڈر کا نام نیلی چھتری ہے، وہاں کوئی خزانہ مدفون ہو یا نہ ہو، لیکن جو نیلی چھتری، کاغذ اور قلم اور روشنائی کی مدد سے تیار ہوئی، وہ تو یقیناً اپنے ہمراہ دولت لے کر آئی - اور بہرام اور مسعود اب نرے متخیلہ کے بے جان مخلوق نہ رہے، بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے، ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے، راجہ اندر اور تاج الملوک، لال دیو، اور سبز پری، امیر حمزہ اور عمر عیار کی طرح، اچھے خاصے، گوشت و پوست کے بنے ہوئے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے، جانے پہچانے

ہوئے جاندار انسان بن گئے۔

ناول پڑھنے کی اب نہ فرصت نہ ضرورت، نہ شوق نہ ہمت، خود اپنے افسانۂ حیات کے مطالعہ اور حسرتِ مطالعہ سے کہاں مہلت، اور کیسے دماغ کہ گرمی ہوئی کہانیوں اور جھوٹے قصوں کے سیر و تماشہ کا وقت نکالا جائے۔ اور خود اپنا ہستی کا شرحِ کیا کم ہے کہ قیس کی نامرادیوں اور فرہاد کی حسرت نصیبیوں کا رونا بیٹھ کر رویا جائے؟ اکبر علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں

عبرت زدہ را کار بہ آزردگاں نیست

ناولوں اور افسانوں کا مطالعہ عرصہ ہوا چھوٹ چکا۔ سرشار و شرر، جارج ایلیٹ اور میری کوریلی کی گلکاریوں سے دل بہلاؤ کا مشغلہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا ع

ما خار رسیدگان غلیم پیغام خوش از دیار ما نیست

لیکن ایک معتبر و ثقہ دوست نے الف غیب کی طرح آ کر، سرگوشی کی کہ نیلی چھتری کے خزانہ کے مالک کی ہمت لب اور یہ بھی ہے، اور آپ کی اس نے علاوہ مالک کے لال کنشور کی چھپن کروڑ کی دولت پر دھاوا بول دیا ہے! جی نہ مانا، تو ہے ٹی، اور جس روز نامی پریس، لکھنؤ سے دو سو اور سو صفحہ کی چھوٹی سی خوبصورت و خوشنما کتاب کا پارسل آیا، اسی وقت شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ لال کنشور! آپ چونکیں گے، اور منہ بنا کر فرمائیں گے، کہ نام تو عجب قسم کا نامانوس اور غیر شاعرانہ ہے۔ بجا ارشاد ہوا۔ لیکن یہ تو فرمائیے، کہ آج سے چند سال قبل نیلی چھتری کا نام کچھ کم نامانوس اور کچھ کم عجیب غریب تھا؟ اور پھر عمرو عیار کی زنبیل اور سودیار قہقہہ، اور چشمۂ آب حیات اور گل بکاؤلی کو آپ کیوں بھولے جاتے ہیں؟ کیا ان ناموں سے دنیا روز ازل ہی سے مانوس چلی آ رہی ہے؟

نیلی چھتری اگر آپ پڑھ چکے ہیں، اور بہرام و مسعود کے کارناموں سے واقف ہو چکے ہیں، تو اس جدید داستان کو آسانی سے سمجھ لیں گے۔ بہرام اب مشہور و معروف مجرم نہیں، بلکہ علیگڈھ کے مشہور "کھلنڈرے" مسعود کے ہمراہ، اب مہراب جنگ کے نام سے دلّی میں ایک باعزت شہری کی حیثیت سے سکونت پذیر ہو گیا ہے ـــــ یہ راز نہیں کھلتا، کہ اس کی سکونت کے لئے مصنف نے بجائے دلّی کے مشہور و معروف محلہ کوچہ چیلان کے ایک دوسرے مشہور محلہ بلیماران کا انتخاب کیوں کیا ـــــ اب وہ خلق خدا کا دشمن نہیں، بلکہ اس کا ایک مخاص خادم ہے، اور اب اس کی حیرت انگیز ریاست (بہ زبان اخبارات پنجاب "مستی خیز") ذہانت، جرم کرنے کے بجائے، مجرموں کو سزا دینے اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے وقف ہے اس کی مختصر تنظیم کا نام "خدائی فوجداروں" کی جماعت پڑ گیا ہے، اور اس کی بے جگری، جانبازی و سرفروشی سے بڑے بڑے پرانے اور بیباک مجرم تھرانے اور پناہ مانگنے لگے ہیں۔ مہراب جنگ کے خاص ملنے والوں میں قابل ذکر نام ڈاکٹر رحمٰن اور انسپکٹر شوکت حسین کے ہیں ـــــ لال بجھکڑ اگر نامانوس نام تھا، تو یہ نام تو یقیناً آپ کے لئے نامانوس نہ ہونے چاہیئے ـــــ ان "خدائی فوجداروں" کے ٹھیک مقابل اسی شہر دلّی میں چھپے ہوئے بدمعاشوں اور انتہا درجہ کے چالاک اور بے درد مجرموں کا بھی ایک نہایت مضبوط جتھا قائم ہے، جس کے سرغنہ و سردار دلّی کے ایک مشہور گیسو دراز "اشتہاری صوفی" (ص ۱۱۴ و ص ۱۴۹ و ص ۲۲۵) مرزا بلگرامی ہیں، جن کی فلمی تصویر کو دیکھ دیکھ بے اختیار یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ـــــ

اے کہ با سلسلۂ زلف دراز آمدۂ
چشم بد دور کہ خوش شعبدہ باز آمدۂ

خدائی فوجداروں کا جو "خلق اللہ" کی حفاظت کرتے رہتے ہیں، اور ایسے بدمعاشوں کو جنہیں

پولیس بھی ایسے کیفر کردار کو نہیں پہنچا سکتی خود ہی معقول سزا بھی دے دیتے ہیں" (ص۱۷)
مقابلہ انہیں بزرگوار سے آپڑا ہے اور ساری کتاب نور و ظلمت جرم و تعزیر جرم کی
کشمکش کی نذر ہے۔ کتاب کے مرقع میں سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ سبق آموز
تصویر مرزا بلگرامی کی ہے۔ آن کی تفصیلی زیارت اور آن کے ہتھکنڈوں سے پوری واقفیت
کا اگر شوق ہو، تو ڈیڑھ روپیہ میں کتاب، نامی پریس، لکھنؤ سے حاصل کیجئے لیکن۔ مرزا کی
اجمالی شکل و صورت، اور اس قابل زیارت چہرہ کے نمایاں خط و خال اگر آپ اس ریویو
کے آئینہ ہی میں دیکھ لینا چاہتے ہیں، تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ مرزا بلگرامی صاحب کوئی
خدانخواستہ معمولی اور ادنے قسم کے مجرم نہیں، جن سے ملتے ہوئے آپ شرمائیں۔ کیا عجب
کہ آن سے نیاز حاصل ہو جانا آپ اپنے لئے باعث شرف و عزت خیال فرمائیں، یہ ذات
شریف مریدوں کی ایک بڑی جماعت کے پیر و مرشد ہیں، اپنے بعض مریدوں اور معتقدوں
کی جاں نثاری پر بجا طور پر فخر رکھتے ہیں۔ ایک زنانہ اسکول کھول رکھا ہے، بہت سے رسالوں
کے مالک ہیں پریس ہے، کتابوں کا کاروبار ہے۔ دفتر عین شہر دہلی کے وسط میں ہے۔
لیکن یہ حضرت رہتے دہلی کے قریب ہی کسی ایسے مقام پر ہیں، جہاں ایک مشہور درگاہ واقع
ہے (ص۶) دفتر اور دفتر کی عالی شان عمارت دہلی بھر میں مشہور ہے (ص۲۱) یہ بزرگ اپنے
کارناموں سے حسن بن صباح کی یاد اس بیسویں صدی میں تازہ رکھے ہوئے ہیں (ص۲۰ و ۲۱
نیز ص۶۲ و ۶۳)

باوجود قانون اور حکومت کی سخت گیری کے، پایہ تخت دہلی میں بیٹھے ہوئے اپنی
دغا بازی اور عیاری کے زور سے خلقت کو مسحور کئے ہوئے ہیں۔ (ص۲۱)
"مرزا بلگرامی" کے سر پر کاکلیں ہیں (ص۳۰) اور زینت و آرائش کے وقت ان

بلمی کا کلوں میں خوب نیل لگا ہوا (صـ۱۷۹) قوالی اور نعتیہ غزلیں سنتے رہتے ہیں - (صـ۲۴) خاص چیز اِن کے "روزنامچے" ہیں، جو اُن کے اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، اور جن میں اُن کے قلم سے "بلگرامی بانو" کی تعریف و توصیف برابر نکلتی رہتی ہے - (صـ۱۶۰) قومی اور مذہبی معاملات میں خاص دلچسپی لیتے رہتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر "تبلیغ" کے سوانگ میں سرگرم ہیں، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مہراب جنگ، جب ایک مشہور قومی لیڈر کی طرح مشتعل ہو کر، "مرزا بلگرامی" کو مخاطب کرتا ہے، تو کہتا ہے، کہ اے "اشتہاری صوفی اور تبلیغ کے جھوٹے سردار" (صـ۱۱۴) اور مسعود کی زبان میں، اس "اشتہاری صوفی اور دغا باز پیر" (صـ۱۶۷) کا جامع اور مختصر تعارف یہ ہے کہ

"مرزا بلگرامی، ایک تاریخی خانقاہ کا مجاور، تبلیغ و اشاعت مذہب کے کاموں میں پیش پیش کئی ایک اخباروں کا ایڈیٹر، اور مدرسوں کا مہتمم ہونے کے علاوہ پیری، مریدی کے سلسلہ میں بھی مشہور (صـ۱۷۵)

اِن بزرگوار کو اپنے اثر و اقتدار، اور اپنے رسالوں اور کتابوں کی کثرتِ اشاعت پر ناز بھی ہے ایک جگہ اپنی زبان سے فرماتے ہیں :-

"میرا کاروبار تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے - میرے مرید ہر جگہ بکثرت ہیں - اور میری کتابیں اور رسالے تمام ملک میں شائع ہوتے رہیں - میری اخباری نکتہ چینی سے بڑے بڑے والیان ملک کانپتے ہیں - اور اُن کے درباروں میں کھلبلی پڑ جاتی ہے، جہاں جاتا ہوں، عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہوں" (صـ۱۷۹)

اور ساتھ ہی یہ کھلا ہوا راز بھی زبان پر آجاتا ہے، کہ

"دنیا کے لئے میں نا حد خشک ہوں، لیکن آپ یقین کریں کہ باوجود ان سب باتوں کے میرا دل آپ کی صورت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ آپ کی آواز کان میں جاتی ہے، تو میں مسرور ہوتا ہوں، خدا نے آپ کو حسین بنایا ہے، اور علم موسیقی میں آپ استعداد مہارت رکھتی ہیں" (ص ۱۷۹-۱۸۰)

فرمایئے۔ مرزا ملگرائی کی دلچسپ شخصیت سے اب بھی آپ کو دلچسپی پیدا ہوئی یا نہیں؟ لیکن ذرا ٹھہریئے، بعض دلچسپ ترخصوصیات ابھی ظاہر ہونا باقی ہیں۔ آپ لاکھ ذہین سہی لیکن یہاں تک تو آپ کا ذہن بھی نہ پہنچا ہوگا —— اور کیسے پہنچتا؟ نہ آپ محکمۂ پولیس کے کوئی اعلے افسر، نہ کوئی پیشہ ور سراغرساں —— کہ یہ جو اطراف ملک میں بیسیوں ڈاکے، کشت و خون اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، یہ

"انہی حضرت کی بدولت ہوتے ہیں، اور مختلف طریقوں سے روپیہ اس کے ذاتی خزانہ میں جمع ہوتا رہتا ہے، دہلی کے کئی قتل جن کا آج تک پتہ نہ چلا ان میں مرزا کے گرگوں کی شرکت تھی، کتنے ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کا دیوالہ نکل گیا، وہ بھی مرزا کی بدولت" (ص ۲۹)

یہ ذات شریف جب آخری بار مسعود کی گرفت میں آتے ہیں، اور اپنے کیفر کردار تک پہنچنے کے قریب ہوتے ہیں، اسوقت وہ علیگڈھ کا مشہور کھلنڈرا، انہیں مخاطب کر کے ان کی فرد جرم یوں سناتا ہے:۔

"لال کنور پر قبضہ کرنے اور دولتمند بننے کا جنون تم پر سوار تھا، تم موجودہ زمانہ کے حسن بن صباح ہونا چاہتے تھے، ہندو مسلمانوں کو تم نے آپس میں لڑایا، پیری مریدی کے گورکھ دھندے سے ہزاروں آدمیوں کو گمراہ

کیا، مدتوں پولیس کی آنکھ میں خاک جھونکی، قتل پر قتل کیے اور
. . . اور خلقت کو لوٹا" (صفحہ ۲۳)

آپ کہتے ہوں گے، کہ ایسا چھٹا ہوا مجرم تو پولیس کی نظر میں خوب چڑھا ہوا ہوگا، اور ملک کے امن و نظم کے دعویدار، ذمہ دار حکام سرکار تو اسے ملک کا سب سے بڑا دشمن ہی سمجھتے ہوں گے لیکن توبہ کیجیے، آپکا دماغ بھلا مرزا بلگرامی کی ذہانت کو کہاں پا سکتا ہے؟

"اس خیال سے حکام وقت کو اس کی مجرمانہ حرکات کی جانب شبہ نہ ہو، وہ وقتاً فوقتاً اپنے اثر و ذہانت کو اُن کی خدمت میں پوشیدہ طور پر صرف کرتا تھا" (صفحہ ۲۹)

والے کیا پتہ لگاتے، طلسم ٹوٹنے پر، ایک انسپکٹر صاحب خود دنگ رہ جاتے ہیں، اور اُن کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا، کہ

"مرزا بلگرامی جو عوام میں اس قدر عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور حکام دہلی جس کے اثر سے اکثر کام لیتے ہیں، ایسا خطرناک مجرم ہے!" (صفحہ ۸۸)

ایک مرتبہ جب ایک انسپکٹر صاحب ایک اہم تلاشی کے لئے بے وقت مرزا صاحب کے دفتر میں داخل ہو گئے ہیں، تو مرزا صاحب فرماتے کیا ہیں۔

"آپ ہیں انسپکٹر صاحب! خیریت تو ہے جو ایسے اوقت تکلیف فرمائی؟ . . . کیا ڈپٹی کمشنر یا کپتان صاحب نے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں مجھ سے مشورہ کرنے کے لئے آپ کو بھیجا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ میں گورنمنٹ کی خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتا ہوں" (صفحہ ۱۶۲/۱۶۳)

یہ "جاسوسی" کوئی مالی منفعت کی چیز نہیں، اس کا اصلی فلسفہ یہ ہے، کہ اس ذریعہ سے مجرمانہ سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہتا ہے، ایک شریک کار اور راز دار تخلیہ میں دریافت کرتے ہیں، کہ آخر جاسوسی تو کہیں نہیں گئی، اس کا کیا حال ہے؟ (مشتاق) تو جواب ملتا ہے، کہ

"اس کی قدر بھی اسی وقت تک تھی، جب تک میری اخباری اپیل کا نتیا تھی۔ پھر اس میں رکھا ہی کیا ہے، وہ تو محض دوسری سرگرمیوں کی پردہ پوشی اور رفع شر کے خیال سے مفید تھی" (ص ۲۸)

ان مرزا بگرامی سے بھی کہیں بڑھ کر پُراسرار "ان کے سانپ" ہیں، جو ہر مخالف کو ڈس کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ دہلی بنک کا ایک بابو تھا، اس بیچارہ کی جو شامت آئی، تو اسے یہ پتہ لگ گیا کہ بنک میں مرزا صاحب نے تبلیغ کے نام سے جو روپیہ جمع کرایا ہے، اسے اپنی ذات پر صرف فرما رہے ہیں، اور اس نے دھمکی دی، کہ جلسۂ تبلیغ میں یہ راز فاش کر دیا جائیگا بس پھر کیا تھا، اس بابو غریب کا خاتمہ تھا (ص ۸۹) ایک اور اجل گرفتہ احمد جان صاحب تھے جو مرزا کے شریک کار رہ کر پنجاب اور سندھ سے مدرسہ صوفیہ کے لئے بہت سا چندہ جمع کر لاتے تھے۔ روپے کی تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ ان کے پاس مرزا کے کچھ خطوط تھے، جن کے شائع کر دینے کی انہوں نے دھمکی دی۔ شام کے وقت پارک میں گئے، اگر واپس نہ آنے پائے تھے کہ راستہ میں سانپ نے ڈس لیا، اور جب پولیس آئی تو خطوط جیب سے غائب ہو چکے تھے (ایضاً)

سب سے زیادہ پُرلطف مرزا صاحب کا اپنے ان کارناموں سے تجاہل ہے۔ پولیس کے ایک افسر صاحب مرزا صاحب کو آگاہ کرتے ہیں، کہ آپ کے سانپ کا راز، اب راز نہیں رہا ہے، تو معصومیت اور بھولے پن کی کس دلفریب ادا سے مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

"سانپ کیسا؟ کیا میں کوئی سپیرا ہوں؟ صاف بتائیے، معموں میں باتیں

نہ کیجئے ، (ص ۱۶۶)

"سانپ کیسا ، کیا میں کوئی سپیرا ہوں ؟" کیا خوب ارشاد ہوا ہے ۔ جتنی بار جی

چاہے ، دہرا دہرا کر اس فقرہ کا مزہ لیتے رہیئے ۔

آپ کہیں گے ، کہ "مرزا بلگرامی" کو آخر تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی

کی ضرورت ہی کیا پیش آئی ۔ مزے سے اپنے "تبلیغ" کے کاموں میں لگے رہتے ۔ اور گھر بیٹھے

معقول آمدنی کماتے رہتے ، لیکن اُن کی بدقسمتی کو کیا کیجیے ، کہ دہلی ہی میں ایک مولوی صورت"

اور "نیچری سیرت" ایڈیٹر نے اس ہوائی قلعہ کی بنیادیں تک اپنی گرلہ باری سے مسمار کر دی تھیں

ایک راز دار خلوت میں پوچھتے ہیں ، کہ یہ تو فرمائیے ، اب تبلیغ و اشاعت مذہب کے گورکھ

دھندے کا کیا حال ہے ؟ جواب میں ٹھیک کوسنے والوں کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے :۔

"فی الحال اس کی بھی کساد بازاری ہے ، خدا سمجھے اخبار اتیس کے مولوی نما

کرسٹان صفت ایڈیٹر کو ، اس نے ایسا بھانڈا پھوڑا ہے ، کہ اب وہ

چشمہ بھی خشک ہوتا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے

کے خون کے اب ایسے پیاسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے ۔ باوجود کوشش

کے نہ کہیں بلوے ہوتے ہیں ۔ نہ مقدمہ بازی" (ص ۲۸)

اتنی جلوہ آرائیوں کے بعد کیا اب بھی مرزا بلگرامی کی سیرت اور صورت آپ کے لئے کوئی راز رہی ؟

اور کیا اب بھی آپ کو یہ گلہ باقی رہے گا ، کہ ریویو نگار نے مرزا بلگرامی کے چہرہ سے نقاب

کے گوشے اُلٹنے میں بخل سے کام لیا ہے ؟

مصنف نے غایت ستم ظریفی یا فرطِ انکسار سے کام لے کر اپنا رستم داستان

مہاراجہ جنگ ہی کو ٹھہرایا ہے ، اور اس کے بعد ہیرو مسعود کو بھی ابھارنے کی کوشش کی ہے ۔

عام تماشائی یقیناً اس نظر بندی میں گرفتار ہو جائیں گے، لیکن بزم آخر محض تماشائیوں ہی سے تو بھری ہوئی نہیں ہوتی۔

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی!

ان اہلِ نظر کی نظر تو بس مرزا بلگرامی ہی کے چہرہ پر پڑے گی، اور وہ ساری کتاب کو اسی ایک متن کا حاشیہ قرار دیں گے۔ ایک پرانے افسانہ نویس نے بھی آج سے سینکڑوں برس قبل اپنی کتاب کا نام داستانِ امیر حمزہ رکھ دیا تھا، لیکن پڑھنے والوں کے دل سے کوئی پوچھے، کہ وہ امیر حمزہ کی داستان ہے، یا عمرو عیار کی؟ اس کتاب میں بھی مرکزی شخصیت اور سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت مرزا بلگرامی ہی کی ہے۔ دوسرے نام اس میں محض اس طرح آگئے ہیں، جیسے بکاؤلی کے قصہ میں لکھا بیسوا اور زین الملوک یا داستان امیر حمزہ میں بختک اور لندھور! البتہ دل مذبذب اس میں ہے کہ اس چھوٹی سی دلچسپ و خوشنما کتاب کی حیثیت کیا قرار دی جائے، اور اسے لٹریچر کی کس صنف میں رکھا جائے؛ تاریخ یا سوانح عمری اسے قرار دیتے ہوئے تو دل دھڑکنے اور قلم لڑکھڑانے لگتا ہے۔ پھر کیا ہے؟ افسانہ؟ اچھا افسانہ سہی، مصنف کو اگر اسے افسانہ کہنے، اور ناظرین کو اسے افسانہ سمجھنے پر اصرار ہے تو افسانہ ہی سہی لیکن پھر وہی سوال ہوگا، کہ افسانہ جھوٹا یا سچا؟ تو اب کیا ہر سوال کا جواب ریویو نگار ہی دے؟ ماشاءاللہ آپ کے بھی آنکھیں ہیں، اور آپ کے پاس بھی عقل و دماغ ہے، اس سوال کا جواب خود اپنے ہی سے آپ کیوں نہیں حاصل کرتے؟

میٹھی کٹنین یا افسانۂ جمیل[1]

گرجستان یا آرمینیا کے نہیں، وہی شہر لکھنؤ کے رہنے اور بسنے والے نواب جمیل الشان بہادر ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے ابھی کل تک زندہ سلامت موجود تھے۔ اور عجب کیا کہ ہم میں سے بہتوں کو زیارت بھی نصیب ہوئی ہو، ایک ضعیف سے آدمی، شاہی خاندان کی یادگار، چہرہ پر جھریاں اور خضابی بال، عمر کوئی ساٹھ سال۔ جسمانی قوتیں لئے ہوئے ضعف و انحطاط، لیکن طبیعت میں رنگینی، اور مزاج میں شوقینی، تمنائیں اور آرزوئیں جوان، دل کے گوشہ گوشہ میں نوجوانوں کے سے ارمان۔ آخر دورِ آخر کے نواب ہی تو تھے۔ معقول وثیقہ اور گراں قدر پنشن تھی کس دن کے لئے رئیسوں کی آن بان، نوابوں، شہزادوں کی شان۔ اور پھر گل ہوتے ہوئے چراغ کی لَو تیز کرنے، بجھتے ہوئے انگاروں کو ہوا دینے کے لئے مصاحب ایک نہیں دو دو حاضر و مستعد، ایک مرزا سیتا، دوسرے میاں علی حسین۔ ایک روز باتوں باتوں میں ایک بازاری حسن کا وہ سبز باغ دکھایا اور شوق و اشتیاق کا وہ لام باندھا کہ بھولا شہزادہ، اعادۂ شباب کے کسی غددی آپریشن کے بغیر، اپنے کو عالم تصور میں، جوانِ رعنا سمجھ بیٹھا۔ اور دل کوہ قاف کی پری پر نہیں، شہر ہی کی ایک لکھا بیوا پر آگیا۔ یہ بی صاحبہ، تھیٹر میں کام اور تماش بینوں میں نام پیدا کئے ہوئے اتفاق سے اس وقت ایک خان بہادر کی پابند تھیں، خان بہادر سن و سال میں تو تھے شہزادہ

---

[1] صدق جلد ۵ نمبر ۲۹، مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۴۰ء۔ نظرثانی مارچ ۱۹۴۴ء

صاحب کے لگ بھگ، لیکن خوب معتبر، طرار اور ٹھاٹ کے، اسی شہر یا جس بڑے حکام رس اور با اثر غضب کے زیرک اور صاحب ہنر، رہنے والے لکھنؤ کے نہیں، خاک پاک بدایوں کے، وہی بدایوں جس کا کلمہ استاد مصحفی بھی پڑھ گئے ہیں کہ

نازاں ہے گی بھی بدایوں سے کم نہیں!

اسی گز ورداز کے عشق سراپا فتنہ میں ڈیرے ڈنڈے لکھنؤ میں ڈالے ہوئے، چوک کے قریب کہیں چھاؤنی چھائے ہوئے۔

اب شروع ہوئی بازار کی مٹھائی پر چھین جھپٹ، یا شاعروں کی زبان میں رقابت۔ ادھر سے بلا کے جوڑ، ادھر سے قیامت کے توڑ۔ ادھر کے جیالے اگر اپنے وقت کے طالیس تو ادھر کے شاطر بھی اپنی حکمت و فطرت کے لحاظ سے پورے فیلسوف۔ کبھی ان کو مات، کبھی ان کو شکست فاش۔ ایک کو اپنے خاندانی اعزاز کا غرہ، دوسرے کو صاحب لوگوں کی خدمت میں ڈالی پیش کرنے اور شکار کھلاتے رہنے کا آسرا۔ ادھر خان بہادر نے کپتان پولیس کو گانٹھ لیا، ادھر شہزادے نے ڈپٹی کمشنر کو جا کر شیشے میں اتار لیا۔ آج عتاب نازل ہوا، پولیس کے داروغہ پر اور بیچارہ کا درجہ ٹوٹ کر رہا۔ کل نزلہ گرا کوتوال شہر پر، اور غریب کو لکھنؤ چھوڑ کانپور جانا پڑا۔

شہزادے سے نپٹ لینے کے لئے خان بہادر بالکل کافی تھے، لیکن ہوا یہ کہ شہزادہ کو کمک پہنچ گئی اپنے رفیق قدیم نواب ضیاء حسین خان آنریری مجسٹریٹ اور رئیس اعظم کانپور کی، یہ سوجھ بوجھ میں خان بہادر سے بھی بڑھے چڑھے، اور حکام رسی اور خوشامد میں ان سے کہیں آگے ہرن، چیتا یا کے برگن لینے والے۔ اب نقشہ جنگ یہ کہ ایک طرف لکھنؤ کے شہزادہ اور کانپور کے رئیس اور مجسٹریٹ اور دوسری طرف بدایوں کے خان بہادر اور کانپور کے کوتوال

محاذ جنگ بھی اب کھنچتے کھنچتے لکھنؤ سے کانپور اور کلکتہ اور بدایوں تک وسیع ہوگیا۔ اور واقعات نے کہ اسٹیج پر پہلے تو وہی جانے بوجھے دو ہی چار شخص تھے، اب نئی نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ! از اب خورشید مرزا اور قمر مرزا، اور خورشید دولہن، اور فرحت مرزا، اور مسعود و شاہد، اور سب سے بڑھ کر میر زین العباد چشمہ فروش ان بزرگوار سے ایک بار بھی تعارف ہو جائے تو عمر بھر ساتھ چھوڑنے کا جی نہ چاہے، ایک روز شہزادہ صاحب معہ اپنی اور خان بہادر کی مشترک محبوبہ کے غائب ہو جاتے ہیں، پھر یک بیک کانپور میں ان کا نزول اجلال ہوتا ہے نہ بجائے اس بیسوا کے، ایک خوش جمال و شوخ دیدہ کشمیری لڑکے حسن جان کے ساتھ، چند روز کے بعد حسن جان بھی لاپتہ اور مفقود الخبر!

"میری زندگی بھی عجیب زندگی ہے . . . . مجھے اس زندگی سے کبھی دلچسپی نہ تھی، ہمیشہ کراہت رہی۔ کئی دفعہ اس مخمصہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ہمیشہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ سچ ہے کہ روپیہ پیسہ دولت کی چاٹ بری چاٹ ہے۔ اور عادت پڑ جانے کے بعد بدکاری میں لذت ملتی ہے مگر تا کے۔ دس پانچ برس کے بعد کیا سے کیا ہو جانا پڑے گا باسی ہار کو لوگ پیروں سے ملتے ہیں . . . . عشاق کہو یا چاہنے والے، سب جوانی کے ساتھی ہیں وہ ڈھلی، اور ان کی نظر بدلی پھر یا چھیڑ چھیڑ کر لڑائی لڑتے ہیں۔ وضعدار ہوئے تو کچھ دنوں تا ہا رفتہ رفتہ آنا جانا کم کیا، پھر بیٹھ رہے"۔

یہ ایک ہلکی سی جھلک ہے ان خیالات کی جو اس بیسوا کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں، جسے آپ ابھی اسی عالم میں چھوڑ آئے تھے کہ

وائے بر صید کہ بکیں باشد و صیادے چند!

جی ہاں! یہ خیالات اور ایک بیسوا کے! بیسوا بھی آخر اسی مٹی کی بنی ہوتی ہیں، جس سے خمیر بڑی بڑی معصمت کی پتلیوں کا ہوتا ہے، اور بندی اسی قادر مطلق کی ہوتی ہیں جو ہر لحظہ بہو بیٹیوں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ اسی کی رحمت کی جب بارش چلتی ہے تو محلہ کے مرجھائے ہوئے گھوروں پر مہکتے ہوئے گلاب اور لہلہاتے ہوئے چنبیلی اور جوہی کے پھول کھلا دیتی ہے۔ اور اس کی صنعت جب بہار پر آتی ہے تو کھرے اور کھوٹے پتھروں کو ہیرے اور جواہر بنا دیتی ہے۔ ناپاک کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، دنیا میں حقیر و ذلیل، آخرت میں راندہ درگاہ۔ جوانی کی بہار کے دن کی، دولت کا خواب کے گھڑی کا، جوان جہاں عورت اپنے انجام کو سوچتی جاتی ہے اور دل ہی دل میں روتی جاتی ہے!۔

"بی صاحبہ سیزن سے اتریں اور چاہنے والوں کی کمی ہونے لگی۔ دولت کے پر لگے، یہ گئی اور وہ گئی۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ دن کے جلیس اور رات کے مونس ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ حیادار ہوتیں تو پسل لیتیں، نہیں تو برقع پہن کر بھیک مانگنے کی ٹھہری۔ آئے دن کے واقعات ہیں۔ پچاسوں مثالیں اس قسم کی اسی شہر میں کیا ہر شہر میں موجود ہیں۔ کسی کی ناک گئی اور کسی کی جان گئی۔ اہتمام یہ ہے کہ اولاد نہ ہونے پائے، بڑھاپا آجائے گا۔ چھوٹے بچے کو دیکھ کر ماں کو جو دلی خوشی ہوتی ہے، وہ ان کے مقدر میں نہیں، جوان مریں تو کوئی دو آنسو بہانے والا نہیں، نہ فاتحہ درود کرنے والا"۔

پاک زندگی کی لطافتیں، گھر گرہست شریفانہ زندگی کی مسرتیں، میاں اور اولاد کی محبتیں۔ ان بیچاریوں کو کہاں نصیب یہ بدنصیب کیا جانیں کہ گھر کی ملکہ ہونے کے معنی کیا ہیں۔ اور شوہر کی کمائی کی موٹی جھوٹی میں بھی اللہ نے کیا لطف اور کیسے مزے رکھ دیئے ہیں عصمت جو غریب سی غریب عورت کا بھی سب سے بڑھ کر بیش بہا خزانہ ہے، اور حوا کی

بیٹیوں کے پاس اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے اس کی ناقدری کی سزا قدرت کی طرف سے اسی دنیا میں یہ مل کر رہتی ہے کہ عورت محبت سے محروم کر دی جاتی ہے ۔ اب نہ اُس کے دل میں کسی کی محبت رہ جاتی ہے ، نہ کسی کے دل میں اُس کی ۔ اور یہ نہ ہو تو دنیا میں آخر نور و ظلمت ، خوشبو و بدبو ، پاکیزگی و گندگی ایک ہی ہو کر نہ رہ جائیں ۔

زمانہ کچھ اور کھسکتا ہے ، واقعات پلٹوں پر پلٹا کھاتے ہیں ۔ کمّو جان کو آخر کار بڑی لمبی جد و جہد کے بعد خان بہادر کی قید سے رہائی نصیب ہوتی ہے ، شہزادہ صاحب دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ۔ شریف بیوا اپنی نام کی ماں کے نام خط لکھنے بیٹھتی ہے ۔ خط میں کیا لکھتی ہے ۔ اپنی اور اپنی ساری برادری کے نامۂ اعمال کی نقل کاغذ کے اوراق پر کر دیتی ہے ۔

"امّی جان ۔ کمّو کی بندگی قبول کیجیے ۔ مجھ نصیبوں جلی کو آپ چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں ، اور اپنے کاٹ پیچ سے باز نہیں آتیں ۔ آپ سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ یہ ناپاک زندگی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی ۔ نہ معلوم وہ کونسی منحوس گھڑی تھی کہ جب معلوم نہیں کس نے مجھے آپ کے سپرد کیا اور آپ نے مجھے پالا پوسا ۔ میں مانتی ہوں کہ آپ نے مجھ پر بہت کافی روپیہ صرف کیا ۔ لیکن جتنا صرف کیا اُس کا چوگنا آپ نے نھیّڑ ہی سے وصول کر لیا آج اسی شہر میں بیگم بنی بیٹھی ہوتی ، اور چین سے براجتی ، وہ بنا بنایا کھیل تمھیں نے بگاڑا اور لکھنؤ لے کر چلی آئیں ۔ تم نے چاروں طرف سے خوب دولت گھسیٹی ، لاکھوں کی آدمی ہو ۔ پر اللہ نے چاہا تو مرتے وقت بھیک کا ٹھیکرا ہاتھ میں ہوگا ۔ کیا کروں ، منہ سے کوسنا ہی نکلتا ہے ۔ خیر تم پر اور تمھارے گھر پر میں نے لعنت بھیجی اور موقع پاتے ہی نکل بھاگی"

الفاظ سوز دل کی روشنائی سے لکھے ہوئے اُس کے قلم سے نکل رہے ہیں ، جس کی

برادری کو بڑے بڑے جبہ و عمامہ والے حقارت کے ساتھ دھتکارتے ہیں، اور معسد زین وشرفا کبھی شرارت سے اور کبھی شقاوت سے گندگی کے اندھیرے غاروں کی گہرائیوں میں دھکیلتے چلے جاتے ہیں! اللہ جزائے خیر دے، بہت بہت جزائے خیر دے "صاحب حق" (روزنامہ حق لکھنؤ کے ایڈیٹر) عبدالرؤف عباسی صاحب کو انہوں نے نفرت و حقارت کے بجائے، انسانیت و ہمدردی کے ساتھ اس طبقہ کے جذبات کی ترجمانی کی۔ اور شستہ زبان اور میٹھی بول چال میں، اس داستان دلستان کے پردہ میں حقائق کو ۲۰۰ صفحہ کی ضخامت میں مرتب کر کے اس میٹھی کو نین کو جھرمٹ میں وقف عالم کر دیا۔ یہ کام کرنے کا تھا، علماء و مصلحین کا لیکن اللہ جس سے جو خدمت چاہے لے لے۔ اور جسے جس منصب پر چاہے سرفراز کرے خط ابھی ختم کیا مٹے، آدھا بھی نہیں ہوا ہے، چند سطریں اور سن لیجئے:۔

"ہے ہے وہ پاک پروردگار میری نہ سنتا تو میں کیا کرتی۔ بدایوں شہر، خان بہادر صاحب کا سارا رئیس۔ حاکم ان کے اثر میں، پولیس ان کے کہنے میں، لاکھوں کروڑوں کے مالک جو چاہیں کر ڈالیں، کوئی پوچھنے گچھنے والا نہیں، میری بات سنو، چلتے چلاتے میں تمہارے ساتھ دوستی کے نجاتی ہوں، خان بہادر کے گھر بیٹھ جاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ کہو ننھی جان، اب میں تمہیں ننھی جان ہی کہوں گی۔ پچاس کے لگ بھگ ہو گئی ہو، کبھی اس کا بھی خیال آیا ہے کہ اب موت کے دن قریب ہیں، خدا کو ظاہر میں بہت مانتی ہو، نذر نیاز بھی کرتی رہتی ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی اس کا وہم آتا ہے کہ کتنے گھر تم نے گھالے ہیں اور کتنے خاندان تم نے تباہ کئے ہیں ان سب کا وبال تمہاری جان پر پڑے گا یا نہیں، یاد رہے کہ تمہارے اعمال قبر میں کالے ناگ بن کر ڈسیں گے اور یہ حرامکاری کے پیسہ کی نذر نیاز ایک کام نہ آئے گی۔ توبہ کرو توبہ، اب بھی کچھ نہیں گیا ہے"

کسی بڑے شہر کے جنکشن اسٹیشن کے باہر، خصوصاً تیسرے درجہ کے مسافر خانوں کے دروازہ پر، جب چاہیئے یہ تماشا تے عبرت اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے، کہ سامنے فقیر نیوں، بھیک منگیوں کا ایک غول کا غول چیتھڑے لگائے ہوئے، میلی کچیلی، گھناؤنی بیمار اور لاغر۔ ان میں کتنی ایسی ہیں جو ابھی کل تک جوان تھیں، بنی ٹھنی ہوئی، اپنے حسن و جوانی پر نازاں، اور اللہ کی اس امانت کو بازار میں دوکان لگا کر بیچ ڈالنے والیاں — بی بی آسیہؓ کا نام کس نے نہیں سنا ہے؟ بیوی کس کی تھیں؟ اللہ کے دشمن فرعون مصر کی، اللہ کے دشمنوں ہی کے درمیان پلیں بڑھیں فرعون ہی کے محل میں رہیں بسیں۔ اس کے باوجود، جب اللہ کی طرف جھکیں، سجدہ میں گریں تو مرتبہ کیا پایا؟ قرآن تک میں ذکر آیا، فرشتوں کو رشک آیا! اللہ اللہ! آپ کے مرتبہ اور سرافرازیوں کا کیا پوچھنا! اور پھر یہ ہماری بہکی ہوئی بہنیں اور بھٹکی ہوئی بیٹیاں تو منکر نہیں مومن ہیں۔ باغی نہیں، صرف غافل ہیں۔ آج یہ اپنے خوش نصیب شوہروں کے گھر آباد کئے ہوئے ہیں، تو خود بھی کیسی ہنسی خوشی، چین اور سکھ کی زندگیاں گزاریں اور اُن کی گودوں میں پل پل کر ہمارے سرور و سردار کے لشکر میں کتنے وفادار اور جانباز سپاہیوں کا اضافہ ہوتا! محمد مصطفےٰ کو برحق ماننے والیاں، اُس نبی کی اُمت کہلانے والیاں، اُس کی شفاعت سے آس لگانے والیاں، کیا خدانخواستہ اُن کے کلیجے پتھر کے ہیں؟ جنت کی کھڑکی اپنے سامنے دیکھیں گی اور اُدھر سے آنکھ بند کر لیں گی، منہ پھیر لیں گی؟ لپکتے ہوئے شعلوں سے بچانے والا ہاتھ ان تک پہنچے گا اور اُسے اپنی ٹھوکروں سے ٹھکرا دیں گی؟ گھر میں آگ لگی ہوئی دیکھیں گی اور آگ بجھانے کے انجن والوں کو اپنے پاس سے دھکے دے دے کر نکال دیں گی؟

طول طویل خط کا ایک آخری ٹکڑا سنکر مکتوب اور کتاب دونوں کو بند کر دیجیے:—

گھر گرہست اور پاک زندگی کے مزے تم کیا جانو۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے

امیروں کی تو بڑی بات ہے، بیسیوں مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں ہر وقت منہ دیکھتی رہتی
ہیں، فرمائشیں کرو، میاں سکھپال پر اگر بیوی بیٹھ گئیں، اور کیوں نہ بیٹھیں گی، بیوی جوان اور میاں بھی
جوان، زندگی کی خوشی ہر وقت ہاتھ باندھے حاضر رہے گی . . . درد و فکر، خوشی و راحت، رنج و
غم میں وزن شریک، ایک دوسرے کی ہر حالت میں اور ہر جگہ ہمدرد . . . آدمی آج
خود مفلس اور قلاش ہو گیا، اولاد کو خون جگر کھلا کے حوصلے سے پالا اور پرورش کر کے
اس امید پر کہ وہ جوان ہو گی تو اس کا ہاتھ بٹائے گی۔ یہ اس ریت کی عمارت نہیں ہوتی۔
سینکڑوں مثالیں اس کی میری اور تمہاری آنکھوں کی دیکھی ہوئی موجود ہیں۔ کیا تم انسان
سے کہہ سکتا ہو کہ کسی مرد کی نگاہ یا تم سی بڑی ڈیرہ دار طوائف کے پہلو میں بھی ایسی اچنبھا
ہوتی ہے۔ قصہ طویل ہے۔ اگر خدا نے کچھ بھی عقل دی ہے تو اس خط سے سبق لو۔

سبق بقیہ کی اس نے کر لیا یا نہیں، اسے چھوڑیئے، سبق لینے کے قابل ہے پڑھنے
والوں اور پڑھنے والیوں کے، بوڑھوں کے اور جوانوں کے، تماشبینوں کے اور تماشہ گردوں کے
پھنسنے والوں کے، اور پھانسنے والیوں کے، نوابوں کے، رئیسوں کے، امیروں کے، کرشمے
والیوں کے، فلم ایکٹرسوں کے، ریڈیو آرٹسٹوں کے، غرض ہمارے آپ کے سب کے صحت کو، عزت
کو، دولت کو برباد کرنے والے اور غارت کرنے والیاں کاش آنکھیں کھولیں اور سوچیں
کہ اب تک کس طرح زندگی کا نام کا روز رکھے ہوئے ہیں۔

کوتوال شہر اپنی سراغ رسی میں کہاں تک کامیاب رہے؟ حسن جان کا کچھ پتہ لگا؟ میر
زین العباد پر کیا کیا گزری؟ نواب منیار حسین خان کی خوش تدبیریوں اور ہوشمندیوں نے کیا گل
کھلائے؟ خورشید مرزا نے لڑکے کھیل میں کیا حصہ لیا؟ خورشید دولہن کی اصلیت کیا نکلی؟
شہزادہ صاحب کی خبر ان کی بیگم صاحبہ نے کس بری طرح لی؟ میر صاحب چشمہ فروش کی

افسوں نوازی کیا رنگ لائی ؟ اس طرح کے سارے سوالات کا حل کتاب میں تلاش کیجئے۔ اور اس کا اطمینان رکھئے، کہ جو لوگ مغز کلام کی طرف سے آنکھیں بند کر قصّہ کو محض لطف زبان اور حسن بیان کے لئے پڑھنا چاہتے ہیں وہ بھی گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ یہاں تو صرف مصنّف سے یہ کہنا ہے کہ اگر انہوں نے اس خداداد نعمت کی پوری قدر نہ کی، اور جس طرح اس کتاب میں لطیف و جمیل پیرایہ میں اور دلکش انداز سے نیکی کی فتح بدی پر اور پارسائی کی بے عصمتی پر دکھائی ہے، آیندہ اگر اسی رنگ میں دین کی فتح بے دینی پر اور اخلاق کی بد اخلاقی پر نہ دکھائی، تو تعجب نہیں کہ "کل" خود اُن سے سوال ہو جائے۔

نغمۂ زندگی[۱] :—

از سید فضل احمد کریم فضلی، بی لٹ (آکسن)، آئی سی ایس، چھوٹی تقطیع ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحے، مجلد قیمت بہ اختلاف جلد ۲؍ عہ؍ - پتہ دفتر انجمن ترقی اردو دریا گنج دہلی یا فضلی برادرس (لمیٹڈ) کنٹ ہاؤس مشن رو ایکسٹینشن کلکتہ۔

کتاب کہیے، یا ننھے منے سے قد، ہلکی پھلکی قامت کی مناسبت سے کتابچہ، اردو دیوان ہے ایک آئی سی ایس شاعر کا، اور مجموعہ ہے ایک آکسن کے اردو کلام کا —— اپنی نوعیت میں شاید پہلی اور انوکھی چیز۔

جدت اور ندرت صرف اسی حیثیت سے کب ہے؟ قدرۃً نظر سب سے پہلے فہرست پر پڑی، اور پہلا عنوان "تصویر شاعر" نظر آیا — ورق الٹا، لیکن آہ یہ تصویر کہاں ہے؟ کسی نے تصویر والا صفحہ پھاڑ تو نہیں ڈالا! جی نہیں نسخہ سالم، لیکن درج بجائے تصویر کے صرف ایک شعر! تصویر! لاحول ولا قوۃ، کیا دھوکا ہوا۔ آگے چلیے، دوسرا عنوان - دیباچہ - اچھا صاحب، دیباچہ تو پڑھنے میں آئے گا، لیکن توبہ اب کی پھر وہی دھوکا! دیباچہ القط، اور اس کے عذر میں دو شعر درج! —— غرض مصنف اور تبصرہ نگار کے درمیان آنکھ مچولی شروع شروع ہوئی۔ شیوہ طراز شاعر ہے کہ قدم قدم پر مات دیتا اور بھولا بھالا ناقد ہے کہ مات پر مات کھاتا چلا جاتا ہے! یہاں تک کہ اصل دیوان غزلیات کا شروع ہو گیا، وہی ردیف الف

---

[۱] صدق ۱۲؍ اپریل ۱۹۴۳ء

اب کہیں استاد غالب سے مشورے ہو رہے ہیں، کہیں خواجہ حافظ سے سرگوشیاں، کہ لیجئے صفحہ ۸۹ آ گیا، اور اب دو بدو ہونے لگی فارسی کے استاد منوچہری سے۔

صفحہ ۹۲ پر غزلوں کا جلسہ ختم۔ صفحہ ۹۵ سے نظم خوانی کی محفل آراستہ۔ کہیں رباعیاں ہیں، کہیں قومی نظمیں اور سب سے آخر میں نظم "آکسفرڈ" میر حسن کی بدر منیر کے وزن پر۔ آکسفرڈ کی سرگزشت اور آکسن کی خود گذشت ——— خدا معلوم اس مثنوی کو مثنوی کہنے میں شاعر نے کیوں تکلف سے کام لیا! ——— وہی روانی، وہی شوخ بیانی، وہی رمز و کنائے، وہی حرف و حکایت، جو مثنوی کی جان ہوتی ہیں، غرض بجز عریانی و فحش نگاری کے اور سب کچھ۔ سب سے بڑی اور شاعر کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم نظم (یہ بھی مثنوی ہی ہے) کا عنوان ہے "قلم کا جادو"۔ یہاں پہنچکر شاعر نرے شاعر نہیں رہتے، واعظ و خطیب بھی بن جاتے ہیں۔ وعظ و خطابت سیما کی سمجھ میں نہیں، اچھی پاکیزہ، اصلاحی و انقلابی علم سازی کی حمایت میں ——— رندمیں محتسب کی شان، زبان شاعرانہ، تیور مصلحانہ!

شاعر نے شہد کی مکھی بن، رس خدا معلوم کن کن پھولوں کا چوسا ہے، کن کن کلیوں کا چوسا ہے۔ اقبال کا اثر سب سے بڑھ کر نمایاں، شروع میں بھی، آخر میں بھی، وسط میں بھی، لیکن اپنی خودی کو لئے دیئے ہوئے۔ اپنی شخصیت سب سے الگ تھلگ کئے ہوئے۔ رنگ میں کسی کے بھی پیرو اور مقلد نہیں، سب سے آزاد، بس اپنے ہی اوپر اعتماد۔ یہ ہنر نہیں قدیم الخیال ریویو نگار کی نظر میں کچھ عیب ہی سا ہے۔

صلاحیتیں اب بھی موجود ہیں، خدا کرے عمر میں اضافہ اور مشق میں پختگی کے ساتھ نظر بھی حکیمانہ و عارفانہ ہوتی جائے۔ شاعری تمام تر ایمانی و عرفانی بن جائے، اور حضرت اقبال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے حضرت فضلی پورے "اقبال مند" ہو جائیں ——— اور زبان و وطن کے

لحاظ سے پنجابی[1]، اور مسکن کے لحاظ سے بنگالی، بھلا کیسے ممکن ہے کہ اتنی شاعری صحیح اردو
میں کر جائے۔ نکتہ چینی کی نگاہ اس تلاش میں دوڑی، پھری، گھومی۔ لیکن مجنوں صفحہ ۹۵ کے آخری
شعر کے شاید کہیں بھی جگہ کھٹکنے اور رکنے کی نہ پائی۔

---

[1] بعد کو معلوم ہوا کہ فضلی صاحب کا وطن پنجاب نہیں

نقد و نظر[1]:-

از پروفیسر حامد حسن صاحب قادری صفحات ۳۰۲، مجلد، قیمت سے/

پتہ:- شاہ اینڈ کمپنی، پبلشرز- حکیم وصی روڈ- آگرہ

نقد و نظر پر تبصرہ کرنے کے لئے خود بڑے صاحب بصیرت ہونے کی ضرورت ہے- لیکن سرے سے آنکھ چرا جانا بھی بڑی بے بصری ہے-

کتاب پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے- زیادہ تر ایسے جو پہلے کسی رسالہ میں شائع ہو چکے ہیں- لیکن اب اس مجموعہ میں قرینہ سے سج بجا کر نکلے ایں تو سب نئے معلوم ہوتے ہیں، پندرہ میں سے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:-

غالب کی شرحیں- میاں نظیر اکبر آبادی، آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ، خمخانۂ ریاض، زبان کے چند نکتے- تنقید کے نئے زاویے، عروضی غلطیاں-

تنوع کے سرسری اندازہ کے لئے یہ عنوانات کافی ہوں گے- اندازہ "سرسری" اسلئے کہ ادب، انشا، تنقید، عروض، سخن فہمی کے جتنے عمیق نکتے اور جتنے وسیع مباحث کتاب کے اندر پھیلے ہوئے ملیں گے، اس کا پورا اندازہ تو بس کتاب ہی کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے- فہرست مضامین کا نقل کر دینا، یا کوئی چھوٹا موٹا سا تبصرہ بھی اس کے لئے بالکل ناکافی ہے — کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مشرقی طلباء فن کے لئے اور مشرقی عام ناظرین کے لئے قادری صاحب یہ نہیں کہ ہومر اور ورجل کے ناموں سے ناآشنا

---

[1] صدق ۴ر جنوری ۱۹۴۳ء

ہوں، وہ واقف بائرن، شیلے سب سے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں، اور اپنوں کے لئے لکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ مجموعہ کا مضمون مطالعۂ شاعری اُن کا طبع زاد نہیں، بلکہ میتھو ارنلڈ کا ترجمہ ہے، لیکن اس کو بھی اپنا لیا ہے، انگریزی نما اردو نہیں ٹھیٹھ اردو لکھ کر۔ اور اشعار کا اپنی طرف سے جا بجا اضافہ کرکے ——— البتہ وہ ناواقف ایک فن سے ہیں۔ انہیں یہ نہیں آتا، کہ اپنے افلاس دماغی پر پردہ پُر شوکت اور مرعوب کُن ناموں کا ڈال لیں۔ کتاب متوسط اور منتہی طلبہ کے تو خاص کام کی ہی ہے، باقی عام شائقینِ ادب بھی اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور پورا لطف و دلچسپی بھی حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہت سے درس دینے والے اساتذہ بھی اگر کسرِ شان نہ سمجھیں تو اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ تین سو سے اوپر کی کتاب کے لئے یہ تو ممکن ہی نہیں کہ اس کے ہر ہر تبصرہ، ہر ہر خیال سے دوسروں کو اتفاق ہو، شرحِ درد والے مضمون میں تو خصوصیت کے ساتھ فاضل تبصرہ کے تبصرے نظرِ ثانی کے محتاج نظر آئے، لیکن حیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی، سنبھلی ہوئی، سموئی ہوئی کتاب فنِ تنقید پر اردو میں عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی، جب طبیعت دوسرے رنگ کی، صاحبانہ اور سرکاری رنگ کی تنقیدی کتابوں سے اچھی خاصی اکتا چکی تھی!

ایک بڑا سبق ان صفحات سے یہ ملِ جاتا ہے، کہ تنقید و تبصرہ کا لب و لہجہ کیا ہونا چاہیئے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعروں، ادیبوں، نقادوں سے اختلاف، اور شدید اختلاف، شریفانہ انداز میں بھی کیا جا سکتا ہے، اور ہاں، ایک بات تو رہی جاتی ہے تضمین کلامِ غالب وغیرہ کے ضمن میں قادری صاحب نے جہاں جہاں خود اپنا کلام درج کیا ہے، وہاں تو بے اختیار دل سے یہ نکلتا ہے کہ واہ حضرت آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے سخن فہمی کے ساتھ سخن گو بھی!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

جزیرۂ سخنوراں[1]

از غلام عباس صاحب، ۱۴۴ صفحات، مجلد خوشنما، قیمت ایک روپیہ

پتہ:- کتاب خانہ ہزار داستان ۴۳ بازار لین نئی دہلی۔

یہ ایک افسانہ ہے، نئے اور البیلے رنگ کا۔ پلاٹ یورپ سے لیا ہوا، لیکن قصہ بالکل اُردو میں اپنایا ہوا۔ ایک جزیرہ ہے، جزیرۂ سخنوراں، تمام تر شاعروں اور ان کے مداحوں سے آباد، اخلاق کی قیود سے آزاد، وہاں یہ سیاح صاحب معہ اپنی ہم سفر ایک حسین خاتون کے اتفاق سے جا پہنچتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجلس شوریٰ تک پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ مجلس کے تین ارکان ہیں، ایک ادھیڑ سن کے بزرگ "فصیح الفصحا، شاعر بے ہمتا علامہ مفتی انوار الحسن یکتا۔ دوسرے ایک طرحدار نوجوان "بلبل داستان سرائے گلشن معانی رشک انوری و خاقانی، حضرت امی"۔ تیسرے خود صدر مجلس "حقیر پُر تقصیر، خاکسار، ذرہ بے مقدار مائل"۔

شاعروں کی دنیا، شاعری کی دنیا سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور قابل دید۔ سرکاری مہمان خانہ کا نام دار الخیال۔ باغوں، بازاروں، گلی کوچوں کے نام خیابان میر۔ غالب بازار۔ آتش باغ گلزار سرور، کوچۂ مومن خاں وغیرہ۔ یہاں کے معشوق کا حلیہ:-

"نصف عورت، نصف لڑکا، ایک طرف محرم، چوٹی، موباف، دوسری طرف کلاہ، چیدہ، اور سبزۂ خط، طبیعت میں سفاکی اور جلادی کوٹ

---

[1] صدق، ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۱ء

کوٹ کر بھری ہوئی، ہونٹوں پر عاشقانِ باوفا کا لہو لگا ہوا، کسی پہ
کمند پھینکی، کسی کے پاؤں میں زنجیر ڈالی، کسی کو شہیدِ تیغِ ناز کیا، کسی کو
بحرِ ظلمات میں دھکا دیا کہ عمر بھر ٹامک ٹوئیے مارتا رہے، کسی کو چاہِ ذقن
میں غرق کیا کہ جیتے جی سر نہ اٹھا سکے، نہ انسان مامون، نہ وحش و طیور
مصئون" (ص ۵۶-۵۷)

"رہا عاشق بے چارہ:- سودۂ مصیبت کا مارا، صدمۂ دوری کا پتلا، غریب الوطن
فلکِ ناہنجار کا ستایا ہوا، بھوک کا پیاسا، ننگ دھڑنگ، آج یہاں تو کل وہاں
کبھی دریا میں ناخدا بن چھینٹیں اڑاتے، تو کبھی صحرا میں آہوؤں کے ساتھ
آنکھ مچولی کھیلے، بھیس بدلنے کے فن میں استاد- کبھی مجنوں کا روپ دھار
صحرا میں محمل کے گرد چکر پھیریاں لیتے تو کبھی فرہاد بن کر کوہِ بے ستون
پر تیشہ تیز کرے، کبھی انسان، تو کبھی جانور، کبھی گھر کی کال کوٹھری میں
تو کبھی درخت پر کبھی گھونسلے میں" (ص ۵۷-۵۸)

یہاں کی زبان، صنائع کی جان، بدائع کی کان - ایک صاحبہ اپنی ملازمہ کو جھڑک رہی ہیں:-
"اری موئی سوئی نہیں ملتی تو گرل آر، کیوں پیچ کھائی ہے" (پیچ + ک = پیچک)

ایک عاشق صاحب یوں دادِ فصاحت دے رہے ہیں:-
"اے سنگ دل تیری سنگدلی پہ پتھر پڑیں، ہم تو تیرے چہرۂ لولوریں
لب لعل و درِ دنداں کو یاد کر کے، کوہ و بیاباں میں پتھروں سے سر پھوڑیں
اور زعفرول کے سنگ گل چھرے اڑاتے ساری رات آہوں کے شرارے، مرے بے ڈھنگ اڑے
کرہ سے سنگت چشم کرکی فرسنگ اڑے"

معشوق صاحب کے جواب میں یوں بلاغت کے شرارے چھوڑتے ہیں:۔

"ارے نادان، میزانِ عشق میں پاسنگ ہونا محال، کیوں مَن مَن بھر کی

باتیں چھانٹتا ہے رسنگسار ہونے کی نیت ہے کیا؟"

بہت خوب بہت خوب! صدٔ وصد ائے غالب

یہ فاسقانہ عاشقی معشوقی میں "سنگ باری" کا ضلع، بہت خوب ہے، مشاعرہ کا منظر

کے دو شعروں کی جو شرح کی گئی ہے، وہ پُر لطف ہونے میں اپنی نظیر آپ ہے، ایک

بہترین ہے ـــــ شعر و ادب کے دیوانوں کے لئے ایسے دلکش و رنگین مرقع کا سودا ایک

روپیہ میں مفت ہے۔

(۱) خنداں[1] :-

از رشید احمد صاحب صدیقی۔ صفحات ۲۸۱ مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے

پتہ :- مکتبہ جامعہ (دہلی، لکھنؤ، لاہور، بمبئی)

یہ اردو کے مشہور ظریف و شوخ نگار رشید احمد صاحب صدیقی کے چالیس ریڈیائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین عرصہ تک دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوتے رہے، اور اب مکتبہ جامعہ کے حسن اہتمام سے کتابی شکل میں آگئے ہیں۔ رشید صاحب کی پرلطف طرز نگارش اب پڑھے لکھے حلقوں میں قطعاً کسی سفارش کی محتاج ہے، نہ تعارف کی۔ ان کا ایک خاص اپنا رنگ ہے جو دوسروں سے ممتاز، اور وہ پختہ کار ہو چکا ہے۔ بغیر کسی کی دل آزاری بلکہ دل شکنی کے، بلا فحش و ابتذال کے شائبہ کے۔ ہجو اور ستہابی سے پاک، وہ چھوٹے بڑے، اپنے پرائے، سب کے خاکے اس دلچسپ انداز میں کھینچتے چلے جاتے ہیں، کہ پڑھنے والا ہر سطر پر پرلطف لیتا جائے، مسکراتا جائے جھومتا جائے اور کہیں کہیں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا، ریڈیو بہرحال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد رہتی ہیں۔ ظرافت کی بے تکلفی بھلا ان قیود کا تحمل کہاں کر سکتی ہے، لیکن رشید صاحب کی معجز نگاری نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا اور اس ضخیم مجموعہ کے ہر ہر صفحہ کو زعفران زار بنائے رکھا ہے۔ بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ نکلے، اور بعض خاکے تو خاص طور پر دلچسپ و پرلطف ہیں، آپ لیے

---

[1] صدق ۲۳ دسمبر ۱۹۴۲ء

کہ پڑھنے والے انہیں بار بار پڑھیں گے۔ کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں۔ یہ عیب ہو یا ہنر، بہرحال واقعہ یہ ہے کہ "رشیدیات" سے لطف اٹھانے کے لئے پڑھنے والے کو اچھا خاصہ پڑھا لکھا ہونا چاہیئے۔ ادبی اور شخصی تلمیحات بکثرت ہوتی ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ ادب اردو کے ہر صاحب ذوق شائق یا طالب علم کے مطالعہ کی میز پر نظر آئے۔ مکتبہ جامعہ نے اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو کی ایک خدمت انجام دی ہے۔

(۲) گنج ہائے گرانمایہ[۱]:-

از جناب رشید احمد صاحب صدیقی۔ ضخامت ۲۱۹ صفحہ، قیمت ۳؎

پتہ:- اردو بک ایجنسی علیگڈھ۔

خندان کے بعد گریاں! رشید صدیقی کا نام سب جانتے ہیں، یہ علم کم لوگوں کو ہوگا کہ وہ اگر ہنس سکتے اور ہنسا سکتے ہیں، تو رو بھی سکتے ہیں، رلا بھی سکتے ہیں۔ انکے مزاحیہ مضامین کے مجموعے پہلے نکل چکے ہیں۔ یہ تازہ مجموعہ ان کے تعزیتی مضامین کا ہے ــــــ ظریف کے آنسو، آنسو نہیں، موتی کے دانے ہوتے ہیں ــــــ اردو کا یہ شوخ نگار آج سوگوار ہے، اپنے محبوبوں کے مزار پر عقیدت و محبت کے پھول ہاتھ میں لئے فاتحہ پڑھنے نکلا ہے! اس کا اداس چہرہ، اس کا اداس بشرہ، اس کا حسرت انگیز لہجہ سب قابل دید ہیں۔

محبوبوں کے نام آپ سنیں گے؟ ان میں سے بعض تو یقیناً آپ کے بھی محبوب ہوں گے ــ محمد علی[۱]۔ ڈاکٹر انصاری[۲] ۔ مولانا سلیمان اشرف[۳] ۔ مولانا ابوبکر محمد شیث[۴] ۔ اصغر گونڈوی[۵] ۔ ایوب عباسی[۶]

---

[۱] صدق، ۷ ستمبر ۱۹۴۲ء

اقبال۔ احسن مارہروی۔ اقبال، محمد علی، الفاروق کو تو ایک دنیا جانتی ہے، اصغر بھی کچھ ایسے گمنام نہیں۔ دونوں مولانا بھی علیگڈھ کے حلقہ میں خوب مشہور، صرف ایک ایوب عباسی سے دنیا ناواقف تھی، اب واقف ہو جائے گی۔

مضمون شاکری بھی نہیں۔ سب لکھے ہوتے ہیں، لکھائے ہوئے نہیں ہیں۔ لیکن محمد علی مرحوم والا مضمون، مختصر ہونے کے باوجود سب میں ممتاز ہے، اپنی مثال آپ ہے۔ لکھنے والے کے لئے باعثِ فخر بھی، موجبِ اجر بھی، ایک بار پیچ مرحوم میں نکل بھی چکا ہے۔ مستحق اس کا ہے کہ دوبارہ چھپے، بار بار چھپے،

کتاب سب کے پڑھنے کے قابل ہے، نوجوان طلبہ کے لئے خصوصاً وہ دیکھیں اور سمجھیں، کہ جو قلم لطیفہ مزاج پر قادر ہے، وہ تعزیت سے معذور نہیں، اور جو قلم لطف و مسرت کی گدگداہٹ کا خزانہ ہے، وہ درد و غم کی بھی کسک سے خالی نہیں! ——— ادیب بننے سے پہلے شریف ہونا ضروری ہے، اور یہ کتاب ایک خادم ادب کی شرافت کی دستاویز ہے۔

---

(۱) ہم اور وہ :- [۱]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی ۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات ۔ قیمت ۱۲ ؍
پتہ :۔ مکتبہ جامعہ دہلی (خود مصنف سے بھی ٹمیا محل ۔ دہلی کے پتہ پر ملجائے گی)

"قدیم" و "جدید" کی بحث اب خود قدیم ہو چکی ہے، اور کوئی جدّت اس میں باقی نہیں رہی ۔ اس پر بھی جب کوئی زندہ شخصیت اس میں حصہ لیتی ہے، تو بحث کی مُردہ ہڈیوں میں نئے سرے سے جان پڑ جاتی ہے، مدت سے کہا یہ جا رہا تھا کہ دلی اب دلی والوں سے خالی ہو گئی اور زباندانی ان خطے سے رخصت ہو گئی "ہم اور وہ" نے ثابت کر دیا کہ دلی میں دلی والے اب بھی پڑے ہوئے ہیں اور دلی کی زبان اب بھی ماشاءاللہ اسی آب و تاب سے، اسی آن و بان سے زندہ ہے، قائم و پائندہ ہے، درخشاں و تابندہ ہے، مصنف نے ایک اچھوتے طرز پر قدیم و جدید کی بحث کو اٹھایا ہے، اور محاکمہ کا حق ادا کر دیا ہے ۔ نتائج تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے کہ قلم کا رُخ کہیں کہیں غلو و مبالغہ کی جانب جھک گیا ہو، لیکن بحیثیت مجموعی بات جو بھی کہی ہے، سچی، کھری، سیدھی، خدا لگتی ۔ اور حسنِ بیان و لطفِ زبان کے لحاظ سے تو اپنی نظیر آپ، فصاحت سطر سطر پر بلائیں لیتی جاتی، اور بلاغت قدم قدم پر نثار ہوتی جاتی ہے حسنِ انشاء کا ایسا نمونہ دیکھنے کو اب آنکھیں ترسا کرتی ہیں ۔ اللہ اُن کی عمر میں بہت بہت برکت، اُن کے قلم کو بہت بہت قوت عطا کرے، کہ گلشن اردو کو ایسی ہی نہروں سے سیرابی کی ضرورت ابھی مدتوں باقی رہے گی ۔

---

[۱] صدق، ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء

(۲) دِلّی کا سنبھالا:-

از خواجہ محمد شفیع دہلوی - ۱۵۰ صفحے، مجلد قیمت عمر مکتبہ جامعہ دہلی

کتاب کا تعارف ذرا مشکل ہے بس یہ سمجھ لیا جائے کہ گویا ایک آئینہ ہے جس میں اگلے دِلّی والوں دیکھ دِلّی والیوں کی بھی) کی زندہ تصویریں چلتی پھرتی، بولتی چالتی نظر آرہی ہیں۔ اور پھر اس مجمع میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں، عالم و فاضل بھی، اور رندو اوباش بھی، زاہد و مرتاض بھی، اور شوخ و طرار بھی۔ ایک طرف شاہ عبدالقادر رح، شاہ عبدالعزیز رح، شاہ رفیع الدین رح، اسمٰعیل شہید، اور سر سید، حالی، نذیر احمد، حکیم محمود خاں، تو دوسری طرف فلاں گویّے، اور فلاں ستار نواز، اور فلاں بی صاحبہ، مصنف کا مقصد تاریخ نگاری نہیں، اس لئے ایسی غیر دلچسپ باتوں کو نظرانداز کیجئے کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے "علم جہاد" حکومتِ برطانیہ کے خلاف بلند کیا تھا[1]، مصنف کا مقصد اپنی زباں دانی کا جوہر دکھانا اور پرانی دِلّی کا جیتا جاگتا نقشہ کھینچ دینا ہے، اور ان دونوں مقصدوں میں وہ اس طرح کامیاب ہوئے ہیں کہ گویا امتحان کے پرچے میں سَو نمبروں میں پورے سَو پالئے ہیں۔ زبان کی صحت اور زبان کا حُسن، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو اہلِ قلم دلچسپ فقرے لکھ لیتے ہیں، وہ ترکیبوں، محاوروں، بندشوں کی صحت ادا پر بھی قادر ہوں۔ دونوں کا اجتماع اس وقت کے اردو لکھنے والوں میں خال ہی خال نظر آتا ہے۔ خواجہ شفیع صاحب ان مستثنیٰ مثالوں میں سے ایک ہیں۔

اور پھر اسلوب بیان کی دلکشی نہیں دلبری، اس پر قیامت۔ یہ ممکن نہیں کہ اس سے کوئی

---

[1] صدق ۱۴ اپریل ۱۹۴۱ء

صفحہ مکمل ہو جائے اور ہم پیسٹر ختم کئے بغیر آپ کا چھوڑنے کو جی چاہتا ہے، ایک دو منظروں پر نگاہ
آپ بھی تو سی ذرا ڈالتے چلیے :-

اہل دربار مؤدب کھڑے ہو گئے، ولی ماما نے تعظیم دی - یہ کون تین
بھائی آ رہے ہیں کہ ملائے اعلیٰ طبقات نور لیے ساتھ ساتھ ہیں، نقیب نے
آواز دی مولانا شاہ عبدالعزیز
صاحب، تفسیر فتح العزیز کے مؤلف، مولانا شاہ رفیع الدین صاحب —
مولانا شاہ عبدالقادر صاحب مترجم کلام پاک

بھاٹ نے عرض کی ؎

خاموشی در ثنائے تو حد ثنائے تست

رفعت علم طالب فرش لینے آئی، صف علماء میں مرتبہ بلند پر لے جا بٹھایا
مولوی میاں نذیر حسین اپنے معتقدین کے ہمراہ دفاتر احادیث مقدسہ
لئے تشریف لائے - درجہ اعلیٰ پر بصد ادب بٹھائے گئے۔ شاہ اسمٰعیل صاحب
صراط المستقیم کی تلقین فرماتے تشریف لائے - اہل دربار نے تعظیم دی - ولی
ماما نے بنظر عنایت دیکھا اور کہا کہ یہ خود شہادت پر توکلن ہے - ان
کا مستقبل بتاؤ - منجم قدرت نے ولی ماما کی پیشگوئی کی شہادت دی

تقدس کی اس شہ نشین سے اتر کر اب ضلع جگت کے میدان میں آئیے -
روز محفل آراستہ ہوتی ہے - شہر بھر کے تیز طرار شوخ گفتار جمع ہوتے
ہیں، اکثر زبان دراز دور دور سے مقابلہ کے لئے آتے ہیں، استاد کی سب سے
چھوٹ ہوتی ہے، جو منہ آتا ہے منہ کی کھاتا ہے - ظالم ایسا نہ ایک
فقرہ ایسا چست کرتا ہے کہ بڑے سے بڑا منہ زور منہ دیکھتا رہ جاتا ہے

جواب نہیں بن پڑتا، اپنا سا منہ لے کر چلا جاتا ہے۔ "استاد چلتے چلتے فقرہ کستا ہے۔ دیکھنا جیسے پیٹھ دکھائی، ایسے منہ بھی دکھانا، پھر بھی آنا۔ جو ایک دفعہ مقابلہ پر آجاتا ہے، اس کا پھر منہ نہیں پڑتا کہ منہ دکھائے استاد ایسا منہ توڑ دندان شکن فقرہ کہتا ہے کہ منہ پھیر دیتا ہے"۔

زبان و ادب کے معیار سے ایسی کتاب مدّت کے بعد دیکھنے میں آئی اور عام متفرق معلومات کے لحاظ سے بھی کتاب گھٹیا نہیں۔

(۳) شرح درد[۱]

از:۔ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۱۴۴ صفحے قیمت عمر۔ خود مصنف مٹیا محل کے پتہ سے ملے گی۔

خواجہ محمد شفیع دلی کے رہنے والے ہیں۔ اور نئی دلی کے دور میں پرانی دہلی کی یاد تازہ رکھنے والے خواجہ میر درد کے کلام کی یہ شرح، شرح درد، اپنے رنگ میں فرد، خود انہیں کے قلم کی ہے۔

کلام کی شرح تو خیر ایک چیز ہی ہے، شارح کی نثر بجائے خود ایسی ہے کہ فصاحت لوٹی جاتی ہے، بلاغت قدم چومتی جاتی ہے۔ دیباچہ کی ابتدا کھجور کے درخت سے ہوتی ہے! جی ہاں کھجور کے درخت سے! ان رسیلی شربتی، شیرہ ٹپکتی ہوئی لالوں لال کھجوروں کا مزہ تو بعد کو چکھیے گا۔ ابھی ذرا ہری بھری ٹہنیوں، خوشوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی سیر کرتے چلیے:۔

"صحرائے عرب کا نخل، کھجور کا درخت، ہر رگ[۲] و ریشہ کام کا، پھول پتی کارآمد، پھل غذا

---

[۱] صدق ۷ رنومبر ۱۹۴۱ء

گٹھلی دوا۔ جڑیں مضبوط۔ بلند و بالا۔ استوار۔ باد سموم کے تھپیڑوں سے جھک جائے۔ دم کے دم سے میں پھر سیدھا۔ مرکز سے جنبش نہیں۔ اپنی بقا کے لئے کم از کم کا طالب، دوسروں کی بقا کے لئے زیادہ سے زیادہ حیات بخش، فروعات سے معرّیٰ۔ چوٹی پہ ایک گھنا ہوا گلدستہ، پھول پھل سب ایک جگہ، یکجہتی اور سادگی کا نمونہ، سایہ دُور تک پھیلے۔ جگہ کم سے کم گھیرے۔ برگ و بار کی ہر فصل یا ہر نسل اس کو ایک پوری بلند کر جائے۔ خود سپرد خاک ہو، کھاد بن جائے، آنے والوں کے لئے بلند تر مقام کی بنا بنے۔" (صفحہ ۱)

بارہ کی اس گنتی میں ماہ ربیع کی بارھویں کی بہار۔ بارہ برجوں کے خالق کی قدرت کا رمز اس سے آشکار۔ نئی تشبیب اور نئی گریز مجاز سے حقیقت کی طرف آیئے، اور لفظی بندشوں میں معنویت کی مٹھاس پایئے:۔

"جس خطہ نے ان خصوصیات کا متحمل درخت پیدا کیا، اسی کیس سے ایک دین چلا۔ کارآمد فطری اصول کا حامل۔ قوی الاساس۔ رفیع النظر راستی و راست بازی کا حامل۔ دب دب کر ابھرنے والا۔ مرکز سے نہ ہلنے والا۔ آسانیاں اور فراخیاں بہم پہنچانے والا، لیکن تسلیم و رضا کا طلبگار۔ فرقہ بندی سے غیر متاثر۔ وحدت کا پرستار، مرکزیت کا دلدادہ، اتفاق کا حامی، رسم و رواج کی پہنائیوں سے معرّیٰ، ہلکا پھلکا دُوررس ترقی کا راستہ دکھانے والا۔ فنا میں بقا کا سبق دینے والا۔ یہ وہ مذہب تھا جو رسول عربیؐ لے کر آئے۔" (صفحہ ۱)

زبان کی ان لطافتوں ادب کی ان نزاکتوں کی جو قدر نہ کرے وہ یقیناً اُردو کے بارہ پتھر سے باہر

(۴) ناکام[1] :-

از خواجہ محمد شفیع دہلوی، ضخامت سَو صفحے، قیمت ۱۲ آنے
مصنف ہی کے پاس سے ٹیا محل دہلی کے پتہ سے ملجائے گی۔

دہلی کے جدید انشا پرداز خواجہ محمد شفیع کا نام اب نہ اردو کے طلبہ کے لئے نامانوس رہا ہے، نہ ناظرینِ صدق کے لئے۔ "ناکام" اُن کا تازہ ترین افادۂ قلم ہے، سرسری نظر میں ایک دلکش افسانہ، گہری نظر میں حکمت و اخلاق کا خزانہ۔ اور ہر صورت میں ادب و انشا کا ایک گنجِ شائگاں۔ زہرہ ایک مشہور میراثن ہے، اور حسین و حاضر جواب مغنیہ، اس کا سابقہ ایک نوجوان کاظم سے پڑ گیا ہے، کاظم ذہانت میں فرد۔ حاضر جوابی میں اُستاد، ہر رنگ میں رنگا ہوا، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے، لیکن اپنے کو لئے دیئے ہوئے، نفس کو قابو میں کئے ہوئے۔ اس کا دل اس کے کہے میں، زہرہ خود دل کے کہے میں نہیں۔ میراثن نے خوب خوب کمندیں پھینکیں، ہر ہر طرح جال ڈالے، وہ بل لم ایک بار بھی نہ پھنسا، ہر بار خود شکاری ہی کو شکار کر آیا، اور چوٹ کھائے ہوئے غرور و تمکنت کو جھک کے پر جھک دیتا گیا، لفظ و عبارت میں مے و شاہد کی وہ سخن آرائیاں کہ دھوکا دیوانِ حافظ کا ہونے لگے: معنیٰ و مفہوم میں اخلاق و موعظت کی وہ گل فشانیاں کہ گمان گلستانِ سعدی کا گذرنے لگے۔

زبان کے جوہر دیکھنے ہوں، تو کاظم کا معرکہ ایک رئیس کی محفل میں میراثی صاحب سے ملاحظہ ہو، رئیس صاحب اپنی بے فنی اور بدآوازی پر نازاں، سرِ محفل جنگھاڑ رہے ہیں، ساری محفل اُن کے بنانے یا داد دینے پر متوجہ، چوٹیں کاظم اور میراثی کے درمیان چلنے لگیں، ہلکی سی جھلک

---

[1] صدق ۲۳ر فروری ۱۹۴۱ء

دیکھیے چلیے :-

"میراثی پیٹ کا بڑا اجب سا تھا، اٹھی چوٹی کا زور لگا رہا تھا، دماغ سے آنار آنار کر باتیں لا رہا تھا۔ بولا "سرکار شاؤں سے تمر نکل رہے ہیں"
کاظم نے کہا۔ "عالی جاہ مجسم موسیقی ہیں، ہر بن مو سے تمر برس رہے ہیں"۔
میراثی نے بہت زور مارا، باپ دادا کی ساری طاقت سے کام لے کر کہا
"سرکار شاہِ موسیقی ہیں"۔ وہ حاضر دماغ بولا۔ "عالیجاہ شہنشاہِ موسیقی ہیں،
ملن حاؤ دی بانی ہے، اس فن کے پیغمبر ہیں"۔ میراثی نے زمین پر ہاتھ ٹکا
دیئے اور بولا "تان سین قبر میں پڑا تڑپ رہا ہے"۔ کاظم نے عرض کیا "بیجو
باورے کی روح قدم بوس ہونے آئی ہے، اگر ہاروت کو یہ فن آتا تو زہرہ
کے راگ میں نہ آتا۔ سر راہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، موسیقی دامن سے وابستہ
سرکار رہبر اندر ہیں، موسیقی آپ کے دم قدم سے ہے، اعجاز ہے اعجاز
شجر و حجر جھوم رہے ہیں، مردہ دل زندہ ہوئے جاتے ہیں، مگر نہیں
نفس عیسوی ہیں" میراثی کچھ بھی ہو، میراثی تھا۔ تابڑ توڑ فقرے سن کر
تیورا سا گیا۔ جب زبان نہ چلی تو سر پیٹنا شروع کیا، اور لگا حال کھیلنے
یہ روگ کاظم کے بس کا نہ تھا، میدان جاتا نظر آیا، بازی ہرتی نظر آئی۔
پر واہ رے دماغ، فوراً بولا "سروں کا زور ہے، آگ لگ جائے گی، پانی
ڈالو، جلدی کرو"۔ اور ساتھ ہی ساتھ برف کے پانی کا بھرا ہوا جگ اٹھا
بدنصیب میراثی پر ڈال دیا۔ میراثی حال سے بے حال ہو گیا گھگھی بندھ گئی۔"
(ص ۴۸ و ص ۴۹)

گنہگار عورت کے دل کی چبھن دیکھنا ہو تو رق النسیہ، جیسوا کے کوٹھے پر کرشن نے
ایک پر اثر واقعہ میں مناسب تمہید کے بعد، اکبر کا یہ شعر سنا دیا ہے ؎

کون خوش بخت زمانہ میں ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

اس پر جیسوا کے تاثرات:-

- کان یہ سن رہے تھے، آنکھوں کے سامنے ازدواجی زندگی، اپنے مناظر
پیش کر رہی تھی، اور میں اس تماشہ میں غرق تھی، ایک عجیب تلطف تھا
عجیب کھٹک تھی، نرالی کاوش تھی، اچھوتی خلش۔ میں ان کیفیات میں
ایسی محو تھی جیسے بھوکا روٹی کے تصور میں یا بانجھ اولاد کے خیال میں۔ سینہ
میں ایک چیز تھی جو کچھ مانگ رہی تھی، پہلو میں ایک خلا تھا، جو آج میں
نے پہلی دفعہ محسوس کیا۔ میرا ہر قطرہ خون کسی کی تلاش میں رواں، میری
نسائی فطرت میں ایک طوفان بپا تھا، آج مجھ میں وہ عورت جاگ اٹھی تھی
جو بیوی بننے پیدا ہوئی ہے، جو ماں بننے پیدا ہوئی ہے، آج وہ خلقت
انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جسے افیون دے کر سلا دیا گیا تھا۔ آج
وہ حقیقت اپنا حق مانگنے آن پہنچی تھی جس کو کذب و ریا اور غلط فضا
کے انبار میں دبا دیا گیا تھا۔ زندگی کا جامہ چاک کر کے عورت برآمد ہونے
کو تھی، عورت جو گھر بسانے کو [illegible] سمجھتی ہے، عورت جو اپنا خون چوسا کر نسل
انسانی کو پالتی ہے، عورت جو شفقت سے خمیر کی گئی ہے، عورت جو
ماں سے تعبیر کی گئی ہے۔ میں آدم و حوا کے نمائندوں کو دیکھ رہی تھی

آج میں فطرت ہی فطرت تھی، ماحول سے مبرا فضا سے باور" صہ ۱۸)

غرض کتاب کیا ہے ایک اعجوبہ، صورت رندوں کی، سیرت زاہدوں کی، چہرہ پر شوخی و ظرافت کی آب و تاب، نقاب کے اندر پیشانی پر زہد کے سجدوں کے نشان، بیسویں صدی کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں جانے کے قابل۔ افسانہ نام کا "ناکام" لیکن ہر اعتبار سے کامیاب۔

(۵) نزولِ رحمت معروف بہ میلادِ شریف :-

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی قیمت ۴ر، ملنے کا پتہ (۱) خود مصنف

شیامحل دہلی (۲)، مکتبہ جامعہ دہلی، لکھنؤ، بمبئی وغیرہ۔

دہلی کا ہونہار اور مشہور انشا پرداز خواجہ محمد شفیع، مولوی بن، چوکی بچھا، لوبان لگا، اگر کی بتی جلا، خوش عقیدگی کا جبہ پہن پہنا، حسن عقیدت کا کیوڑہ گلاب چھڑک چھڑکا، محفل میلاد پڑھنے بیٹھا ہے، اور ختم محفل کے بعد جب تبرک کی تقسیم کا وقت آیا، تو حلقہ مصدق کو بھی اس کی سوا بیت" نظر انداز کر کرا کر، محروم رکھنا گوارا نہ کیا ——

خواجہ کے منہ سے نکلے ہوئے بول، یوں بھی آپ واقف ہیں، کیسے ہوتے ہیں ؛ میٹھے رسیلے، سُریلے، پھر جب ذکر بھی ٹھہرا عزیز لذیذ، دلپذیر، محفل میں آبیٹھنے والے خود تجربہ کرکے دیکھیں۔ بہتوں کے عجب نہیں کچھ عقائد ہی درست ہو جائیں، بہتوں کے کان میں کام کی باتیں پڑ جائیں اور جی تو یقین ہے کہ سب ہی کا لگ جائے —— مشک کے اوصاف عطار کی زبان سے سننے میں لطف ہی کیا ہے۔ ایک ذری سا نمونہ ہتھیلی پر رکھ کر خود ہی سونگھ لیجئے نہ ؟ :——

مصدق ۴ جنوری ۱۹۴۳ء

"اہل عرب کی عقلوں پر بت پرستی کے پتھر پڑے تھے، ہٹ دھرمی، ضد اور بے جا پندار ہی کے فولادی خود دماغوں پر چڑھے تھے۔ حرص و ہوا کی سیاہی ان کے دلوں پر طاری تھی۔ جوئے نے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ رکھا تھا، عیش پرستی نے ان کو اندھا کر دیا تھا ...... یہ دو دو دھو آئی جاتی بزرگی و برتری کے دلدادہ مخالفت اسلام پر آمادہ ہو گئے، ایک طرف مٹھی بھر کلمہ گو، دوسری طرف جاہلوں کے جتھے، ظالموں کے گروہ۔

گو بظاہر شیر بکری کی لڑائی تھی، لیکن اس بکری کا رکھوالا، زمانہ بھر کا پالنہار، وہ آقائے روزگار تھا جسے وہ رکھے اُسے کون چکھے، نہ دشمنوں نے اپنی کرنی میں کوئی کسر رکھی، نہ دوست نے دوستداری میں ع

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

خدا کے ہاتھوں صحابہؓ کی کوشش سے اسلام کی کھیتی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی، کفار مکہ نے سخت ظلم ڈھائے، بڑے بڑے فساد مچائے سیل فنا کی طرح چڑھ چڑھ کر آئے، لیکن یہ اسلام کی دیوار نمک کی نہ تھی جو بہ جاتی۔ ہر ریلے کے بعد پختہ سے پختہ ہوتی گئی۔ مشرکین نے اہل دین پر جو ظلم توڑے، اور جیسی جیسی آفتیں ڈھائیں، ان کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے اور بیان سے دل دہلتے ہیں" (ص ۳۵، ص ۳۷)

چلئے میلاد خواں کی آواز کان میں پڑ گئی اور آپ بھی داخل حسنات ہو لیتے۔ جی لگا ہو تو محفل میں شروع سے آخر تک شریک رہیں سودا کل چار پانچ آنے کے ٹکٹ میں مہنگا تو ہرگز نہیں۔

(۶) چند افسانے [1]

از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی، ۱۰۸ صفحے مجلد قیمت ایک روپیہ

---

[1] صدق ۸ مارچ ۱۹۴۳ء

پتہ :- اردو مجلس، مٹیا محل دھلی۔

دہلی کے سحر طراز انشا پرداز، اہلِ زبان خواجہ شفیع سلمہ، اب اس منزل سے گزر چکے ہیں کہ ان کی نئی کتاب کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہو، اب اُن کا نام خود ہی ایک مکمل تعارف ہے، مضمون کے پاکیزہ، شستہ و لطیف ہونے کی ضمانت، زبان کی صحت، سلاست و شیرینی کی دستاویز!

مجموعہ —— جس میں آپ نے اُسے گلدستہ کے نام سے پکار لیجے —— میں دو نظمیں ہیں، اور کوئی دس بارہ ہلکے پھلکے افسانے، تیر بہار جیسے موسم گل۔ دلآویز جیسے نخرہ بلبل، افسانوں کے پلاٹ کہیں مسجد و خانقاہ کے نہیں۔ وہی بازاروں کے اور ہوٹلوں کے، کالج کے لڑکوں کے، اور بیسواؤں کے کوٹھوں کے۔ لیکن مجال کیا جو دامنِ خیال بھی معصیت سے آلودہ ہونے پائے، اور طبیعت کی پاکیزگی پر کوئی داغ دھبہ فحش و ابتذال کا پڑنے پائے، خواجہ اپنے ہاتھوں سے خوب بھر بھر کر آپ کو پلائیں گے۔ گلاس پر گلاس چھلکائیں گے، بوتل پر بوتل لنڈھائیں گے۔ آخر میں آپ کی زبان سے نکلے گا تو یہ کہ سبحان اللہ یہ تو عجب اسرار تھا۔ کلوار کی بھٹی کی جگہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے، اور یہیں دیکھ کر جن شیشوں پر جبانی وا کر (ولائتی شراب کے ایک مشہور و قدیم کارخانہ کا نام ہے) کے قدحوں کا گمان تھا، وہ شرابِ طہور کے جام نکلے! زبان خاص الخاص دہلی کی مستند اور ٹکسالی، اور ادب سے مذاق رکھنے والوں کے حق میں ایک نعمت —— البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کتاب "عوام پسند" طبقہ میں شامل ہونے کے قابل نہیں، اچھی خاصی تعداد، اور اردو کے نسبتہً بلند مذاق کے بغیر کتاب پڑھنے والے کوئی خاص لطف شاید نہ محسوس کر سکیں:

شیش محل[1]:-

از شوکت تھانوی ضخامت ۱۰۴ صفحے قیمت عہ ۸ر مجلد گرد پوش،

پتہ :- اردو بک اسٹال، لوہاری دروازہ، لاہور

شوخ نگاری و ظرافت دوسروں کے لئے، بلکہ رشید صدیقی تک کے لئے ایک مشغلہ تفریح رہی ہے۔ شوکت نے اسے اپنا مستقل فن بنالیا ہے، اور قدرتاً ان کی نگاہ ایک فن کار کی نگاہ ہو گئی ہے، ان کا قلم ایک فن کار کا قلم ہے۔

"شیش محل" ان کے مطالعہ بشری کا ثمرہ ہے، اپنے ملنے والوں میں سے ۱۱۲ کے چہرے حروف تہجی کی ترتیب سے انہوں نے اس قلمی آئینہ میں دکھادیتے ہیں، سب کے سب کسی نہ کسی حیثیت سے ادب ہی سے تعلق رکھنے والے ہیں، یہ اور بات ہے کہ افراط ناز کی خیالی سے کہیں صرف کتب فروشی کو بھی اسی تعلق کے لئے کافی سمجھ لیا گیا ہے! یہ قلمی نگار خانہ یوں کہیے کہ ایک عجائب خانہ ہے۔ بعض ان مشاہیر میں اتنے مشہور کہ ان کا تعارف بھی ان کی توہین۔ بعض ایسے گمنام کہ اتنی تعریف و تعارف کے بعد بھی مجہول کے مجہول! ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، بوڑھے بھی ہیں اور جوان بھی۔ بعض ایسے ہیں جو سب کچھ ہیں، بعض ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں، ایسے بھی جن کا پیچھا شہرت نہیں چھوڑتی، ایسے بھی جو شہرت کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے تھک چکے ہیں، غرض ریاض خیر آبادی، ڈاکٹر عبدالحق، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی سے لے کر اختر مرادنی، امید امیٹھوی اور صدیق بکڈپو تک ہر ردیف ہر قافیہ، ہر وزن، ہر بحر کے نمونے اس دیوان میں موجود ہیں، شاعر کہیں تو خالی مصرعہ طرح پڑھ کر چپ ہو گیا ہے اور کہیں دو شعر نہ بلکہ سہ غزلہ چھیڑ دیا ہے! نگار خانہ ظریف کا ہے۔ مزاح و شوخی ہر چیز پر مقدم ہے، لیکن حقیقت و صداقت بھی

---

[1] صدق جلد ۹ نمبر ۲۶ یکم نومبر ۱۹۴۳ء

عموماً دوش بدوش "عموماً" کا لفظ خیال میں رہے۔ ظرافت کی گلکاریاں، شوخ نگاری کی رنگ آمیزیاں مؤرخ کے کیمرے اور فوٹو گرافی کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں ـــــ چہرے یقیناً دلچسپ، دلکش یقیناً سب کے ہیں۔ اور یہی فن کار کا کمال ہے، البتہ کسی کا چہرہ اترا ہوا، کوئی ذرا لٹکا ہوا، کسی پر رعنائی و زیبائی کا نقاب پڑا ہوا، کسی پر روغن حسن افزا کا غازہ پھرا، کسی کی پیشانی پر شکن، کسی کے چشم و ابرو پر غضب کا بانکپن۔

ظریف نے ہنسنے ہنسانے کا سامان قدم قدم پر کیا ہے، لیکن کہیں کہیں اندازہ کرنے میں خود بھی غچہ کھا گیا ہے، نازک خیال اور پھر لکھنؤ و جوار لکھنؤ کے نازک خیال، نازک مزاج بھی کچھ کم ہوتے ہیں؛

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم

لیکن معاملہ دوسرا ہے، خوب کیا شوکت صاحب نے دیباچہ ہی میں سب سے معافی مانگ لی، ورنہ عجب نہیں جو "بزم" "رزم" میں تبدیل ہو کر رہتی اور

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

کی شاعری حقیقت بن کر رہتی (یہ اسد خدا نخواستہ اسداللہ خاں غالب نہیں، وہ دوسرے بزرگ ہیں جن کا یہ مصرعہ شہرت دوام حاصل کئے ہوئے ہے ؎ ـــــ

مرے شیر شاباش رحمت خدا کی)

صد ۱۳۸ سے صد ۱۴۲ تک ایک بزرگوار کا ذکر جس رنگ میں ہے، یقین تو ہے کہ شوکت صاحب نے بازو پر امام ضامن باندھ کر لکھا ہوا ـــــ "شیش محل" پر بے تحاشا پتھراؤ اس کے بعد کچھ بھی بعید نہیں رہ جاتا ہے!

یہ چیز محض تفریح اور دل لگی کی نہیں۔ کل اسی سے بڑے بڑے سنجیدہ مؤرخ

خوشہ چینی کریں گے۔ آخر آج بھی کتاب الاغانی کے حوالے کس شد و مد کے ساتھ مغرب و مشرق کے بڑے بڑے سنجیدہ مورخ دے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ ادیب اور شاعر ان گویوں، سازندوں، اور ڈھاڑیوں سے بھی گئے گذرے ہوئے۔

کمی اور بڑی کمی اس کتاب میں یہ ہے کہ ترنگا جھنڈا خود مصنف کے مرقع سے خالی ہے۔ مجنوں کا ڈراما بغیر مجنوں کے پارٹ کے! بارات بغیر نوشہ کے! عرضی دعویٰ بغیر تبلیغ خرچ کے۔ ظریف کی ستم ظریفی!

اعمال نامہ[1]:۔

از سر سید رضا علی ایم اے ایل ایل بی، ضخامت ۵۰۲ صفحے، تقطیع ۲۰×۲۶
مجلد مع تصاویر، قیمت آٹھ روپے، پتہ:۔ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

اعمال نامہ! نام سنکر ذہن پولیس اور تھانہ کی طرف منتقل ہو اور نہ پھر کراماً کاتبین کے نامۂ اعمال کی طرف! کتاب کا تعلق ان دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں۔ ایک زندہ دل علیگڈھی کی کہانی اسی کی زبانی ہے، اور بہتر ہوتا کہ یہی عبارت اندرونی سرورق پر بطور کتاب کے عنوان تحتانی کے لکھ دی جاتی۔

مرادآباد کے سید رضا علی سے علی گڈھ کے حلقہ میں کون ناواقف ہے؟ بڑے منچلے بڑے ہونہار شروع ہی سے تھے، بی اے کیا، ایل، ایل بی ہوئے محسن الملک مرحوم کے پرائیویٹ سکریٹری رہے، وکالت میں نام پیدا کیا۔ لیگ کے سلسلہ میں شہرت حاصل کی۔ قومی لیڈری اور

---

[1] صدق جلد ۹، نمبر ۴۴، ۲۰ مارچ ۱۹۴۴ء

پھر کاری جاہ و منصب کے اونچے اونچے مرتبے طے کرتے ہوئے اب "سر" ایس، سی، بی، ای ہیں
سنٹرل اسمبلی کے ممبر ہیں مسلم لیگ کے سابق صدر ہیں اور قسن علی ہا ——— اور اب جب کہ یہ کھلا
کہ قانون اور سیاست کی خشکیوں کے باوجود یہ بوڑھا لڑکا (کسی نے "اولڈ بوائے" کا یہ ترجمہ
خوب کیا ہے!) ایک خوش ذوق، سخن فہم اور اچھا خاصا اہل قلم بھی ہے ——

وہ نام خدا شعر بھی کرنے لگے موزوں

افسانۂ حیات موثر و دلچسپ کس کا نہیں ہوتا، بشرطیکہ اپنی بدمذاقیوں سے خود ہی تاثیر اور دلچسپی کا
خون نہ کر دیا جائے، اور پھر یہ تو محض آپ بیتی نہیں جگ بیتی بھی ہے۔ محسن الملک اور وقار الملک
جسٹس محمود اور بک اور ہارکیسن سر علی امام، مظہر الحق، راجہ صاحب محمود آباد، نواب صاحب
ڈھاکہ، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی، محمد علی شوکت علی
سے لے کر کلکتہ کی مشہور مغنیہ تک خدا معلوم کتنوں کی قلمی تصویریں آپ کو اس مرقع میں ملیں گی،
اور کتاب کہنا چاہیے کہ انگریزی تعلیم یافتہ اسلامی ہند کی چالیس پچاس برس کی ایک سرسری تاریخ
بن گئی ہے، گر ایسی تاریخ جس میں قدم قدم پر شعر و ادب مداخلت کرتے نظر آ رہے ہیں، شاید
"مداخلت بے جا" کی حد تک!

سید صاحب مذہباً شیعہ ہیں مگر ایسے شیعہ جو سنیوں میں گھلے ملے ہوئے ہیں، اور یہ اثر
ایک تو علیگڈھ کی تربیت کا ہے، اور پھر اس کا بھی کہ ان کے بزرگوں میں اہل سنت بھی رہے
ہیں، سید صاحب کے تجدد سے بھی متاثر ہیں، پردہ کی بحث میں کھل کھیلے ہیں، لیکن ان کا تجدد
کچھ بجھا ہوا سا ہے، ایک اور مراد آبادی کی طرح جو ہندوستان میں اس مسلک کے نقیب ہیں،
ان کا تجدد نہ خود مشتعل ہے نہ دوسروں کے لئے اشتعال انگیز اور صبر آزما، سیاسیات میں بھی
سید صاحب کی روش کچھ مرنجاں مرنج سی ہے، کہیں کہیں گرما گرم بھی، لیکن بحیثیت مجموعی سب کو

سموئے ہوئے، مروت کی نظریں ہر طرف کئے ہوئے، کتاب حسن ترتیب کے اعتبار سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں، غلط مبحث جا بجا ہو گیا ہے، لیکن حسن ترتیب بھی مشکل چیز، اور کہنہ مشقی کے بعد ہی میسر آتا ہے، جو پیشہ ور مصنف نہیں، ان کے اس آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، کتاب متفرق معلومات کے کشکول کی حیثیت سے بڑی دلچسپ اور پر لطف ہے، اور شعر و ادب کے بکثرت مباحث میں کہیں کہیں تو سید صاحب بڑے پتہ کی کہہ گئے ہیں، کاش ادب ہی کو انہوں نے اپنا مستقل موضوع رکھا ہوتا! ——— ایک بڑی بات، ہندوستان کی موجودہ ذہنی فضا کے لحاظ سے بہت بڑی بات، یہ ہے کہ کتاب سوانح عمری محض دماغ کی نہیں، بلکہ دل کی بھی ہے "گفتنی" کی تصریحات کے ساتھ ساتھ اشارات "گفتنی" کے بھی جا بجا پھیلے ہوئے ہیں اور "برون در" کی نقاشی کے پہلو میں مصوری "درون خانہ" کی بھی اچھی خاصی ہو گئی ہے۔

یہ صرف پہلا حصہ ہے دوسرا حیرت عجیب نہیں کہ اس سے دلچسپ تر ہو،

رسالہ کلیم دہلی (ماہوار)[1]

ایڈیٹر جوش صاحب ملیح آبادی، قیمت سالانہ چھ روپے ضخامت ۶۰ صفحے

جوش صاحب اب تک شاعر انقلاب تھے، اب کلیم کے صفحات میں داعی انقلاب کی حیثیت سے نظر آ رہے ہیں پہلے ہی نمبر میں "اردو ادبیات میں انقلاب" کی ضرورت پر ایک بسیط جوشیلا مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس کو شروع یوں فرماتے ہیں:-

"نوع انسان کے مصلح بننے کا خیال کس قدر مضحکہ خیز خیال ہے۔ انسان انسان کی اصلاح کر سکتا ہے؟ کیا یہ واہمہ نہیں؟

لیکن یہ نہ ارشاد ہوا کہ دعوت اصلاح اگر تمام تر مضحکہ خیز ہے۔ تو دعوت

---

[1] صدق جلد اول نمبر ۳۱، ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء

اور یہ ہوشربا تجلیات آتشیں، اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے یہ لن ترانیاں۔ اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے۔

مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر کے، اور بعض دوسرے صاحبوں کے ادبی مضامین اچھے ہیں۔ خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں اگر چاہیں۔

انشا[1]:-

از مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی - ۷۰ صفحہ قیمت ۱۲ آنے
پتہ:- مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

مشہور صاحب طرز شاعر و نثار، انشاء اللہ خاں انشا کی شاعری پر یہ ایک دلچسپ تبصرہ ہے، اس وقت کے صاحب طرز انشا پرداز مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے قلم سے ——— و لفظی تعارف یوں کیجئے کہ انشا۔ انشا پرداز کی نظر میں؟

اس سے زیادہ کچھ کھل کر کہنا کتاب کے لطف و لطافت دونوں کو غارت کرنا ہے۔ فرحت کو افسوس ہے کہ اردو دنیا میں وہ کر سیع شہرت حاصل نہیں ہوئی، جس کے وہ مستحق ہیں

چند ہم عصر[2]:-

مولوی عبدالحق صاحب کے چند مقالات، مرتبہ شیخ چاند ایم۔ اے مرحوم

---

[1] صدق جلد ۱۰، نمبر ۱، ۳ جولائی ۱۹۴۴ء [2] صدق جلد ۱، نمبر ۱، ۳ جولائی ۱۹۴۴ء

طبع ثانی ۲۸۸ صفحات۔ تقطیع ۱۸ × ۲۲ قیمت مجلد عہ/ ۸ غیر مجلد عہر
پتہ :۔ انجمن ترقی اُردو دریا گنج دہلی۔

یہ ۱۷ معاصرین کے تذکرے اور ان کی زندگیوں پر تبصرے، مولوی عبدالحق صاحب کے قلم سے ہیں۔ معاصرین میں سے اکثر تو مشاہیر بھی ہوئے ہیں، مثلاً امیر مینائی، جسٹس سید محمود، مولانا محمد علی، حالی اور بعض ایسے گمنام جیسے ایک باغ کا مالی ناریو نامے۔ اور بعض کا شمار نہ مشاہیر میں ہو سکتا ہے، نہ گمناموں میں، مثلاً وحید الدین۔

یہ تذکرے زمانہ کا بہت وسیع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں یعنی ابتدا ۱۸۹۱ء سے ہوتی ہے اور انتہا ۱۹۳۳ء پر ظاہر ہے کہ ۴۰، ۴۲ سال کی مدت میں انسان کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اور اس کا قلم بھی کیا سے کیا ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ بعض صاحب ایسے تھے جن کے سامنے خود مولوی عبدالحق بچے تھے مثلاً امیر مینائی۔ اور بعض ایسے جو خود ان سے جونیر (چھوٹے) تھے۔ مثلاً محمد علی یار اس معود پر یہ کتاب کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ محض متعدد مضامین کا مجموعہ ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کے مختلف حصوں میں بڑا تفاوت پایا جاتا۔ اور نشیب و فراز دونوں کی مثالیں کثرت سے ملتیں لیکن حیرت ہے کہ ایسا نہیں۔ اور طرز۔ اسلوب کی یکسانی یک رنگی بڑی حد تک قائم رہی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب عموماً سادہ نویس و سنجیدہ نویس ہیں، گویا حالی کے مثنیٰ لیکن حب مخلی بالطبع بول چال پر آتے ہیں۔ تو مولویوں کے لئے بے تکلف "جنادری" کا لفظ بھی بول جاتے ہیں، ہائے نذیر احمد!

مطبوعات کتب خانہ تاج آفس بمبئی

شاعر انقلاب حضرت جوش کے مجموعے

سنبل وسلاسل۔ تازہ کلام چھپ کر شائع ہو گیا، چار روپے آٹھ آنے

شعلہ وشبنم مشہور مجموعہ پانچ روپے

نقش ونگار مجموعہ کلام تین روپے آٹھ آنے

عرش وفرش ، چار روپے

جنون حکمت رباعیات کا مجموعہ تین روپے

حرف وحکایات ، تین روپے

فکر ونشاط ... دو روپے آٹھ آنے

اشارات مضامین کا مجموعہ دو روپے

شاعر کی راتیں ... ایک روپیہ چار آنے

حسین اور انقلاب (واقعات کربلا نظم) ایک روپیہ

سیف وسبو ... چار روپے

آیات ونغمات ... تین روپے آٹھ آنے

روح ادب ... دو روپے

حیات محمد علی جناح

ایک نامور سوانح نگار رئیس احمد جعفری جنہوں نے آج سے بارہ سال قبل مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حیات لکھے تھے، انہوں نے اب دوسرے محمد علی یعنی قائد اعظم کے سوانح حیات مرتب فرمائے ہیں ضخامت پونے نوسو صفحات مجلد سات روپے آٹھ آنے

باغی۔ رئیس احمد جعفری کا حیرت آفریں ناول۔ چار روپے بارہ آنے

رشید اختر ندوی کے ناول

نسیم۔ ناول تین روپے آٹھ آنے

نشان راہ ناول تین روپے آٹھ آنے

کانٹوں کی سیج ، تین روپے آٹھ آنے

تشنگی ، تین روپے آٹھ آنے

تلخیاں ، تین روپے آٹھ آنے

بادو باراں ، تین روپے

نشیمن۔ ناول تین روپے آٹھ آنے

حسن و شباب ماہر القادری کے چیدہ
خاص افسانے دو روپے

حدیث دیگراں۔ ملک کے ایہ ناز نوجوان
شاعر حضرت مختار بارہ بنکوی
کے کلام حیات افروز کا مجموعہ
دو روپے

عشق و محبت تمام مشہور شعرار کا
صرف عشق و محبت کے
متعلقہ کلام کا انتخاب
دو روپے آٹھ آنے

عشقیہ کلام۔ منتخب عشقیہ کلام
بارہ آنے

تلاش و نگار۔ فلمی دنیا کے امام جناب
ضیا، سرحدی کے دو لاجواب
ڈرامے ... دو روپے

تاحد نگاہ۔ ناول حضرت ضیا سرحدی کا
ایک دلکش اور لاجواب ناول تین روپے آٹھ آنے

وادیاں۔ ماہنامہ ایشیا کے بہترین
ڈرامے مرتبہ ساغر نظامی
چار روپے بارہ آنے

چیچو۔ ماہنامہ ایشیا کے بہترین افسانے
مرتبہ ساغر نظامی پانچ روپے

موج و ساحل۔ ساغر نظامی کے تازہ
کلام کا مجموعہ
چار روپے بارہ آنے

بادۂ مشرق مکمل، ساغر نظامی
پانچ روپے آٹھ آنے

آگ۔ ناول، عزیز احمد مصنف ہوس
گریز وغیرہ، عزیز احمد کا یہ ناول
ان کا حیرت انگیز شاہکار ہے
تین روپے

مقالات ماجد۔ مولانا عبدالماجد دریا
بادی کے مقالات و
مقدمات کا بہترین ادبی
مجموعہ... تین روپے آٹھ آنے

مثنوی بحر المحبت، مولفہ شیخ مصحفی

بہ تصحیح و تحشیہ و اضافہ مقدمہ
و تبصرہ و فرہنگ از مولانا عبدالماجد
دریابادی مجلد ایک روپیہ

مشعل راہ۔ مخشب جارجوی کا پہلا دیوان
تین روپے آٹھ آنے

شبلی نامہ، از شیخ محمد اکرام، آئی۔ سی
ایس مصنف غالب نامہ
موج کوثر وغیرہ یہ کتاب
شبلی کے ہر پہلو پر بلا کسی رو رعایت
اور جانبداری کے روشنی ڈالتی
ہے... تین روپے

موج کوثر، ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی
علمی تاریخ از شیخ محمد اکرام
آئی سی ایس (دوسرا ایڈیشن)
چار روپے

بیسوا ناول مظفر حسین شمیم جس میں بتلایا
ہے کہ شریف عورت طوائف کیوں
بنتی ہے... ایک روپیہ آٹھ آنے

اقبال امام ادب۔ رئیس احمد جعفری، ایک روپیہ

شکوہ جواب شکوہ، ڈاکٹر محمد اقبال۔ چار آنے

عروج و زوال۔ ناول از مضطر ہاشمی ہلالی
گھریلو زندگی لئے ہوئے اپنی نوعیت
کا لاجواب ناول تین روپے

پھلجھڑی، مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مزاحیہ افسانوں
کا دلکش مجموعہ کئی بار شائع ہو چکا ہے
دو روپیہ آٹھ آنے

کالی گھٹائیں۔ ناول از احمد شجاع پاشا اپنی
نوعیت کا حیرت انگیز ناول پانچ روپے

فلورا، ناول، از احمد شجاع پاشا تین روپے آٹھ آنے

سیرت مولانا محمد علی (مرحوم) علیہ الرحمۃ

از رئیس احمد جعفری، یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہو کر ملک کے ہر حصے میں مقبول ہوئی ہے، عرصے سے
نایاب تھی، اب اس کا دوسرا ایڈیشن مصنف سے ترمیم اور کئی اہم اضافے کرا لینے کے بعد شائع کی گئی ہے
اس کتاب سے کوئی اسلامی گھر خالی نہیں رہنا چاہئے، قیمت چھ روپے

شیخ نذیر احمد مالک کتبخانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی